طاہر محمد حبل ایڈوان
30-7-90

سلسلۂ دار المصنفین

(نمبر ۹۳)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد

کے

تمدنی کارنامے

جس میں سلاطین دہلی اور شاہانِ مغلیہ کے عہد کے فنِ تعمیر، رفاہ عام کے کام شہروں اور گانوؤں کی آبادی، باغات، ترقی حیوانات، ترقی تعلیم کاغذ سازی، کتب خانے اور خطاطی وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے

شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ

معارف پریس اعظم گڈھ میں چھپی

کتبہ سید اقبال احمد

سنہ ۱۳۸۳ھ
۱۹۶۳ء

فہرست مضامین

ہندستان کے مسلمان حکمرانون
کے عہد کے
تمدنی کارنامے

۷۸۶

دیباچہ

مسلمان اگرچہ ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے آئے لیکن اجنبی حکمرانوں کی طرح انھوں نے اس کو محض تجارت کی منڈی اور حصول دولت کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اس کو وطن بنا کر یہیں رس بس گئے، یہاں کی بہت سی رسوم و روایات تک اختیار کرلیں اور مرنے کے بعد بھی اس کی خاک کا پیوند ہوئے، اس لیے انھوں نے وطن ہی کی طرح اس کو بنانے اور سنوارنے کی کوشش کی، چنانچہ انھوں نے حکومت وسیاست، علم وفن، صنعت وحرفت، زراعت وتجارت، تہذیب ومعاشرت ہر حیثیت سے اسکو ترقی دیکر صحیح معنوں میں ہندوستان جنت نشان بنادیا، اس کتاب میں اسی جنت کے نشانات دکھائے گئے ہیں،

گو یہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے، اردو اور انگریزی دونوں خصوصًا انگریزی میں اس پر مستقل کتابیں ہیں لیکن وہ خاص خاص پہلوؤں پر ہیں، کوئی جامع کتاب موجود نہیں ہے جس میں تمام یا کم سے کم اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہو، البتہ دارالمصنفین کے تاریخ ہند کے سلسلہ میں اس کو بھی پیش نظر رکھا گیا، اور اس کتاب میں ان کے علمی وتمدنی کارناموں کو دکھایا گیا ہے، لیکن ان کے یہ کارنامے اتنے گوناگوں ہیں کہ ایک جلد میں ان سب کا احاطہ ناممکن تھا، اس لیے اس جلد میں صرف عمارتوں تعمیرات، رفاہ عام کے کاموں، شہروں اور قصبوں کی آبادی، باغبانی و باغات، حیوانات کی ترقی، تعلیمی نظام

مدارس، کتب خانے، کاغذ سازی اور فن خطاطی کے ابواب ہیں اس لیے یہ کتاب بھی جامع نہیں ہے، پھر بھی اس میں بہت سے اہم پہلو آگئے ہیں، انشاءاللہ آیندہ دوسرے پہلوون پر بھی لکھا جائے گا،

اس کتاب کے تمام ابواب دارالمصنفین ہی کے رفقاء ومصنفین کے لکھے ہوئے ہیں جن کے ناموں کی تصریح ان ابواب میں کردی گئی ہے، صرف فن تعمیر کا باب شیخ الجالعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کا لکھا ہوا ہے جس کے لیے ہم ان کے شکرگذار ہیں،

اس کتاب کی تالیف واشاعت بھی حکومت ہند اور اس کے وزیر پروفیسر ہمایون کبیر کی امداد وعلم دوستی کی رہین منت ہے جس کے لیے کارکنان دارالمصنفین ان کے شکرگذار ہیں،

معین الدین احمد ندوی

۱۶راگست ۱۹۶۳ء

دارالمصنفین اعظم گڈھ

نوٹ

اس کتاب میں کتابت وطباعت کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں، مثلاً ص ۱۱۱ کی سطر ۲ مین شہاب الدین کے ساتھ غوری بھی لکھ گیا ہے، غوری کو قلمزد کردین، اسی طرح ص ۱۱۷، اور ۱۶۵ پر بیگڑہ کی جگہ بیکڑہ طبع ہوگیا ہے، صفحہ ۱۳۳ کی سطر ۱۷ میں وساون اور سازیلا کی جگہ برساون اور سالولا ہونا چاہئے، الخ۔ کی وغیرہ کی غلطیاں ناظرین خود ہی تصیح فرمائیں۔

فنِ تعمیر

از پروفیسر محمد مجیب، جامعہ ملیہ، دہلی،

انسان نے اپنے تخیل اور تخلیقی قوت کو سب سے پہلے عبادت گاہ اور قبر کی تعمیر میں آزمایا، اور اس طرح فنِ تعمیر انسان کے عقائد، امیدوں اور آرزوؤں کو ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ بن گیا، تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیبیں جب عروج پر پہنچیں تو ایسی تعمیرات پر بھی توجہ کی گئی جن کا مصرف سماجی ضروریات کو پورا کرنا تھا، جیسے کہ یونانی اور رومن شہروں میں سیاسی جلسوں کے لئے فورم، ڈراموں وغیرہ کے لئے ایمفی تھیٹر، حمام اکئی منزلوں کی رہائشی عمارتیں مگر اب سے تین سو برس پہلے تک عبادت گاہیں اور مقبرے تعمیرات میں سب سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے، شاہی محل کو بھی شان و شوکت اور کسی قدر تقدس حاصل تھا، اس لئے کہ وہ حاکم کی حشمت، اس کے اقتدار اور اس کی سربلندی کی علامت مانا جاتا تھا، مگر محل صرف دنیاوی مرتبہ حاصل کر سکا۔ اس کی تعمیر میں قیمتی سامان اور فنِ آرائش کا کمال تو دکھایا جا سکا لیکن انسان کی جذباتی اور روحانی قوتیں بروئے کار نہ لائی جا سکیں، اس کے برخلاف مقبرہ زندگی، موت اور ابدیت کا نقطۂ اتصال تھا قدیم زمانے میں بادشاہ کی شخصیت کے بارے میں جو عقائد تھے، انھوں نے شاہی مقبرے کو ایک دینی حیثیت دیدی، اور اس زمانے میں بھی جب یہ بات سمجھ میں آگئی تھی

تھی کہ بادشاہ اور دوسرے انسانون میں نوعیت کا کوئی فرق نہین ہے، شاہی مقبرون کی تعمیر میں پرانے عقائد کا اثر رہا، اسی طرح عبادت گاہ کے بارے میں جو قدیم تصورات تھے، ان کا پرتو اس وقت بھی عبادت گاہ کی تعمیر میں نظر آتا رہا، جب کہ عبادت سے بیشتر، اور اسلام میں تمام سحر نما رسمین خارج کر دی گئین۔ ہندوستانی مسلمانون کے فن تعمیر میں مسجد اور مقبرہ لامحالہ ہماری توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں، اگرچہ محلون، میناروں، دروازون اور دوسری تعمیرات مین حسن اور فنی کمال کی کمی نہین ہے،

مسلمان کے لیے ہر وہ چھوٹی بڑی جگہ جو صاف ستھری اور ہموار ہو عبادت گاہ کا کام دے سکتی ہے لیکن چونکہ پنج وقتہ نماز باجماعت ہر موسم میں کھلے میدان مین ادا نہین کی جا سکتی، اس لئے ابتدائی زمانہ سے ہی مسجدین بنائی جانے لگین۔ مسلمانون کے اس عقیدے نے کہ رفتہ رفتہ تمام دنیا اسلام قبول کر لے گی، اور مسلمانون کی تعداد میں روزافزون اضافہ نے بھی مسجد کے نقشے پر اثر ڈالا، اس طرح کہ جس مسجد کی تعمیر میں سیاسی اور جماعتی مصلحتین پیش نظر تھین اس میں یہ خیال ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ عبادت کرنے والے بے شمار اور عبادت کا مقام غیر محدود ہے، شاہی مقبرہ کے ساتھ برکت کا کوئی تصور وابستہ نہ تھا، اس کے برعکس وہ شریعت سے انحراف کی مثال تھا، مگر اسی کے ساتھ وہ اولوالامر کی شخصیت اور اس قوت کی ایک علامت کا کام دیتا تھا، جو آویزشون کے عالم میں جماعت کی خوداعتمادی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھی، کیونکہ اس دنیا میں امن و رشتی کا مدار تدبر اور استقلال پر ہوتا ہے، معمولاً شاہی مقبرہ کے گرد باغ بھی ہوتا، اور باغ کے ذریعے اس کی عمارت اور قدرتی ماحول کے درمیان ہم آہنگی

پیدا کی جاتی، شاہی مقبرہ کے دروازے ایسے ہوتے جو اس کا سلسلہ قلعہ شہر اور رہائشی مکان سے ملا دیتے، مسجد اور مقبرے کے درمیان ایک معنوی تعلق تھا جس سے دونوں کی حیثیت واضح ہوتی تھی، اور انھیں ہم حقیقت حسن اور قوت کے ایک ہم آہنگ تصور کے دو پہلو قرار دے سکتے ہیں، مدرسے، پل، حوض، باؤلیاں، سرائے اور شفاخانے بنانا نیک کام مانا جاتا تھا جس کی بدولت بادشاہ اور دنیدار لوگ انسانوں کی دعائیں اور خدا کی خوشنودی حاصل کر سکتے تھے،

ہندوستانی مسلمانوں کے فن تعمیر کی مخصوص قدروں کو دریافت اور واضح کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں۔ عام رجحان اس طرف ہے کہ اس کا سلسلہ ایک جانب اسلامی اور دوسری جانب بدھمتی اور ہندو فن تعمیر سے ملا کر یہ دکھایا جائے کہ اس میں ہندوستانی اور غیر ہندوستانی قدروں کی آمیزش کی گئی ہے، نقادوں میں کسی نے غیر ہندوستانی اسلامی عنصر کو کسی نے غیر مسلم ہندوستانی عنصر کو زیادہ نمایاں کیا ہے، دراصل یہ فن تعمیر ہندوستانی مسلمانوں کا اپنا اور جداگانہ ہے، اس میں انکی جماعتی "شخصیت" اپنے خاص طریقے پر ظاہر ہوتی ہے، اسلامی اور قدیم ہندوستانی روایات کا اس میں اتنا ہی دخل ہے، جتنا کہ کسی ادیب کے اسلوب بیان میں علم لسانیات کو، فن تعمیر وہ میدان ہے کہ جس میں ہندوستانی مسلمان کے ذہن نے پوری آزادی کے ساتھ اپنی تخلیقی قوت کا کمال دکھایا، یہ وہ آئینہ ہے کہ جس میں ہندوستانی مسلمان کی تہذیبی صورت پوری اور صاف صاف نظر آتی ہے، فن تعمیر کو اپنا آئینہ بنانے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے جو ذریعے اختیار کئے ان کی حیثیت ضمنی ہے، ان کی وجہ سے ہمیں اصل حقیقت کو نظرانداز نہ کرنا چاہئیے، اس اصل حقیقت کو کچھ تلاش کی نے کی

بھی ضرورت نہین، یہ بہت نمایان ہے، اور اس کا نقش ہمارے ذہن پر قائم رہتا ہے
اگر ہم زبردستی اس میں اور اپنے پہلے سے قائم کئے ہوئے نظریوں مین مطابقت پیدا
نہ کرنا چاہین،

قدیم ہندوستان کا فن تعمیر تجاری، سنگ تراشی اور مورت سازی کے فنون کے
ارتقا کا نتیجہ تھا، وہ بدھ متی عبادت گاہیں، اور خانقاہیں جو چٹانون کو کاٹ کر بنائی
گئین فن تعمیر کی صحیح مثالیں ہیں لیکن جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے تو بدھ متی تعمیرات
کا سلسلہ بند اور اس فن کو برتنے والے تقریبًا ناپید ہو چکے تھے۔ گیارہوین، بارہوین اور
تیرہوین صدی میں جو مندر بنے وہ ایسے دینی جذبے کو ظاہر کرتے ہیں، جو نفسیاتی اعتبار
سے اسلامی نظریے کی پوری پوری ضد ہے۔ بہت سے مندرون کی تعمیر میں انتہائی
اولوالعزمی سے کام لیا گیا لیکن مندر چاہے جتنا چھوٹا یا بڑا ہوتا، اس کا مرکز اس کا بت
ہوتا تھا، اور اس بت کو ہمیشہ ایک چھوٹے، تاریک کمرے میں رکھا جاتا جسے دِمَن کہتے
ہیں، بت سے ہر بت پرست کا معاملہ الگ ہوتا، ہر شخص بت کی پرستش پجاری کی رہنمائی
میں اپنی غرض سے کرتا، مندر کے صحن، حوض، منڈپ جہان لوگ دِمَن میں جانے سے
پہلے جمع ہوتے، مندر کی شان بڑھتی، مگر ان کی وجہ سے انفرادی پرستش کے اصول میں
فرق نہیں پڑتا تھا انفرادی پرستش اور نماز باجماعت کے اصولون کو کسی طرح ہم آہنگ
نہیں کیا جا سکتا تھا، مندر اگر روایتی طرز پر بنایا جاتا تو اس کی بیرونی سطح مختلف
قسم کی مورتوں اور شکلون سے آراستہ ہوتی جن کے بنانے کا مقصد یہ تھا کہ عبادت
کا شوق بڑھے، مندر کے اندر آرائش کی کوئی ایسی چیز نہ ہوتی، جو خیال کو باہر کی دنیا
کی طرف لے جاتی بلکہ اس کی خاص کوشش کی جاتی کہ آدمی کی نظر اس کے اپنے دل

پہ جمی رہے، مسجد کا حسن زمین آسمان کی طرح نظر کے سامنے ہوتا ہے، اور انسان کو خالق کائنات کی عظمت سے آگاہ کرتا ہے، چونکہ بنیادی تصور یہ ہے، کہ تمام نوع انسانی کو خدا کے سامنے سربسجدہ ہونا چاہیئے، اس لیۓ مسجد کے نقشے کا مدار نمازیوں کی مفروضہ تعداد پر ہوتا ہے، مسجد کی طرح مقبرہ کا بھی کسی قدیم ہندوستانی تصور یا روایت سے تعلق نہیں ہے، اگر یہ باتیں ذہن نشین ہو جائیں تو ہم ان بیل بوٹون اور آرائش کی دوسری شکلون کو بیجا اہمیت نہ دین گے جن کی بنا پر ہندوستانی مسلمانون کے فن تعمیر کا قدیم ہندوستانی فن سے رشتہ جوڑا جاتا ہے، مثلاً یہ خیال کہ محراب کا سلسلہ اس محراب نما روشندان سے ملتا ہے جو بدھ مت غارون میں بنایا جاتا تھا اور جو دراصل بانس کے روشندانون کی نقل ہے، تاریخ اور فن تعمیر دونون کے ارتقا کی غلط تشریح کرنا ہے، ہندو مندر کا در جس میں دیوار کا بوجھ پتھر اور بالکل ابتدا میں لکڑی کی شہتیر یا سِل پر ڈالا جاتا تھا، مسلمانون کی عمارتون میں بھی نظر آتا ہے، مگر تعمیر کا یہ طریقہ محراب کی جگہ کام نہین دے سکتا تھا، اس کا استعمال صرف تنوع پیدا کرنے اور آرائش کے لیۓ کیا گیا۔

البتہ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ ہندوستانی مسلمانون کے فن تعمیر کی کون سی خصوصیات اس کو اسلامی ملکون کے فن تعمیر سے ممتاز کرتی ہیں اس لیۓ کہ مسلمانون میں عقائد، تصورات اور جمالیاتی معیار کا ایک رشتہ تھا، جو کہین پر ٹوٹا نہیں۔ پھر بھی اس کا اپنا الگ انداز ہے، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، جیسے کہ قدرتی ماحول کا اثر، یا یہ کہ پتھر کا کام جاننے والے سب ہندوستانی تھے، یا یہ کہ مسلمانون کو آرائش کے ہندوستانی طریقے خاص طور پر پسند آئے، غالباً سب سے بڑا سبب ان سیاسی، سماجی اور

اخلاقی مسائل کا ردعمل ہوگا جس سے مسلمانوں کو ہندوستان میں سابقہ پڑا، ان کے فن تعمیر میں اثبات خودی کی ایک کیفیت ہے، جو انکے سیاسی اور مذہبی عمل میں نظر نہیں آتی، اس میں انسان اور حالات پر حاوی رہنے کا ایک حوصلہ مضمر ہے جس کا انکی جد وجہد کے دوسرے میدانوں میں بس ایک ہلکا سا عکس دکھائی دیتا ہے،

ہم نے دوسرے سلسلوں میں اس تضاد کا ذکر کیا ہے، جس میں ہندوستانی مسلمانوں کا ذہن مبتلا رہا۔ اس سے رہائی اس کو شاعری اور فن تعمیر میں ملی، جب تک کہ شاعری کی زبان فارسی تھی، ایک بندھے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گذارنے اور معاملات کو سمجھنے اور سمجھانے کی قید سے رہائی معشوق، ساقی، مے و مستی، وحدت وجود اور خودی کے استعاروں نے دلائی، مگر فارسی بہر حال ایک غیر زبان تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے ایسی شاعرانہ روایتوں کے ہوتے ہوئے جو ان کے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں، ملک کی زبانیں، جیسے کہ ہندی، بنگالی، گجراتی، سندھی اختیار کرکے، اور خاص طور سے اردو کی طرح ڈال کر اپنے خاص مزاج کے لئے گنجائش نکالی فن تعمیر میں ان کو شروع ہی سے پوری آزادی حاصل تھی، اس پر خوف اور نفرت کا کوئی اثر نہیں تھا، قانون اور رسم کی پابندیاں نہیں تھیں، اسے نصب العین اور اغراض کے تضاد سے کوئی واسطہ نہ تھا، استعداد ہوتی، وسائل ہوتے تعمیر کا مسالا ہوتا تو سب کچھ کیا جاسکتا تھا۔

ترک جب ہندوستان میں آکر آباد ہوئے تو فن تعمیر بہت ترقی پا چکا تھا، لوگ گچ اور چونے کے استعمال سے واقف تھے، اور "صحیح" محراب اور گنبد بنا سکتے تھے، دشواریاں یہ تھیں کہ تعمیر کے لئے ضروری مسالا کیسے حاصل کیا جائے،

اور ایسے راج اور مستری کیسے پیدا کئے جائیں جنھیں کام کا اتنا تجربہ ہو کہ ان شکلوں کو جو ترکوں کو مرغوب تھیں ہندوستان کے قدرتی ماحول سے مطابقت دے سکیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ شرعی ممانعت کے باوجود مندروں کو توڑ کر پتھر اور دوسرا مسالا حاصل کیا گیا، اس تخریب کے لئے یہ عذر کافی نہیں ہے کہ اس زمانے میں موزوں قسم کے پتھر بہت کمیاب تھے، اور نئی عمارتوں کو بنانے کے لیے پرانی تعمیرات کو توڑ ڈالنا عام دستور تھا، معماروں کی اس وقت کمی نہ ہوگی، مگر ہندوستان کے معمار دراصل سنگ تراش تھے، اور تعمیر کے نئے فن کو برتنے کے لیے انہیں کئی پشتوں تک مشق کرنے کی ضرورت پڑی ہوگی۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے اس وقت کی کسی عمارت کو جانچنے کے لئے ہمیں اسی بات کو کہنا ہوتا ہے کہ فنی اصول اور طریقوں کو کس طرح قدرتی ماحول سے ہم آہنگ کیا گیا، کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کو طبیعت اور ان کا مذاق ہم آہنگی کی ترکیبیں نکالنے میں ظاہر ہوا دہلی کی فتح کے بعد مسجد قوت الاسلام اپنی قسم کی پہلی عمارت تھی جسے مسلمانوں نے بنوایا، حالات کچھ ایسے ہوں گے کہ قاعدے اور اصول کا خیال نہیں کیا جا سکتا تھا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسجد کی شکل عبادت گاہ کے بجائے ایک سیاسی انقلاب کی سی ہے، اس سے دین کی قدریں ظاہر نہیں ہوتی ہیں، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مظاہرہ کیا گیا ہے کہ جبر کے ذریعے لوگوں کا رویہ اور قدروں کا نظام کیسے بدلا جا سکتا ہے، یہ مسجد مندروں کو توڑ کر بنائی گئی، اور غالباً اگر اس کی ابتدائی شکل اب تک قائم رہتی تو ہم کو سیاسی انقلاب کی بے دردیاں زیادہ صاف نظر آتیں، دہلی کے فاتح، قطب الدین ایبک نے ایک مینار بھی بنوایا جو غالباً اذان کے لیے نہ تھا، مگر یہ لازمی تھا کہ اس مینار کو ایک سیاسی اور تہذیبی حیثیت حاصل ہو جائے اور اس کے نام کی وجہ سے اس کو لوگ چاہیں تو

اس کے معمار کی طرف منسوب کرتے ہیں یا ایک جماعت کے عزم اور استقلال کی طرف اپنی شکل کے اعتبار سے یہ مینار خالص ترکی اسلامی ہے۔ لیکن اس کے بنانے والے ہندوستانی معمارون کا ذہن حسن ملیح کے خاص تصورات میں ڈوبا ہوا تھا۔ قطب مینار میں اثبات خودی بلکہ مردانہ زور کی صفتین نظر نہیں آتی ہیں، اس کی مختلف منزلون کی سطح میں تنوع پیدا کرکے کنگنون اور بیل بوٹوں کی پٹیاں ڈال کر، ہر منزل پر چھجے اور ان چھجون کے بوجھ کو سنبھالنے کیلئے محرابون کے شگوفے بنا کر اس کی جسامت کو بڑی خوبی سے چھپایا گیا ہے، اس کی نزاکت اس کی بلندی کو نمایان کرتی ہے، اور اس کی مخروطی شکل اس کے بوجھ کو اس طرح بنیادون پر ڈالتی ہے کہ اس کی مضبوطی بہت بڑھ گئی ہے، مینار کی اوپر کی دو منزلین بعد کو بنائی گیئں اور ناموزون ہیں۔

قطب الدین ایبک خوش مذاق بھی تھا۔ اور اسے عمارتین بنانے کا شوق بھی تھا۔ اس نے مسجد قوت الاسلام میں بعد کو ایک مقصورہ بنوایا جس کے بیچ میں ایک ۵۳ فٹ اونچی محراب ہے، اور اس محراب کے بازوؤن پر دو دو چھوٹی محرابیں، ان میں سے بیچ کی اور داہنی جانب کی دو محرابیں ابتک کھڑی ہیں، بیچ کی محراب میں بہت ہی دل کش تناسب پایا جاتا ہے، معلوم ہوتا ہے یہان ایسی ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے، جو تصور اور نقشے سے بالاتر ہے، اور ہمین حسن کے انجان عالمون مین پہنچا دیتی ہے مقصورہ کی سطحی آرائش پھول پتیوں، بیلون، اور آیات قرانی سے کی گئی ہے، گویا خدا کی آواز آدمی تک لپٹنے والی بیلین سرگوشی کرتی ہوئی پتیان پہنچا رہی ہیں معمارون اور سنگ تراشون پر جو کیفیت یہان طاری تھی، وہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔ قطب الدین نے اجمیر میں ایک مسجد بنوائی جسے اڑھائی دن کا جھونپڑا کہتے ہیں

قوت الاسلام کی طرح یہ جلدی میں نہیں بنائی گئی اس کا پیمانہ بہت بڑا ہے، اور اس میں سنگ تراشی کے بجائے فن تعمیر کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں، قطب الدین کے جانشین نے ال تمش نے اجمیر کی مسجد کا مقصورہ بنوایا، بدایوں میں، ایک مسجد، عیدگاہ اور حوض اور ناگور میں ایک شاندار دروازہ تعمیر کرایا مگر اس کا کارنامہ اس کا اپنا مقبرہ ہے جس کا گنبد گر گیا ہے اور روکار بھی اپنی اصل صورت میں نہیں ہے، اندرونی حصہ جتنا محفوظ ہے، اس کی سطح اس طرح کتبوں سے سجائی گئی کہ معلوم ہوتا ہے، قدیم ہندو معیار کے مطابق ذراسی بھی جگہ خالی چھوڑنے سے پرہیز کیا گیا، اور کتبوں میں مختلف خطوط کی ایسی آمیزش ہے گویا ان سے بیل بوٹوں کا کام لیا گیا ہے، ال تمش نے اپنے لڑکے ناصر الدین کا جو مقبرہ بنوایا وہ باہر سے قلعہ معلوم ہوتا ہے، اندر اس میں متانت اور سکون برستا ہے، غالباً پہلے قبر کے اوپر برج تھا، اب صرف چبوترہ ہے، اور مغرب کی طرف مسجد کا خاکہ سا ہے، عمارت میں غم کی فضا پیدا کرنے میں بھی کامیابی ہوئی ہے،

علاءالدین کے زمانہ تک کوئی ایسی عمارت نہیں بنی جسے فنی اعتبار سے اہمیت حاصل ہو، پھر بھی سلجوق طرز تعمیر کا اثر پڑ چکا تھا، اس کا بہت اچھا ثبوت علائی دروازہ کا حسین طرز ہے یہ قطب مینار کے قریب مسجد قوت الاسلام کی چہار دیواری کی جنوبی سمت میں ہے، اور اس کی تعمیر کے ساتھ مسجد کا صحن نمازیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سبب سے بہت بڑھا دیا گیا، دروازے کو مسجد کے بقیہ حصے سے کوئی خاص نسبت نہیں ہے، اس کی حیثیت ایک چمکتے ہوئے ہیرے کی سی ہے، جو فولاد کی انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہو، لیکن اس میں اتنی کشش ہے کہ نظر اسی پہ جم جاتی ہے، اور گرد و پیش کا خیال نہیں رہتا،

علائی دروازہ کی عمارت ساٹھ فٹ اونچی اور چوکور ہے۔ اور اس کے اوپر ایک دبا ہوا گنبد ہے، بیرونی تین سمتوں میں محرابی در ہیں جو ایک وضع کے ہیں چوتھا در جس سے مسجد میں داخل ہوتے ہیں، بالکل الگ نوعیت کا ہے، بیچ کا حصہ ایک بڑا ہال ہے، بیرونی سمت کی تینوں محرابیں اونچی، پتلی اور بہت متناسب ہیں، اس قسم کی جسے کشتی کی ڈاٹ کہتے ہیں اور یہ بعد کی کسی عمارت میں نہیں ملتی ہیں، انھیں باہر کی طرف سنگ مرمر کے ابھرے ہوئے کتبوں کا حاشیہ دیا گیا ہے، اور محراب کے شکم میں برچھیوں کی جھالر ہے، محرابوں کو مرمریں پاکھوں کا سہارا دیا گیا ہے اور باقی دیوار کی سطح سنگ مرمر کے مستطیل حاشیوں اور کتبوں سے آراستہ کی گئی ہے، جس کی تکرار بڑی حسین معلوم ہوتی ہے، سرخ و سفید رنگوں کی آمیزش میں بہت خوش نما توازن ہے اور اگرچہ صنعت کاری خاصی پیچیدہ ہے، اس سے نظر کو تھکن کے بجائے تسلی محسوس ہوتی ہے، کئی حاشیے اور بیل بوٹے ہندوستانی وضع کے ہیں، اور چوتھے در کی نیم دائرہ محراب کسی اسلامی طرز کے مطابق نہیں ہے، یہ بیّن طور پر معلوم ہوتا ہے کہ علائی دروازہ کے معمار نے کسی ایک وضع کی پابندی نہیں کی، مگر اس میں وہ انفرادیت اور انوکھا پن ہے جو فن کے ایک نئے اور کامیاب تصور میں ہوا کرتا ہے۔

ایک لحاظ سے علائی دروازہ وہ کیفیت ظاہر کرتا ہے، جب سماج کی قوت اور خود اعتمادی حسنِ ملیح کی طلب پیدا کرتی ہے، غیاث الدین تغلق کا مقبرہ ایسی حالت کا آئینہ ہے، جب یہ اندیشہ تھا کہ جماعت کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور اس حالت میں نزاکت اور نفاست کی قدروں یا آرائش کے شوق کو بھی نمایاں کرنا گویا تہذیب و تمدن کو خطرے میں ڈالنا تحفظ کے اخلاقی سہاروں کو کمزور کرنا تھا۔

غیاث الدین تغلق کا مقبرہ سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی عمارت ہے، جو پہاڑی کی سنگین شاخ پر بنائی گئی، اس کی احاطہ بندی تناسب کو مدنظر رکھ کر نہیں بلکہ پہاڑی کی شاخ کی جو شکل تھی، اس کے مطابق کی گئی۔ احاطہ قلعہ کی دیوار معلوم ہوتا ہے، اور اس کے داخلے کے دروازہ کو ایسا گھونگھٹ دیا گیا ہے جس سے اندر جانے والے کو محسوس ہو کہ وہ موت کے منہ میں اپنا سر دے رہا ہے۔ پھر بھی اس میں سادگی کا خاص حسن ہے، مقبرہ خود جو کوہی اور اس کی پشتہ نما دیواریں ۵۵ کا زاویہ بناتی ہیں اس مخروطی بنیاد پر ایک بڑا سنگ مرمر کا گنبد قائم کیا گیا ہے، مقبرہ کے تین طرف جو در ہیں، ان میں محراب اور لنٹل کی وضع کو ملایا گیا ہے، اور اس کا کلس ہانڈی اور خربوزہ کی خالص ہندوستانی شکل کا ہے، ایک نقاد نے مقبرہ کے کئی فنی عیبوں کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً درون کے سرے کو جس چوکھٹے میں رکھا گیا ہے، وہ کافی ابھرا ہوا نہیں ہے۔ کنگرے بہت چھوٹے ہیں، اور سنگ مرمر کی جن تختیوں سے دیوار کی آرائش کی گئی ہے، وہ بہت حقیر معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر ان تفصیلات کی طرف توجہ کی جاتی تو سادی مخروطی شکل پر ایک زبردست گنبد رکھنے سے جو اثر پیدا ہوا ہے، وہ زائل ہو سکتا تھا، اور چاہے عمارت کی خوبصورتی کچھ بڑھ جاتی اس کی وہ مردانی شان نہ رہتی جو اب نظر آتی ہے،

تغلق عہد کی اور عمارتیں ہیں جنھیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تنوع پیدا کرنے اور نئے طریقوں کو آزمانے کا سلسلہ جاری رہا، کھڑکی مسجد اور کلاں مسجد کی اونچی کرسی اور قلعہ کی سی شکل انھیں ممتاز کرتی ہے، فیروز شاہ کے محل نے بعد کے محلوں کے لئے نمونے کا کام دیا، خان جہان تلنگانی کے مقبرے میں جدتیں کی گئی ہیں، فیروز تغلق کے حوصلے بہت بڑے تھے، مگر وسائل کی کمی نے اس کی تعمیرات کو نمایاں خوبیوں سے محروم

رکھا، اس کے مرنے کے بعد سلطنت ہی ختم ہوگئی۔ ۱۳۹۹ء میں امیر تیمور نے چند عمارتوں کو چھوڑ کر باقی سب کو مسمار کر دیا۔ شیر شاہ سوری کے زمانے تک دہلی میں کوئی عمارت نہیں بنی جسے فنی اعتبار سے ممتاز سمجھا جاسکتا ہے۔

سلطنت دہلی کے زوال کے بعد بنگال، جونپور، مالوہ، گجرات اور دکن میں جو حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں سے ہر ایک نے تعمیر کا اپنا الگ طرز اختیار کیا۔ ملتان میں شاہ بہاء الحق (وفات ۱۲۶۲ء) اور شاہ رکن عالم (وفات قریب ۱۳۲۰ء) کے مزار پنجاب کے فن تعمیر کے نمونے ہیں۔ اور ان کا دہلی کے طرز پر اثر پڑا۔ مگر ان کی وجہ سے فن تعمیر کا کوئی سلسلہ قائم نہیں ہوا۔ پنجاب میں ایسی فنی روایات بھی نہیں تھیں جن سے مسلمان معمار فائدہ اٹھا سکتے۔ بنگال میں آب و ہوا، قدرتی ماحول، تعمیر کے مسالے اور قدیم فنی روایات نے مسلمانوں کے فن تعمیر کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا۔ عمارتوں کی خصوصیات کی بنا پر اس کے تین دور قائم کئے جاسکتے ہیں۔ پہلا ۱۲۰۰ء سے ۱۳۴۰ء تک، اور تیسرا ۱۴۴۲ء سے ۱۵۷۶ء تک پہلے دور کے بہت کم آثار ملے ہیں، تربینی میں ایک مسجد بنی تھی جس نے سکندر شاہ (۱۳۵۸ء - ۱۳۸۹ء) کی تعمیر کردہ آدینہ مسجد کے لئے خاکہ کا کام دیا۔ اور ایک منار کے بھی کھنڈر ملے ہیں، جو غالباً قطب منار کی نقل تھا۔ موجودہ عمارتوں میں جو فن کے لحاظ سے نمایاں ہیں، سب دوسرے اور تیسرے دور کی ہیں، اور پانڈوا اور گور میں پائی جاتی ہیں۔

پانڈوا کی آدینہ مسجد اور گور کا داخلی دروازہ دونوں اعلیٰ تخیل اور فنی حوصلہ مندی کا پتہ دیتے ہیں، آدینہ مسجد نمازیوں کے ہجوم کو ذہن میں رکھ کر بنائی گئی تھی، اور آج کل کی شکستہ حالت میں بھی اس سے عظمت اور قوت ٹپکتی ہے۔ اس کی محرابیں

جو نیچے اور بہت موٹے پایون سے گویا اوپر کی طرف کرتی ہیں، اپنی مثال نہیں رکھتیں
مغربی جانب کی دوکانیں بڑی خوش مذاقی کے ساتھ اسلامی اور ہندوستانی جمالیاتی تصورات
اور پروانیون کی خوشہ چینی کی گئی ہے، داخلی دروازہ ساٹھ فٹ اونچا پچھتر فٹ چوڑا
اور سامنے سے پیچھے کی طرف ۱۱۳ فٹ گہرا ہے، اس پر شکوہ جسامت کو دیدہ زیب بنانے
کے لئے چاروں کونوں پر گاؤدم اور نمایاں رکھے دیئے گئے ہیں، اور تقریباً ایسے ہی پاکھے در کے
دونوں طرف ہیں۔ رو کار کی سطح کو ابھار کر اور دبا کر دھوپ چھاؤں کی ایک موثر کیفیت
پیدا کی گئی ہے، گور کی سونا مسجد چھوٹا سونا مسجد اور تنتو مسجد اور پانڈوا کی سونا مسجد سب
اپنی اپنی جگہ حسن اور آرائش کی نزاکت کے ممتاز نمونے ہیں۔ قدم رسول مسجد اور
فتح خان کی مسجد اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہیں کہ بانس کے جھونپڑوں کی طرح ان میں
اینٹ اور نے سے ماہی پشت چھت بنائی گئی ہے،

جونپور کے شرقی خاندان نے فن تعمیر کے بہت نمایاں منصوبے پورے کئے،
ان میں سے دو، اٹالہ دیوی مسجد، جو ۱۴۰۸ء میں تیار ہوئی۔ اور جامع مسجد، جو ۱۴۷۰ء
میں بنی۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اٹالہ دیوی کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسی نام
کے مندر کی جگہ بنائی گئی۔ فنی اعتبار سے اس میں کئی جدتیں نظر آتی ہیں، اس کے مقصورہ کے
مرکزی در کو اس طرح ابھارا گیا ہے، گویا ساری عمارت بلندی کی طرف جارہی ہے
اور اسے بلندی کی طرف تہذیب کی قوت نے نہیں مائل کیا ہے، بلکہ انسان کے قوائے
فطری کی بے پناہ طاقت نے مسجدوں میں عام طور سے مغربی جانب یعنی پچھمیت کی
روکار سپاٹ ہوتی ہے اٹالہ دیوی میں کونوں پر گاؤدم پشتے بنا کر اور وسطی حصے
گاؤدم پشتون کے علاوہ اس پورے حصے کو باہر کی طرف نکال کر بہت موثر انداز

نقشے میں تنوع پیدا کیا گیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے عمارت گٹھی ہوئی ہے، اور قوت کے ذریعے حسن کے تصور کو پیش کرنے کی نہایت کامیاب کوشش ہے، جامع مسجد کا نقشہ ویسا ہی ہے، جیسا کہ اٹالہ دیوی کا، مگر اس کا پیمانہ بہت بڑا ہے، اور اس میں فن کا خاص کرشمہ دو ایوان ہیں جو پچاس فٹ لمبے، چالیس فٹ چوڑے اور بیتالیس فٹ اونچے ہیں۔ ان کی چھتیں محرابی شکل کی ہیں، اور اس طرح ان کا سارا بوجھ دیوارون پر ڈال دیا گیا ہے، جونپور کی ان مسجدون کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے بالائی حصہ میں عورتون کے لئے الگ انتظام کیا گیا ہے،

مالوہ کی عمارتون پر دہلی کا طرز بہت اثر انداز ہوا۔ یہان بھی ہمین سلامی دار دیوارین، آہنی شکل کی محرابین، محراب اور لنٹل کی آمیزش اور دبے ہوے گنبد ملتے ہیں۔ یہان کی عمارتون کی کرسی بہت اونچی دی گئی ہے، اور اس کے علاوہ زینوں کو آرائش اور زینت اور عمارت کو قدرت کے قریب تر لانے کا ذریعہ بنایا گیا ہے،

مالوہ کی آب و ہوا دہلی سے بہت مختلف ہے، اور وہان کی نیچی نیچی پہاڑیان درختون اور سبزے سے اس طرح ڈھکی ہوئی ہیں کہ معمار کے دل میں نئے نئے طریقون سے فن اور قدرت کو ہم آہنگ کرنے کے حوصلے پیدا ہوے ہون گے، مالوہ کے خاص طرز کی بیشتر عمارتیں مانڈو میں ملتی ہیں جس کا مقام بہت حسین ہے، اور یہان کے بادشاہ اگرچہ وہ بھی خون ریزی کی عادت میں اپنے معاصرون کی طرح گرفتار تھے مجبور ہو گئے ہون گے کہ مانڈو کو لطف و جمال کا گہوارہ بنائیں۔ معمارون کی اپنی استعداد کافی نہیں تھی، یا انھون نے جو مسالا استعمال کیا اس نے وفا نہیں کی، اس لئے مانڈو کی کئی عمارتون کی چھتیں گر گئی ہیں، مگر جو کچھ اس وقت موجود ہے اس سے ہمین اندازہ

ہوتا ہے کہ معماروں کی طبیعت پر قدرتی ماحول کا کتنا اثر تھا۔ اور ان میں عظمت کا احساس دلانے کے ساتھ حسن آفرینی کی خواہش کو پورا کرنے کی کیسی تڑپ تھی،

مالوہ کے طرز کے پہلے نمونے دھار کی مسجدیں ہیں جس میں سب سے ممتاز ملک مغیث کی مسجد ہے، یہ عمارت کے لحاظ سے آدھی مسلمان آدھی ہندو ہے؛ اور اس میں ابتدائی مشق کی خامیاں پائی جاتی ہیں، اس مشق سے جو پختگی پیدا ہوئی وہ مانڈو کی عمارتوں میں نظر آتی ہے، اور یہیں ہم تخیل کی وہ بے نظمی دیکھتے ہیں جو آخری دور کی خصوصیت ہے، اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام طلبی اور جمالیاتی ذوق معقولیت کی حد سے گذر گیا تھا۔

مانڈو کی جامع مسجد، جو پندرہویں صدی کے وسط میں بنی، مالوہ کے پختہ یا قدیم کلاکی طرز کی پہلی اور شاید سب سے نفیس مثال ہے، اس کا بڑا دروازہ مشرق کی طرف ہے اور میدان سے ۵۰ فٹ آگے نکلا ہوا ہے، چونکہ کرسی بہت اونچی ہے، اس لئے زینوں کی بدولت دروازہ میں ایک خاص شان پیدا ہو گئی ہے، در کے دونوں مرمری پاکھوں کی بنت کاری بہت حسین ہے، اور مشرق کی جانب کی رو کار میں اس بنت کاری اور ان حاشیوں کے علاوہ جو سطح کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، کوئی اور آرائش نہیں ہے، مسجد کے صحن میں تین طرف دو دری ایوان ہے، اور ہر چار دروں کے اوپر ایک گنبد ہے، مسجد کے ڈھکے ہوئے حصے کو جو ۲۷۸ فٹ لمبا اور ۲۸ فٹ گہرا ہے، پایوں کی قطاروں کے ذریعے کئی ایوان میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کی چھت ۸۰ گنبدوں پر مشتمل ہے، مگر مرکزی حیثیت تین ایوانوں اور ان کے گنبدوں کو حاصل ہے، جن میں سے سب سے

ٹرا بیچ میں اور ایک دائیں ایک بائیں جانب ہے۔ آرائش میں بہت ضبط سے کام لیا گیا اس لیے جتنی ہے اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے،

مانڈو کی جامع مسجد ہوشنگ شاہ نے تعمیر کرائی اور اس نے وہیں مقبرہ بھی بنوایا۔ مگر اس کی تکمیل اس کے لڑکے نے کی، غیاث الدین تغلق کے مقبرے کی طرح ہوشنگ شاہ کے مقبرے کی شان و شوکت اس کی سادگی میں ہے، ہوشنگ کا مقبرہ پیمانے میں زیادہ بڑا ہے، مگر جس قوت کا مظاہرہ تغلق کے مقبرے میں کیا گیا ہے، وہ یہاں کس قدر شائستگی کے رنگ میں رنگی ہے۔ مقبرہ ایک اونچے وسیع چبوترے کے بیچ میں ہے، وہ شکل میں مربع ہے، اور اس کے اوپر بڑا بیچ میں کس قدر دبا ہوا گنبد ہے، چاروں کونوں پر مخروطی برجیاں ہیں جو صرف تنوع نہیں پیدا کرتی ہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے، سیاسی معنی بھی رکھتی ہیں، مقبرہ ناقص قسم کے سنگ مرمر کا بنا ہے، مگر جامع مسجد سے اسے جو رابطہ دیا گیا ہے، اور دونوں کے درمیان جو فنی ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے، وہ ایسے کمال کا ثبوت دیتی ہے کہ مغل اور دکنی معماروں نے ان دونوں عمارتوں کو مطالعہ اور مشاہدہ کا خاص موضوع بنایا۔

مانڈو میں اور عمارتیں بھی ہیں۔ جہاز محل اور ہندولا محل جنھیں غیاث الدین نے بنوایا۔ غیاث الدین کی عیش پرستی ضرب المثل تھی۔ اور یہ عمارتیں فن تعمیر کی عجائبات میں شمار ہوتی ہیں۔ مگر وہ فنی خوبیوں سے خالی نہیں ہیں۔ ان کی تعمیر میں سادگی کی روایات کی پیروی کی گئی۔ اور جسامت کے احساس کو قدرتی ماحول سے ہم آہنگ کرکے ایک لطیف کیفیت پیدا کی گئی ہے،

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت گجرات میں مسلمانوں کے فن تعمیر پر

ہندو کاریگرون کے فنی تصورات اور ذوق کا بہت زیادہ اثر پڑا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ یہان ڈاٹون کا رواج اور فنی اعتبار سے اس کے جو فوائد ہیں ان کا یقین بہت آہستہ آہستہ ہوا، احمد آباد اور دوسرے مقامون پر کوئی سو برس تک تجربہ کرنے کے بعد معمارون کو آہنی شکل کی محراب بنانے میں مہارت حاصل ہو گئی، اور عمارتون کے حسن میں اسلامی تعلیمات کا مخصوص جمالیاتی پرتو نظر آنے لگا۔ لیکن احمد آباد کی جامع مسجد میں بھی جو ۱۴۲۳ء میں تیار ہوئی۔ یہ تصور کہ عبادت گاہ وہ جگہ ہے جہان عبادت کرنے والے کندھے سے کندھا ملا کر سیکڑون اور ہزارون کی تعداد میں کھڑے ہون پرستش کے ہندو تصور پر حاوی نہیں ہو سکا ہے جس کے مطابق ہر شخص الگ پوجا کرتا ہے، اور مسجد کے مرکزی حصہ میں ستونون کا ایسا ہجوم ہے کہ نمازیون کی جماعت چھوٹے چھوٹے حصون میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

پٹن کی مسجد، جو چودھوین صدی کے شروع میں بنی، گجرات کی مسجدون کا پہلا نمونہ ہے، تعمیر کا یہ پہلا دور کوئی سو برس تک چلا۔ احمد شاہ (۱۴۱۱ء تا ۱۴۴۲ء) کے عہد کے ساتھ ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی جس میں بڑے بڑے فنی حوصلے حسب منشا تکمیل کو پہنچے اور اس کے دارالسلطنت احمد آباد کا شمار ان شہرون میں ہوتا ہے جو فن تعمیر کے بہت سے حسین نمونون سے آباد ہیں۔ احمد آباد کی جامع مسجد مغربی ہندوستان میں اپنی قسم کی بہترین عمارت مانی جاتی ہے لیکن ساتھ ہی وہ ایک زندہ، بڑھتے ہوئے، امیدون سے لبریز طرز کی مثال ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گویا عمارتون کا بننا پھولون کا کھلنا ہے، جس سے طبیعت کی شگفتگی عیان ہوتی ہے۔ اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ بنانے والون کا خیال اور نظریۂ زندگی خون کی طرح گردش کرتے ہوئے ان کے ہاتھون کے

کے ذریعے ان چیزوں میں پہنچ گیا ہے، جو ان کے ہاتھوں نے بنائی ہیں"۔ اس مسجد میں روشنی پہنچانے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ خود بہت سبق آموز ہے۔ اس لئے کہ روشنی کا پہلے رخ بدلا جاتا ہے، پھر اس کا عکس اس طرح سے ڈالا جاتا ہے، کہ پوری مسجد میں روشنی یکساں پھیلتی ہے، مرکزی اور ضمنی حصوں کی ترتیب کہ اس مسئلے کو بہت خوشنما طریقے سے حل کرتی ہے کہ بلندی کے رجحان سے روشنی کی ضرورت کو کیسے پورا کیا جائے، اور عمارت کی تقریبًا ہر خصوصیت ایسی ہے کہ فن تعمیر سے کسی بھی دلچسپی رکھنے والے کو تعریف کرنے پر مجبور کر دے گی۔ جامع مسجد سے احمد شاہ کے محل تک جو راستہ تھا۔ اس پر تین دروازہ کے نام کا ایک فتح دروازہ ہے، اب اس کے گرد دکانیں ہیں جس کی وجہ سے اس کی شان جاتی رہی ہے، مگر اس کی محرابوں کا حسن اب بھی نمایاں ہے۔

سلطان محمود بیگڑا کا عہد لمبا تھا۔ اور خوش حالی کا زمانہ بھی۔ چمپانیر کو دارالسلطنت بنانے کی وجہ سے فن تعمیر کے لئے نئے منصوبے فراہم ہو گئے۔ چمپانیر کی جامع مسجد کا نقشہ کم و بیش احمد آباد کی جامع مسجد کا سا ہے، مگر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنگ مرمر اور دوسرے قیمتی پتھروں کے بغیر بھی فن تعمیر کا کمال دکھایا جا سکتا ہے، کیونکہ اس مسجد میں سنگ تراش کی چھینی نے جو کچھ کر دیا تھا، اسی سے رنگ اور سونے اور پچی کاری کی چمک دمک پیدا ہو گئی تھی۔ اس مسجد میں آہنی ڈاٹ اور شہتیر کی بڑی خوبی سے آمیزش کی گئی ہے۔ مسجد اور صحن کی نسبت بہت اچھی ہے، اور بڑے گنبد کی پنج دار چھت کے نیچے دوہری کھڑکیوں کے ذریعے روشنی کا انتظام بہت سلیقے سے کیا گیا ہے۔ مسجد کا درمیانی حصہ تین منزلوں کا اور ۷۵ فٹ اونچا ہے اور ہر منزل پر حجرے ہیں جن میں سکون کے خواہش مند مراقبہ کر سکتے ہیں۔ سیدی سعید کی مسجد چھوٹی ہے مگر اپنی نفیس جالیوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔

اور ان میں سے ایک جو "کھجور اور طفیلی پودے" کی وضع کی ہے، ساری دنیا میں ایک شاہکار مانی جاتی ہے۔ رانی سپاری کی مسجد فن تعمیر میں ایک نگینہ کا درجہ رکھتی ہے لیکن اس میں ہندو ذوق کا اتنا گہرا اثر نظر آتا ہے کہ وہ بس کہنے کو مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے،

گجرات کے مقبروں میں سب سے ممتاز شیخ احمد کھٹو، سید عثمان اور سید مبارک کے مزار ہیں۔ بائی حریر نے ۱۵۰۰ء میں ایک باغ، مسجد اور باولی بنوائی جو ایک مجموعے کے اعتبار سے بہت حسین ہیں۔ احمد آباد میں بہت سے حوض ہیں جن کے پانی روکنے اور نکالنے کے دروازوں کو بہت اہمیت حاصل ہے، ان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ ہر چیز کو خوبصورت بنانے کی خواہش کتنی عام تھی۔

دکن کی ممتاز پرانی عمارتوں میں سے بیشتر گلبرگہ، بیدر، گولکنڈہ اور بیجاپور میں ہیں، شمالی ہندوستان سے جو انجنیر اور معمار دکن گئے یا جلاوطن کر کے بھیجے گئے، وہ اپنے مذاق اور فنی روایات کو ساتھ لے گئے، دکن کے فن تعمیر پر ایرانی تہذیب کا بھی بہت اثر پڑا مگر دکن کی تعمیرات اپنی الگ نوعیت رکھتی ہیں، اگرچہ خارجی اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

شروع کی عمارتوں میں گلبرگہ کی جامع مسجد نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی انوکھی صفت یہ ہے کہ اس میں کوئی صحن نہیں، پوری مسجد ڈھکی ہوئی ہے۔ نظر کے سامنے گنبدوں کا ہجوم آتا ہے جن پر مرکزی ایوان کا عالی شان گنبد چھایا ہوا ہے۔ اس کا قطر چالیس فٹ ہے اور اسے دریچوں کے ٹپیا برج پر قائم کیا گیا ہے، مسجد کے داخلے کا دروازہ شمال کی طرف ہے، اور اس دروازے کو بلندی دیکر محرابوں کی اس قطار میں جو مسجد کی روکار ہے، تنوع پیدا کیا گیا ہے۔ مسجد کا اندرونی حصہ جو کہ ایوانوں پر مشتمل ہے، جن کی محراب دار چھتیں موٹے مضبوط پایوں پر قائم کی گئی ہیں جو وزن اور استقلال

کی مثال معلوم ہوتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس عمارت میں خیال کی شوخی زیادہ ہو اور حسن نسبتہً کم مگر وہ حوصلہ مندی اور فنی جدت کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔

۱۴۲۵ء میں گلبرگہ کے بجائے بیدر بہمنی سلطنت کا دار الحکومت بنایا گیا، اور ۱۴۸۲ء کے بعد اس سلطنت کے چار خود مختار حصے ہو گئے۔ تعمیرات کے نقطۂ نظر سے ان حصوں میں سب سے اہم بیجاپور ہے، بیدر میں محمود گاوان کا مدرسہ جس طرز پر بنا ہے وہ بالکل اجنبی ہے، قطب شاہی مقبروں میں ایرانی مذاق کے مطابق رنگین مایئل لگا کر حسن آفرینی کی کوشش کی گئی ہے، بیجاپور کی عمارتوں کے علاوہ ممتاز حیثیت صرف حیدرآباد کے چار مینار کو حاصل ہے جس کی تعمیر ۱۵۹۱ء میں ہوئی۔ یہ ایک عظیم الشان فتح دروازہ ہے رقبہ میں سو مربع فٹ اور اسکے چاروں کونوں پر مینار ہیں جنکی چوٹی زمین سے ۱۸۰ فٹ اونچی ہے، اسکی وضع بہت موثر اور اسکی تزیین پر تکلف ہے، مگر اس میں تہذیبی انحطاط کا رنگ بھی ہے،

بیجاپور کی عمارتوں میں ایک نرالا پن ہے جس کا کوئی خاص سبب ہوگا، مگر اسکا پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ جامع مسجد، ابراہیم روضہ، گول گنبد اور مہتر محل وہاں کے مثالی نمونے ہیں۔ اور یہ بھی ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ہم کسی قدر مشترک کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ ہر ایک اپنی جگہ پر فنی استعداد اور جمالیاتی ذوق کا مظہر ہے۔ بیجاپور کے گنبدوں میں دائرے کی گولائی ہے، . . . . مگر یہاں کے معماروں نے کسی بات کو عادت نہیں بنایا، معلوم ہوتا ہے ان میں اس کی قدرت تھی کہ ہر وضع اور طرز سے حسن آفرینی کا مقصد پورا کر لیں۔

بیجاپور کی جامع مسجد کا نقشہ بہت سادہ اور سلجھا ہوا ہے، اس میں تزیین کی طرف بھی کچھ نمایاں توجہ نہیں کی گئی ہے، مگر دیکھنے والے پر اس کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ مسجد کی تعمیر علی عادل شاہ (۱۵۵۷ء۔ ۱۵۸۰ء) کے عہد میں شروع ہوئی اور اسکی

تکمیل ایک صدی بعد سلطنت کے زوال کے وقت ہوئی پھر بھی اس میں حسن کامل کا رنگ نظر آتا ہے۔ مسجد کی سب سے ممتاز صفتیں اس کا گول سجیلا گنبد اور دو منزلہ محرابوں کا ایوان ہے، اور اس کے مرکزی ایوان کی وسعت اور رنگی آرائش دینی اور جمالیاتی ذوق کو تسکین پہنچاتی ہے، ابراہیم روضہ دو حجابی عمارتوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ایک مقبرہ ہے۔ دوسری مسجد۔ اور دونوں ایک باغ کے اندر چبوترے پر بنی ہیں، جو ۳۶۰ فٹ لمبا اور ۱۵۰ فٹ چوڑا ہے، یہ صاف ظاہر ہے کہ عمارتیں بنانے کا مقصد ایسی تخلیق تھی جو ہر اعتبار سے کامل ہو، اور ہندوستان کی بہت کم عمارتیں ہیں جن میں چھوٹی سی چھوٹی بات پر اتنی توجہ کی گئی، اور ہر کام اتنی نفاست سے کیا گیا جتنی کہ ان دو عمارتوں میں بروئے کار لائی گئی۔ مسجد کے مقابلہ میں مقبرہ زیادہ پر تکلف ہے، اس کا حسین دائرہ نما گنبد دریچوں کے ایک برج پر تاج کی طرح رکھا گیا، اور دریچوں کے برج کو محرابوں کے دو منزلہ اٹھائے ہوئے ہے، اندر سے مقبرہ سر تا سر مزین ہے، مگر آرائش کی افراط میں وہ نظم اور خوش اسلوبی ہے، کہ کوئی چیز ضرورت سے زائد نہیں۔ تعمیر، بنیت کاری اور تزئین کی قدروں کو اس طرح ہم آہنگ کرنے کی بہت کم مثالیں ملیں گی۔

غالباً اس وجہ سے کہ ابراہیم روضہ سے بہتر عمارت بنانا ممکن نہیں تھا، ابراہیم عادل شاہ کے جانشین محمد عادل شاہ ۱۶۲۷ء ۱۶۵۷ء نے طے کیا کہ اپنے لئے ایسا مقبرہ بنائے جس سے ابراہیم روضہ کا کسی طرح مقابلہ کیا ہی نہ جا سکے۔ اس کا مقبرہ جسے عرف عام میں گول گنبد کہتے ہیں، علم ہندسہ کی بنیادی شکلوں کا ایک عظیم الشان مجموعہ ہے، جس میں دو سو فٹ کے مربع پر ایک گول گنبد ہے، جس کا قطر ۱۴۴ فٹ ہے، اور کل عمارت کی بلندی دو سو فٹ ہے، اس کا گنبد غالباً دنیا میں سب سے بڑا ہے، روم

کی مشہور عمارت ہیں تینوں سے اس کا رقبہ بہرحال زیادہ ہے، گول گنبد میں آرائش سے پرہیز کیا گیا ہے اس کا چوڑا چھجہ کنگورے، چاروں کونوں کے برج دیکھنے میں بہت بوجھل معلوم ہوتے ہیں۔ وضع کے اعتبار سے ابراہیم روضہ سے زیادہ مختلف کوئی عمارت ہو ہی نہیں سکتی، اور گول گنبد کو خالص فنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ زیادہ موثر کارنامہ ہے، کیونکہ اتنے بھاری گنبد کے بوجھ کو محرابوں اور دیواروں پر تقسیم کرنا بڑا ہی مشکل کام تھا۔

جو عمارت مہتر محل کے نام سے مشہور ہے، دراصل ایک مسجد کا دروازہ ہے، غالباً دروازہ اور مسجد دونوں کی تعمیر ابراہیم عادل شاہ کے زمانہ میں کی گئی اور وہ اس دور کے طرز اور خوش مذاقی کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ مہتر محل کی روکار دو نازک ستونوں کے درمیان کا حصہ ہے۔ یہ ستونے اوپر جاکر حسین برجیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، عمارت کی سب سے نمایاں چیز ایک دریچہ ہے، جس کے آگے ایک توڑوں پر قائم کی ہوئی شہ نشین نکلتی ہے، اور جس کے اوپر چوڑا سائبان ہے، ... ہر ہر چیز کو خوش نما بنایا گیا ہے۔ اور اس پر بڑی دیدہ ریزی سے نبت کاری کی گئی ہے.. گویا سنگ تراش کے ہاتھ میں پتھر موم ہو گیا۔

صوبائی ریاستوں کے ساتھ ان کا طرز تعمیر بھی ختم ہو گیا، دلی میں خاندان سادات اور لودھیوں نے تعمیر کا سلسلہ تو جاری رکھا مگر ان کے وسائل بہت محدود تھے، ان کے زمانے میں جس طرز کی ابتدا ہوئی اس کی تکمیل شیر شاہ کی تعمیرات میں ہوئی۔ جنھوں نے فن اور حسن کاری کے لئے نئے راستے بھی نکالے۔ ان تعمیرات میں سب سے ممتاز شیر شاہ کا مقبرہ اور پرانے قلعے کی مسجد ہے،

شیر شاہ کا مقبرہ ایک بہت بڑے حوض کے بیچ میں بنا ہے، اس کی بنیاد بیں ڈھائی سو مربع ہیں، اور بلندی ڈیڑھ سو فٹ ہے، اس کی عظیم الشان جسامت کا تناسب تمام ترکیبوں کے باوجود قائم رہتا ہے، جو اسے ایک خاص شکل دینے کی خاطر کی گئی ہیں، اس کی مربع کرسی اور بنیاد پر ہشت پہل عمارت کھڑی کی گئی ہے، اور اوپر برجیوں میں سے گنبد اٹھایا گیا ہے جس کی چوٹی پر کلس ہے، ساری عمارت سے قوت اور مردانگی ٹپکتی ہے، اور اس کا فوراً ذہن پر اثر پڑتا ہے، اس کی تعمیر سنگ ڈامر سے کی گئی ہے اور شروع میں اس کی آرائش نیلے، سرخ اور زرد ٹائلوں کی پٹیوں سے کی گئی تھی، گنبد سفید تھا۔ اور کلس سنہرا۔ اب اس کا رنگ بھدا ہی نہیں بلکہ ناگوار بھی، پھر بھی شاید وہ اس شخصیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جس کے آثار یہاں دفن ہیں۔ ممکن ہے گول گنبد فنی اعتبار سے زیادہ ندرت رکھتا ہو مگر وہ تعمیر کا کرشمہ ہے، اس سے عمارت اور شخصیت، انسان اور اس کی یادگار کی ہم آہنگی ظاہر نہیں ہوتی۔ اسکے برخلاف، شیر شاہ کے مقبرہ کو دیکھ کر اس کی شخصیت، اس کے حوصلوں اور اس کی کارگذاری کا خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے، شیر شاہ "شاہ ابن شاہ" نہیں تھا۔ ایک معمولی فوجی افسر اور جاگیر دار کا لڑکا تھا، حالات بھی اس کے لیے کچھ بہت سازگار نہ تھے، اس کے باوجود وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے ترقی کر کے پٹھانوں کا قائد بن گیا، اس نے ہمایوں کو شکست دے کر ملک کے باہر نکال بھگایا، اور پورے شمالی ہندوستان کا فرمان روا بن گیا، اس نے شکست خوردہ اور مایوس پٹھانوں کو یقین دلایا کہ وہ مغلوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اور اپنی پانچ سال کی حکومت میں ایسی اصلاحات کیں جو بعد میں آنے والوں کے لیے مشعل راہ بن گئیں۔ فن جنگ

میں اس کی قابلیت اتنی تھی کہ اس نے مغلوں کے توپخانے کو جس کے بل پر بابر نے فتوحات حاصل کی تھی، بے اثر کر دیا۔ شیر شاہ کے مقبرے میں اس کے بلند پرواز حوصلے، اس کی اعلیٰ ہمت، اس کی نمایاں کامیابیاں مجسم ہیں۔ غالبًا انھیں اس طرح مجسم کرنا اس کا مقصد بھی تھا۔ اس نے اپنے سپہ سالاروں کو اپنے سوچے ہوئے طریقوں کے مطابق لڑنا سکھایا، اور فن تعمیر کے ماہروں سے ویسی عمارتیں بنوائیں جیسی کہ اس کے ذہن میں تھیں۔

پرانے قلعے کی مسجد شیر شاہ کی شخصیت کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتی ہے، یہ مسجد خاص بادشاہ کے لئے بنی تھی، دینی یا سیاسی علامت نہیں تھیں، اسی وجہ سے اس کا پیمانہ بھی چھوٹا رکھا گیا، مگر چھوٹے ہونے کی وجہ سے وہ اور گٹھی گٹھی اور مضبوط گویا قوت اور استقلال کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ فنی اعتبار سے وہ اس سلسلے کی تکمیل کرتی ہے، جس کی کڑیاں موٹھ کی مسجد، جمالی مسجد اور کھڑکی مسجد ہیں، اور اگرچہ وہ ان تینوں سے کہیں زیادہ حسین ہے، مگر اسی ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی لگتی ہے۔ اس میں کچھ شباہت قلعہ سے ہے، جس کا مقصد کسی خیالی دشمن کو مرعوب کرنا نہیں بلکہ مومن کی لازوال قوت ایمانی اور اس کے ذوق کو ظاہر کرنا ہے۔ اس کی روکار پانچ گنبدی محرابوں پر مشتمل ہے، جس کے مہرے بہت متناسب مستطیل ہیں،

اندر کا حصہ پانچ ایوانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور آرائش کی شکلوں کی ایسی تکرار ہے، جو پرسکون ہم آہنگی کا احساس دلاتی ہے اور ایسی وحدت کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو وجدان اور معرفت کا ایک اعلیٰ مقام ہے،

ابراہیم روضہ، گول گنبد اور قطب شاہی مقبروں کی تعمیر کے زمانہ ہی میں شمالی ہندوستان میں مغلوں کی حکومت تھی، اور دکن اور شمالی ہند کی اس دور کی عمارتوں

کا مقابلہ اور موازنہ کیا جائے تو اس طرز تعمیر کی خصوصیات واضح ہو جائیں گی۔ جو مغلون سے منسوب کیا جاتا ہے

ابراہیم روضہ اور مہتر محل میں انتہائی شائستگی اور حسن مذاق نظر آتا ہے، مدرسۂ محمود گاوان اور قطب شاہی مقبرے ایرانی طرز تعمیر اور تہذیب عمارت کو بغیر کسی تبدیلی کے اختیار کرنے کی مثالیں ہیں۔ مغل شہنشاہون نے کسی روایت اور کسی معیار کی آنکھ بند کر کے پابندی نہیں کی۔ مگر اپنے تخیل اور خوش مذاقی کی بدولت پرانی روایات میں ایک نئی جان ڈال دی۔ سلطنت دہلی ایسے زمانے میں قائم ہوئی جب تاتاری حملوں نے اسلامی دنیا کے سیاسی اور معاشی نظام کو تہ و بالا کر دیا تھا، اور موقع کے لحاظ سے جس اثبات خودی کی ضرورت تھی اس کا عکس اس دور کی سیاست کی طرح اس کی تعمیرات میں بھی نظر آتا ہے۔ مغل سلطنت کے بانی بابر کو بہت سے دشمنون کا مقابلہ کرنا پڑا، جب کہ اس کے وسائل حقیر اور ساتھی ناقابل اعتبار تھے، مگر یہ تدبیر اور تقدیر کے کھیل تھے، جو مرد آدمی کھیلا کرتے تھے، اور ان کی ہمت کا اندازہ اس سے کیا جاتا تھا، کہ وہ کامیابی اور ناکامی سے کیا اثر لیتے۔ اکبر اور شاہ جہان کو اثبات خودی کی وہ کیفیت جو تغلقی کے مقبرے میں نظر آتی ہے، بھونڈی لگتی اور اس شان کو دیکھ کر جو شیر شاہ کے مقبرہ میں ہے، وہ مرعوب نہ ہوتے، وہ عمارت کو تہذیب اور کردار شائستگی، نفاست اور قوت کے ایک نئے تصور کا ترجمان بنانا چاہتے تھے، اور اگرچہ ان کا حوصلہ یہ تھا کہ ایسی چیز بنائیں جس پر زمانہ کے گذرنے کا اثر نہ ہو، وہ اس کی پوری کوشش کرتے تھے، کہ عمارت پر بے حرکت اور بے جان مسالا ہونے کا گمان نہ ہو۔ انسانی شخصیت کا جو خاکہ ان کے ذہن میں تھا۔ اس میں حوصلہ اور کار پرداز

کے ساتھ وہ قدریں بھی شامل تھیں جو زندگی میں حسن اور دلربائی پیدا کرتی ہیں، اور جو کچھ معمولاً محنت اور صبر سے حاصل ہوتا ہے، اسے وہ جمالیاتی احساس کی شدت سے حاصل کر لینا چاہتے تھے مغلوں کی تعمیرات میں صرف دولت کے کرشمے اور فن کی خوبیاں نہیں نظر آتی ہیں بلکہ شخصیت کا ایک نصب العین، شعر کی لطافت، باغ اور پھول اور بہتے پانی کا مزہ،

مغلوں کی اہم تعمیرات کا سلسلہ ہمایوں کے مقبرہ سے شروع ہوتا ہے، جسے اسکی ملکہ حاجی بیگم نے بنوایا، مقبرہ ایک رسمی باغ اور نہروں کا مرکزی نقطہ ہے، باغ کی چاردیواری میں آمنے سامنے چار دروازے ہیں۔ اور خاص دروازہ مغرب کی طرف ہے، باہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دروازہ ایک آرائشی اوٹ (SCREEN) ہے، جو آسمان سے اتار کر لگائی گئی، اور جس کے در سے مقبرہ کے حسن اور نزاکت کا جلوہ نظر آتا ہے، مقبرہ کی ادا ایرانی ہے، کیونکہ اس وقت تک ایسے گنبد، گنبدی محرابیں، کمرے اور غلام گردشیں صرف ایران ہی میں بنتی تھیں اس میں ہندوستانی رنگ چاروں کونوں پر برجیاں بنا کر اور آرائش میں ضبط اور سادگی سے کام لیکر پیدا کیا گیا ہے، مگر ایرانی اور ہندوستانی ذوق کی آمیزش ایسی کامل ہے کل عمارت اور اس کے اجزا کا تناسب ایسا صحیح ہے، کہ اس کے حصوں یا خصوصیات کو الگ الگ کرکے انکا جائزہ لینا کچھ بیجا سا معلوم ہوتا ہے، ہمایوں کے بارے میں ہمیں کوئی ایسی بات معلوم نہیں جو اس کی شخصیت کو ممتاز کرتی ہو، اس کے مقبرے میں جو عظمت ہے وہ اسے نصیب تھی، اور خیال ہوتا ہے کہ اس کے اپنے اوصاف نے نہیں بلکہ کسی کی محبت نے اسے ایسی یادگار کا مستحق بنا دیا۔ تہذیبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو

یہی محبت تھی جس نے ناکام تدبیروں، بھگوڑے کی زندگی، فریب اور بربادی کے مجموعے کو اپنی قوت تخلیق کی بدولت ایسی عمارت کی شکل دیدی جو استقلال حسن اور شاعرانہ لطافت کا بےمثل نمونہ ہے،

ہمایوں کے مقبرے کی تعمیر جب شروع ہوئی تو اکبر کو تخت پر بیٹھے آٹھ سال ہوچکے تھے، اور دارالسلطنت دین پناہ (دہلی) سے آگرہ منتقل ہوگیا تھا، دہلی میں اس کے بعد چند عمارتیں بنیں جیسے کہ ادھم خان یا اتکا خان کے مقبرے، مگر انھیں کوئی اہمیت نہیں حاصل ہے، تعمیرات کے کام آگرہ، فتح پور سیکری، لاہور، الہ آباد اور اجمیر میں ہوئے،

اکبر کی بنوائی ہوئی عمارتیں اس کے سیاسی اور دینی تصورات کی، مگر ان کے علاوہ اس کی سیرت کی اور خصوصیات کی بھی ترجمانی کرتی ہیں، اس نے تعمیر کے لئے بیشتر سرخ پتھر استعمال کئے اور سوائے سیکری کی جامع مسجد کے اندرونی حصہ اور اس کے مقبرہ کے دروازے کے، سنگ مرمر صرف اس حد تک استعمال کیا گیا ہے، کہ رنگ کی یکسانیت نظر کو ناگوار نہ ہو۔ اس کی طبیعت افراط کو ناپسند کرتی تھی، اور یہ بات کہ اس نے کئی اقامتی قلعے بنوائے سمجھ میں آجاتی ہے، اگر ہم یاد رکھیں کہ اس وقت بڑے شہروں میں بادشاہ کے رہنے کے لئے محل نہیں تھے، غالباً سیکری میں محل، سرکاری دفتر اور بڑے عہدہ داروں کے مکان بنوانے کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے کہ بننے کے چند سال بعد یہ چھوڑ دئے گئے۔ لیکن اکبر کے دل میں کوئی ایسی چیز بنانے کا حوصلہ، جو تصور کے لحاظ سے اور دیکھنے میں بھی اعلیٰ ہو، ایسا شدید تھا کہ وہ اس پر قابو نہ پاسکا جب ایک نیا شہر آباد کرنے کا موقع نظر آیا۔

سیکری کی عمارتیں قریب ساڑھے تین سو برس سے بیکار پڑی ہیں، اور اب بھی ان میں مسالے اور پتھر سے زیادہ وہ تصور نمایاں ہے جسکی بدولت وہ وجود میں آئیں اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ انکی تعمیر کا سبب کوئی بہت ہی موثر جذبہ ہوگا۔

اکبر کی تعمیرات کا سلسلہ آگرہ کے قلعے سے شروع ہوتا ہے، جہاں پانچ سو سے اوپر گجرات اور بنگال کے طرز پر بنی ہوئی نفیس عمارتیں کھڑی کی گئیں، اکبر کا ذوق کسی قسم کی روایات کا پابند نہیں تھا۔ اس نے سارے ملک سے معمار اور کاریگر جمع کئے اور اپنے منصوبوں کو ان کے لیئے اظہار خودی کا ذریعہ بنایا، افسوس ہے کہ شاہ جہان نے ان سرخ پتھر کی عمارتوں کو شاہی محل کے قابل نہ سمجھا جب کہ بہتر مسالا اور زیادہ وسائل فراہم تھے، اور اس نے انھیں ہٹا کر اپنے منشا کے مطابق عمارتیں بنوائیں۔ اب اکبر کے دور کی ان عمارتوں میں سے صرف قلعے کی فصیل اور دروازے اور جہانگیری محل باقی ہے، یہ محل رہائشی کمروں اور دالانوں کے مجموعے کا نام ہے، اور اس میں ہندو طرز تعمیر کو مسلمانوں کے طریق زندگی کے لیئے مناسب بنانے کی کوشش کی گئی ہے قلعے کی فصیل ڈیڑھ میل کے قریب لمبی اور ستر فٹ اونچی ہے، اور اسی کے ساتھ اس کے کنگروں، موکھوں اور راستہ کو دیکھیئے تو وہ فن کا ایک اعجوبہ معلوم ہوتی ہے، دروازوں میں سے دہلی دروازہ عام آمد و رفت کے لئے تھا، باہر سے یہ شائستہ قوت اور استقلال کا پتہ دیتا ہے اور اندر سے کشادگی اور متانت کا۔

فتح پور سیکری کی فضا اب خانہ خالی کی سی ہے، اس کی عمارتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک مشتمل ہے دیوان عام، دیوان خاص،

حرم، بارہ دریوں صحنوں، دفتروں اور عہدہ داروں کے مکانوں پر، دیوان عام ایک بہت بڑا گھیرا ہے، جو دربار اور فوج کے معائنہ کے لئے تھا، اس کے برخلاف دیوان خاص بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے، اور اس میں بادشاہ کے لئے ایسا مقام رکھا گیا ہے، گویا اس کا ایک مصرف بادشاہ پرستی بھی تھی۔ صحنوں میں سے ایک میں بہت بڑی چوسر پچیسی کی بساط ہے، جس میں مہروں کی جگہ لونڈی، غلاموں کو رکھا جاتا تھا، عمارتوں کے دوسرے حصہ میں جامع مسجد، اس کے دروازہ اور شیخ سلیم چشتی کے مزار کو شمار کیا جاسکتا ہے، جامع مسجد اور اس کے صحن میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی ایک وقت میں نماز پڑھ سکتے ہیں، دروازہ اندر کی طرف سے صحن کی وسعت کو دیکھتے ہوئے کچھ بہت بڑا نہیں لگتا، باہر کی طرف سے وہ ایسا شاندار ہے کہ اس کا جواب دنیا میں شاید ہی کہیں ملے۔ شیخ سلیم کا مزار سنگ مرمر کا ہے، اس کے برآمدے کی چھت گجراتی وضع کے توڑوں پر جمائی گئی ہے، اور جالیوں میں کاریگری کا کمال دکھایا گیا ہے، جامع مسجد میں محرابی اور شہتیری طرز تعمیر کو بڑی خوش اسلوبی سے ہم آہنگ کیا گیا ہے، اور اس کے مرکزی اور بغلی دالانوں میں جو تہذیب اور منبت کاری کا کام کیا گیا ہے، اس پر ایکبارگی نظر پڑتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے شگفتہ پھولوں کا ہجوم سامنے آگیا ہے،

جامع مسجد کا جنوبی دروازہ جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے، گجرات کی فتح کی یادگار کے طور پر بنوایا گیا، اور اس کی تعمیر کا منشا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی نسلیں اکبر کی کارگذاری کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ بالکل نیچے سے زینوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ بیالیس فٹ اوپر دروازہ کی بنیادوں تک جاتا ہے، دروازہ خود ایک سو چونتیس فٹ اونچا ہے

اس کی رو کار کے تین حصے ہیں، ایک مرکزی، دو بغلی، اور بغلی حصے پیچھے کی طرف مڑے ہوئے ہیں، مرکزی حصہ ایک عالی شان گنبدی محراب پر مشتمل ہے، جو دروازے کی فنی اور جمالیاتی اعتبار سے سب سے ممتاز صفت ہے، نیم گنبد کی گولائی پانچ درجوں سے گذرتی ہے، اور "بنانے والے نے بڑی خوبصورتی سے ان پانچ درجوں کے ذریعے گنبدی محراب کی بلندی کو قد آدم در کی پستی سے ملایا ہے" بالکل اوپر کنگورے ہیں، اور ان کے پیچھے نازک برجیوں کی ایک قطار، یہ گویا تاج ہے ایسے حوصلے کا جو صرف سیاسی نہیں بلکہ تہذیبی مقاصد کا علم بردار تھا۔

اکبر کے مقبرے کو اس کی شخصیت اور نصب العین کا آخری اور سب سے مکمل نقش ہونا چاہیے تھا، ایک لحاظ سے وہ ہے بھی۔ اکبر کی اصل قبر زمین کی سطح پر ہے، مقبرہ پانچ منزلوں کا، اور ہر منزل کے مرکزی نقطے پر ایک نمائشی تابوت ہے، آخری منزل پر تابوت ایک کھلے صحن میں ہے، اس کے اوپر نہ گنبد ہے نہ برجی، صحن کے چاروں طرف جالی کی دیوار ہے، اور کونوں پر سنگ مرمر کی نازک سی برجیاں۔ یہاں موت کوئی راز یا چھپنے کی بات نہیں معلوم ہوتی، قدرت کا ایک عاشق اس کی گود میں سو رہا ہے، اسے دھوپ چھاؤں، سردی گرمی سے کوئی مطلب نہیں وہ ایک گہری نیند سو رہا ہے اور نہیں چاہتا کہ کوئی اسے اٹھائے، لیکن عمارت کے مجموعے میں یہ خیال کچھ دب سا گیا ہے، مقبرہ کا دروازہ صنعت کا کرشمہ ہے، اس میں سنگ سرخ کی سرخی مرمری بیلوں میں اس طرح گم ہو جاتی ہے، گویا گوشت و پوست گھل کر خالص روح بن گئے ہیں، پھول اپنی ہی خوشبو میں حل ہو گئے ہیں، چار حسین مینارے ہماری نظروں کو اوپر کی طرف لے جاتے ہیں، مادی دنیا کو اپنے

جمال کے سہارے فضا کی بلندیون میں گم کر دیتے ہیں، ہمارا جی چاہتا ہے کہ اس دروازے کو کھڑے دیکھتے رہیں، قیاس کہتا ہے کہ اس سے آگے اور اس سے بہتر کچھ ہو ہی نہیں سکتا، مگر قدم ہیں کہ آگے لئے چلے جاتے ہیں، اور ہمیں دروازے سے گذار کر مقبرہ کے باغ میں پہنچا دیتے ہیں، یہان نظر کچھ مایوس ہوتی ہے، مقبرے کی کرسی ایک وسیع چوکور چبوترا ہے، جو گنبدی محرابوں کی قطاروں پر قائم کیا گیا ہے، اور ہر طرف بیچ میں گنبدی محراب کو اونچا کر کے اور اس کے اوپر مرمری برجی بنا کر قطارون کی یکسانیت کو دور کیا گیا ہے، مگر جو شان کرسی میں ہے، وہ اصل عمارت میں نہیں ہے، کیونکہ اس کی منزلین نیچی نیچی ہیں اور تعمیر کی کوئی خصوصیت اسے ممتاز نہیں کرتی، اکبر کا مقبرہ جہانگیر کے زمانہ میں بن کر تیار ہوا، جہانگیر کو خاص شوق مصوری اور باغات کا تھا، ویری ناگ اور چشمہ شاہی چشمون کو محصور کر کے بنائے گئے، اور انکا حسن صرف ان کی اپنی نہروں اور پھولون میں نہیں ہے بلکہ اس منظر اور طلوع اور غروب کی کیفیتوں میں ہے جس کا لطف وہان بیٹھ کر اٹھایا جا سکتا ہے، تعمیرات میں اکبر کے مقبرے کے علاوہ صرف اعتماد الدولہ کا مقبرہ قابل ذکر ہے، اس نفیس گٹھی عمارت کے پچی کاری کے کام اور جالیون کی بہت تعریف کی گئی ہے، مگر اس میں یہ بھی محسوس ہوتا ہے، کہ تعمیر کے فن پر تہذیب عمارت کا فن بالکل غالب آ گیا ہے، اعتماد الدولہ کی طرح جہانگیر کے اپنے مقبرے میں بھی خاص چیز آرائش اور تہذیب کا کام ہے، شاہ جہان کے عہد میں تعمیرات کا ایک دور شروع ہوا جس میں فنی روایات کی پیروی کی گئی ہے، مگر بہت سوچ سمجھ کر اور سلیقے سے، اور جدتوں میں ان اقدار کا لحاظ رکھا گیا ہے جو تعمیر کے سارے میں مضمر ہیں۔ تعمیر میں نئی چیز جس کا دل

کھول کر مگر بغیر اصراف کے استعمال کیا گیا. سنگ مرمر ہے جس کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مکرانہ میں دستیاب ہو گیا تھا، شاہ جہان نے پہلے آگرہ کے قلعے میں ترمیمیں اور اضافے کئے، دیوان عام بالکل نئے سرے سے بنایا گیا، اس کے در کشادہ ہیں، اس لئے سبک معلوم ہوتے ہیں، اور ستونوں اور مرغولوں کی باریک سنگ موسیٰ کی لکیرین سے مرصع کاری ایک عجیب رونق پیدا کر دیتی ہے، دیوان خاص کی محرابیں اپنے تناسب کی وجہ سے بہت حسین معلوم ہوتی ہیں، اور یہاں یہ جدت کی گئی ہے کہ محرابوں کے پائے دہرے کر دئے گئے ہیں، لیکن قلعہ کی عمارتوں میں شاہجہان نے جو اضافے کئے ان میں سب سے زیادہ موثر اور ممتاز موتی مسجد ہے، اس کے در اور ایوان، سبک بر جیان، مقابلے اور جواب کی کیفیتیں حسن، توازن اور صفائی کی وہ فضا پیدا کرتی ہیں، جو عبادت کرنے والے کے دل پر طاری ہونی چاہئیں،

مگر شاہجہان کی حوصلہ مند طبیعت موتی مسجد جیسی عمارتیں بنا کر بھی مطمئن نہیں ہو سکتی تھی، اس کی ملکہ ممتاز محل کا ۱۶۳۱ء میں انتقال، اور اسی وقت سے وہ ایک ایسی عمارت کا خواب دیکھنے لگا، جو بظاہر مقبرہ لیکن معنوی اعتبار سے ممتاز محل کی شخصیت اور محبت کو اس طرح سے عیان کرے کہ دنیا سے صدیوں تک ذوق اور حیرت سے تکتی رہے، جس زمانے میں یہ عجوبہ جس نے "تاج محل" کا نام پایا بن رہا تھا، شاہ جہان نے دہلی میں قلعہ، مسجد اور شاہجہان آباد کے نام کے ایک نئے شہر کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیا، آگرہ میں اس نے اپنی لڑکی جہان آرا کے نام سے ایک مسجد بنوائی جس کی ۱۶۴۸ء میں تکمیل ہوئی۔ اسی دوران میں وہ آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں پرانی عمارتوں کو ہٹا کر اپنے نزدیک بہتر عمارتیں بنواتا اور چھوٹے موٹے اضافے کرتا رہا،

دہلی کے لال قلعے کی فصیل ایک مستطیل بنائی ہے، جو تین ہزار ایک سو فٹ لمبی اور ساڑھے سولہ فٹ چوڑی ہے، اس فصیل میں دو دروازے ہیں، ایک جنوب میں خاص محل والون کی آمد و رفت کے لئے، اور ایک مغرب میں دربار اور سرکاری کامون سے آنے جانے والون کے لئے دروازہ کا نقشہ بہت سادہ اور سلجھا ہوا ہے، پھر بھی اس میں فوجی مصلحتون اور تعمیری حسن کا جس طرح لحاظ رکھا گیا ہے، وہ اسے فنی اعتبار سے ایک کامل نمونہ بنا دیتا ہے، دروازہ سے گذرتے ہی ہم ایک بلند اور چوڑے چھتے میں پہنچتے ہیں، اور اس کے بعد ایک چورا ہہ ہے، جہان جنوبی دروازہ سے آنے والی سڑک ملتی ہے، اس کے آگے ایک احاطہ سا ہے، جس کے اندر شاہی اور حرم سرا کی عمارتین ہیں، سب سے پہلے نوبت خانہ ہے، جہان دن کے پہر دن کو راگون اور راگنیون کے ذریعے بتایا جاتا تھا، اور اسی کے مقابلے پر دیوان عام ہے، دائیں اور بائیں جو کچھ تھا، وہ اب موجود نہیں ہے اور لال قلعہ کی قسمت سے کچھ بہت ہی بدنما فوجی بیرک کھڑے کر دیئے گئے ہیں، جنھیں دیکھکر طبیعت الجھتی ہے، دیوان عام کے مشرق میں ایک باغ ہے، جس کے شمالی حصہ میں نہرین حوض اور ساون بھادون کے نام کی چودریان ہیں، محل کی عمارتین اس باغ کے مشرقی جانب دریا کے کنارے بنی تھیں، اور ان میں دیوان خاص، رنگ محل اور حمام ممتاز ہیں، یہ سب سنگ مرمر کی ہیں، ان کے درون کی بجرا ہیں ان کی قیمتی مگر نپی تلی آرایش ان کی نہرین اور اتھلے، خوش نما حوض زندگی کے ایسے حسن کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو مادیت سے بالکل پاک ہو، حقیقت کچھ اور تھی، یہ محل بلا وجہ آبادی اور چہل پہل سے محروم نہیں ہوئے، لیکن فن تعمیر کے کمال نے ان میں ایسی جان ڈال دی کہ اب بھی در و دیوار سے شان و شوکت ٹپکتی ہے،

لال قلعہ کی دنیاوی عظمت کا جواب دہلی کی جامع مسجد اب بھی نماز اور نمازیون سے آباد ہے، رقبہ کے لحاظ سے یہ ہندوستان کی سب سے بڑی مسجد ہے، اور اسے اتنی اونچی کرسی دی گئی ہے کہ وہ شہر پر حاوی ہو گئی ہے، فنی اعتبار سے یہ ایک کامل نمونہ اور تنقید سے بالاتر ہے، لیکن اس مین ہر چیز کا حساب اتنا صحیح ہے کہ اس کا حسن ذوق سے خالی معلوم ہوتا ہے، اس میں عبادت تو خدا کی ہوتی ہو گی، مگر اس بات کا اثر بھی عمارت میں آگیا ہے، کہ چارون طرف مغل شہنشاہ کی حکومت تھی، اس کے برخلاف آگرہ کی جامع مسجد پر جو رقبہ مین دہلی کی جامع مسجد کی آدھی ہے، عبادت گاہ کا رنگ غالب ہے، اور اسے دیکھکر خیال نہ شہنشاہیت کی طرف جاتا ہے، نہ دنیا کے بھروسوں کی طرف،

دہلی کی جامع مسجد اور تاج محل مین تعمیر کی دو شکلین، مسجد اور مقبرہ، اپنے کمال کو پہنچ گئین، دونون کی خصوصیتین ارتقائی منزلون مین صدیون پیچھے تک مختلف عمارتون مین دیکھی جاسکتی ہین، لیکن اگر ایک طرف جامع مسجد کا حسن بے عیب ہے، تو دوسری طرف تاج محل مین معمار کا تصور ان بلندیون تک پہنچ گیا ہے، جہان عمارت شعر اور نغمہ مل کر وجد کی ایک کیفیت بن جاتے ہین، تاج محل کی مادی خصوصیات بیان کی جاسکتی ہین، اس کا نقشہ اتنا سادہ ہے کہ کہا جاسکتا ہے، اس مین کوئی بات ہی نہین، وہ جمنا کے کنارے بنا ہے، ایک احاطہ کے اندر جس کے رقبہ اور مقبرہ کی عمارت کے درمیان صرف وہ تناسب نہین ہے جو دو شکلون کے درمیان ہونا چاہئے، بلکہ وہ ہم آہنگی ہے، جو سر دھن مین ہوتی ہے، احاطے کے جنوب مین ایک عالی شان دروازہ ہے، اور توازن کے لئے اس طرف دونون کونون پر ہشت پہل بارہ دریان ہین، دروازے سے گذر کر تاج محل پر نظر پڑتی ہے، تو وہ خاصا چھوٹا سا لگتا ہے، اس لئے کہ باغ کی چوڑائی ایک ہزار فٹ ہے، دروازہ سے تاج تک جو راستہ ہے،

اس کے بیچ میں ایک چوڑی نہر ہے، اور باغ کے بیچ میں زمین سے اوپر اٹھا ہوا حوض ہے جس میں ہر وقت تاج کا عکس پڑا رہتا ہے، مقبرہ ایک اونچے چبوترے پر ہے، یہان بھی توازن کے خیال سے مشرق اور مغرب میں جوابی عمارتیں ہیں جن میں سے ایک مسجد ہے اور دوسری مہمان خانہ کہلاتی ہے، مقبرہ کا چبوترہ بائیس فٹ اونچا اور چوکور ہے، اور اس کے ہر کونے پر ایک مینار ہے، مقبرہ کی عمارت بھی چوکور ہے، اور اس کے اندر کمرون اور غلام گردشون کی ترتیب ویسی ہی ہے، جیسے کہ ہمایون کے مقبرہ کی، لیکن تاج کا گنبد مختلف ہے، گنبد کے نیچے کا حصہ یعنی ٹیپا بہ نسبت زیادہ اونچا ہے، اور کلس بھی الگ سے لگائی ہوئی چیز نہین بلکہ عمارت کا جزو معلوم ہوتا ہے، کلس کو شامل کر کے تاج کی بلندی ۲۰۰ فٹ ہے۔

تاج میں جو سنگ مرمر لگا ہے، وہ بھی اس کی خوبیون میں سے ہے، کیونکہ یہ پتھر روشنی اور فضا کی بدلتی ہوئی کیفیتون کا اثر اس طرح لیتا ہے، گویا وہ ان کا آئینہ بن گیا ہے، لیکن یہی پتھر دوسری عمارتون مین بھی استعمال کیا گیا، اور وہان اس میں یہ صفت نظر نہیں آتی درا‌صل تاج کے نقشہ کا حسن ہی پتھر میں اتر آیا ہے، اس شخص کے لئے جو ہندوستانی مسلمانون اور خاص طور سے مغلون کے فن تعمیر کا منزل بہ منزل مشاہدہ کرتا آیا ہو اسے تاج محل میں اس فن کی تمام قدرون کی تکمیل نظر آئے گی، اور اسے محسوس ہوگا کہ یہان فن تمام بندشون سے آزاد ہو گیا ہے، مسالا، چونا، پتھر، وہ تمام ٹھوس مادی چیزین جنکا عمارت کی مضبوطی اور پائداری کی خاطر بہت صحیح حساب لگانا پڑتا ہے تاج میں ایسی لطیف ہئیت اختیار کر لیتی ہیں، کہ مادیت کا کوئی احساس پیدا نہین ہوتا، ہمایون کے مقبرہ میں شعر کا رنگ ہے، اور خان خانان کے مقبرہ میں کلاسکی ضبط کا، تو تاج محل ایک شاعرانہ خیال ایک واردۂ قلبی ہے، جو الفاظ اور بیان کا محتاج نہیں، جو لوگ ہندوستانی مسلمانون کے یا کہیں کے بھی فن تعمیر سے واقف نہین ہیں، تاج محل انکی آنکھیں بھی کھول

دیتا ہے، گویا وہ کسی ایک ملک اور کسی ایک قوم کی چیز نہیں ہے بلکہ ہر زمانے اور ہر تہذیب مین پرورش پائے ہوئے انسان اسے اپنا کہہ سکتے ہیں، وہ ان تمام لوگون کی آرزو پوری کرتا ہے، جنکے دلون میں محبت ہے، اور ان کے جسم خاک ہو جائیں گے، تو ان کی روحین محبت کے اس نقش کو محفوظ رکھین گی اسطرح تاج کا زمان و مکان سے تعلق صرف ایک حد تک ہے، وہ ایک بادشاہ اور اس کی ملکہ کی محبت کی یادگار نہیں بلکہ نوع انسانی کو اس کا یقین دلانے کا ذریعہ ہے، کہ عشق مین لازوال حسن بن جانے کی قدرت ہے،

تاج محل کے بعد بھی تعمیرات کا سلسلہ جاری رہا، لاہور میں وزیر خان کی مسجد اور بادشاہی مسجد میں نئے طرز کو آزمایا گیا، لال قلعہ مین اورنگ زیب نے موتی مسجد بنوائی، اٹھارہوین صدی کے وسط میں صفدر جنگ کا مقبرہ تعمیر ہوا، ان سب عمارتون میں اپنی اپنی خوبیان ہیں، مگر کوئی ممتاز صفت نہیں ہے، تاج محل میں جو قوت تخلیق اپنی معراج کو پہنچی تھی، وہ پھر زمین پر واپس نہ آسکی

رفاہِ عام کے کام

از مولانا عبد السلام ندوی

تمدن کے ضروری اجزا میں چند چیزیں ایسی ہیں، جن سے تمام مخلوق یکسان طور پر فائدہ اٹھاتی ہے، اور اس میں امیر و غریب، ہندو اور مسلمان کی کوئی تفریق نہیں ہوتی، انہی چیزون کو رفاہِ عام سے تعلق ہوتا ہے، اور مسلمانون نے اپنے دورِ حکومت میں رعایا کے آرام و آسایش کیلیے ہندوستان مین نہایت وسیع پیمانے پر تمدّن کے ان ضروری اجزا کو ترقی دی، چنانچہ ان سب کی تفصیل یہ ہے،

شفاخانہ اسلامی عہدِ حکومت میں سب سے پہلے فیروز شاہ تغلق نے جو ۷۵۲ھ میں تختِ سلطنت پر بیٹھا تھا، ایک بہت بڑا شفاخانہ جس کو صحت خانہ بھی کہتے تھے، قائم کیا، اور اس میں بہت سے طبیب، جرّاح اور کحّال مقرر کیے، مریضون کی دوا اور غذا کا انتظام کیا، اور شفاخانے کے مصارف کیلیے بہت سے دیہات وقف کیے،[1]

تاریخ فیروز شاہی میں صرف اسی ایک شفاخانہ کا حال لکھا ہے، لیکن تاریخ فرشتہ میں ہے، کہ فیروز شاہ نے پانچ شفاخانے قائم کیے تھے،[2]

اسکے بعد سلطان علاؤالدین بن سلطان احمد شاہ بہمنی المتوفی ۸۵۶ھ نے احمد آباد بیدر مین ایک نہایت عمدہ شفاخانہ قائم کیا اور مریضون کی دوا و غذا کے مصارف کیلیے اس پر چند گاؤن وقف کیے،[3]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی حصہ دوم از ص ۳۵۳ تا ۳۵۹ [2] فرشتہ جلد اوّل ص ۱۵۱ [3] ایضاً جلد اوّل ص ۳۳۳

تاریخ دکن میں لکھا ہے کہ سلطان علاؤالدین پہلا شخص تھا جس نے دکن کے شہروں میں شفاخانے قائم کئے، اور اطباء کی تنخواہ اور دوا کے مصارف کا انتظام سرکاری خزانہ سے کیا،[1]

اسی صدی میں سلطان محمود خلجی نے جو ۸۳۹ھ میں یعنی سلطان علاءالدین کی تخت نشینی کے چند ہی سال بعد مالوہ کے تخت سلطنت پر بیٹھا تھا ۸۴۴ھ میں شادی آباد میں ایک شفاخانہ قائم کیا، اور دوا اور دوسرے ضروری سامان کے لئے اس پر چند گاؤں وقف کئے، اور حکیم مولانا فضل اللہ کو مریضوں اور مجنونوں کے علاج و نگرانی کے لئے مقرر کیا،[2]

ان بادشاہوں کے بعد سلاطین تیموریہ میں سب سے پہلے جہانگیر نے شفاخانوں کے قیام کی طرف توجہ کی، اور اپنی تخت نشینی کے ساتھ ہی جو احکام جاری کئے، ان میں نواں حکم یہ تھا،

"نہم در شہرہائے کلان دار الشفاہا ساختہ اطبا بجہت معالجہ بیماران تعین نمایند و آنچہ صرف و خرچ می شدہ باشد از سرکار خالصہ شریفہ می دادہ باشند"[3]

اس کے علاوہ دورِ اکبری و جہانگیری میں ایک مشہور طبیب حکیم علی تھے، جو ذاتی طور پر تقریباً ۶ ہزار سالانہ کی دوائیں مستحقین کو تقسیم کرتے تھے،[4]

جہانگیر کے بعد شاہجہان کا دور حکومت شروع ہوا، تو گو اس نے خود کوئی جدید شفاخانہ نہیں قائم کیا، لیکن امرائے شاہجہانی میں وزیر خاں نے جو سات سال سے زیادہ مدت تک پنجاب کے صوبہ دار رہے، اپنی یادگار میں جو آثار خیر چھوڑے ان میں شفاخانے بھی تھے،[5]

عالمگیر کے زمانہ میں بھی متعدد شفاخانے قائم تھے، اگرچہ تاریخوں میں اس کا مفصل حال مذکور نہیں ہے، تاہم جابجا ضمنی طور پر ان کا تذکرہ آجاتا ہے، مثلاً مراۃ احمدی میں ایک موقع

---

[1] تاریخ دکن ص ۱۰۸، [2] فرشتہ جلد دوم ص ۲۴۸ [3] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۵ [4] مآثر الامراء حصہ اول ص ۵۷۳ [5] ایضاً حصہ سوم ص ۹۳۶

لکھا ہے،

"ویک ہزار و پانصدہ ہشتاد روپیہ بموجب برآوردِ بنا بہ ترمیم مدرسہ، مسجد و حمام و دار الشفائے بنا کردہ سیف خان تنخواہ گردید[1]"

اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر لکھا ہے،

"وخدمت دار الشفائے بلدہ از تغیر حکیم محمد تقی شیرازی بحکیم رضی الدین مقرر گشت[2]"

عالمگیر کو چونکہ یہ خاص خیال تھا کہ تمام سرکاری کام نہایت دیانت اور ایمانداری کے ساتھ انجام پائیں، اس لئے اس نے ایک بار ایک سوانح نگار اور شفاخانے کے ایک طبیب کو جو ان اوصاف سے معرا تھے، برطرف کر دیا، ملا سعد اللہ نے جو بندر سورت میں رہتے تھے، اور عالمگیر کو ان کے ساتھ اس قدر عقیدت تھی کہ وہ جن لوگوں کی سفارش کرتے تھے، اُن کو ضرور قبول کرتا تھا، اور خود اپنے ہاتھ سے اُن کے خطوط کا جواب لکھتا تھا، ان دونوں کی بحالی کی سفارش کی، اور عالمگیر نے ان کی سفارش سے ان کو بحال کر دیا، تاہم اس کی عقیدت میں بہت کچھ فرق آگیا، پہلے ان کے خطوط کا جواب خود اپنے ہاتھ سے لکھا کرتا تھا، لیکن اس معاملہ میں اہلکاروں سے خط لکھوایا کہ آپ جیسے فاضل فقیر اور پرہیزگار کو صرف فقراء و علماء کی سفارش کرنی چاہئے، یہ ظالم لوگ ہیں، اور ظالموں کی اعانت ممنوع ہے، بہرحال اس دن سے ان کے خطوط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھنا کم کر دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کو اور تمام محکموں کی طرح شفاخانوں کے انتظام کا کس قدر خیال تھا[3]،

سرائے اسلامی دورِ حکومت میں سب سے پہلے سلطان محمد تغلق شاہ کے زمانہ میں، جو ۷۲۵ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، سرایوں کا پتہ چلتا ہے، جب اس کے عہد میں فتوحات کا

---

[1] مراۃ احمدی جلد اول ص ۲۰۹ [2] ایضاً ص ۲۸۵ [3] خافی خان جلد دوم ص ۵۷۰، ۵۷۱

دائرہ وسیع ہوا، تو اس نے ایک ایسے شہر کو دارالسلطنت بنانا چاہا جو دائرے کے ساتھ مرکز کی نسبت رکھتا ہو، تاکہ وہان ممالک محروسہ کی تمام بری بھلی خبرین یکسان طور پر پہنچتی رہیں، اور اگر کوئی حادثہ یا کوئی مرض پیدا ہو جائے، تو اس کا تدارک و علاج آسانی کے ساتھ کیا جا سکے، راجہ بکرماجیت نے اوجین کو جو وسط ہند میں واقع ہے، اسی غرض سے اپنا دارالسلطنت بنایا تھا، اور سلطان محمد تغلق شاہ کو بھی اس کے ارکان دولت نے یہی مشورہ دیا، لیکن بعض لوگون نے اس مقصد کے لئے دیوگر کا انتخاب کیا، اور بادشاہ نے بھی اسی رائے کو پسند کیا، اور حکم دیا کہ دلی کے تمام لوگ دیوگر مین جا کر آباد ہو جائیں، اب دیوگر کا نام دولت آباد قرار پایا، اور دلی اور دولت آباد کے درمیان ہر منزل میں سرائیں بنائی گئین اور راستون کے کنارے سایہ دار درخت نصب کئے گئے، تاکہ مسافرون کو آمد و رفت مین آسانی ہو[1]،

اس کے بعد سلطان محمود بیگڑہ نے گجرات میں مسافرون کے آرام و آسایش کے لئے نہایت کثرت سے عمدہ عمدہ سرائیں بنوائین[2]، اسی صدی میں سکندر لودی نے جو ۸۹۴ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، ان تمام مقامات میں جہان ہندو اشنان یعنی غسل کرتے تھے، سرائے، مسجد، مدرسہ، اور بازار بنوائے ہیں[3]

سکندر لودی کے بعد شیر شاہ المتوفی ۹۵۲ھ نے دہلی سے لاہور تک دو دو کوس کے فاصلے پر سرائین بنوائیں اور حکم دیا کہ ان میں مسافرون کو کھانا دیا جائے[4]،

خافی خان لکھتا ہے،

"در سراہا طعام پختہ و خام برائے مسافرین و مترددین مسلمین و ہنود قرار دادہ جہت پختن آن غلامان و نوکران نگاہ داشتہ بود گویند، آتش پزان سراہائے ہند کہ بہ

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۱۳۶، [2] مرآت سکندری ص ۵، [3] فرشتہ جلد اول ص ۱۸۶، [4] ایضاً جلد دوم ص ۲۶۱

بھٹیارہ وبھٹیاری زبان زدہر دم ہند گردید، اندازاًطلاہا بہا ماندہ اند، ومقرر نمودن اسپان سرکار درسراہا ابرائے زود رسیدن اخبار مختلفہ روزگار بدربار بطریق ڈاک ازاختراع اوست؛[1]

تاریخ فرشتہ میں ہے کہ شیر شاہ نے بنگالہ اور سنار گاؤں سے آب سندھ تک جس کی درمیانی مسافت ڈیڑھ ہزار کوس کی ہے. کوس کوس بھر کے فاصلے پر سرائیں بنوائیں، اور ہر سرائے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے کھانے کا انتظام کیا، اور راستہ میں دو طرفہ پھل دار درخت مثلاً جامن اور کھرنی وغیرہ نصب کرائے، اسی طرح آگرہ سے منڈو تک جس کی مسافت تین سو کوس کی ہے، سرائیں اور مسجدیں بنوائیں اور راستہ میں میوہ دار درخت لگوائے،[2] اس حساب سے بنگال اور سندھ کے راستہ میں ڈیڑھ ہزار اور آگرہ سے منڈو تک تین سو سرائیں تعمیر ہوئیں،

شیر شاہ کی وفات کے بعد جب سلیم شاہ اس کا جانشین ہوا تو اس نے بنگال کے راستہ میں شیر شاہ کی بنوائی ہوئی، ہر دو سراؤں کے درمیان ایک اور سرائے کا اضافہ کیا، اور ہر سرائے میں شیر شاہ کی طرح مسافروں کے لئے کھانا مقرر کیا، چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے،

"از نیلاب تا بنگالہ درمیان سراہائے شیر شاہ یک سرائے دیگر آبادان ساخت و در ہر سرا طعام پختہ وخام بطریق شیر شاہ جہت مسافران خواہ فقیر خواہ غنی مقرر کردہ بود"[3]

خافی خان لکھتا ہے:۔

"مابین دو سرا از سراہائے شیر شاہ سرائے دیگر ساختہ بدستور بدر طعام پختہ وخام مقرر نمودہ بود،"[4]

اس کے بعد اکبر کا دور سلطنت شروع ہوا، تو اس نے جا بجا نہایت کثرت سے سرائیں بنوائیں،

۱؎ خافی خان حصہ اول ص ۱۰۲، ۲؎ فرشتہ جلد اول ص ۲۲۸، ۳؎ ایضاً جلد اول ص ۲۳۲، ۴؎ خافی خان حصہ اول ص ۱۰۶

ابو الفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے،

" و سراہا کہ سرمایۂ آسودگی جہان نوردان، آسایش جاے غریبان کم مایہ است جابجا ساختہ گردد[1]،

اکبر کے علاوہ اس کے عہد حکومت میں اس کے امرا و متوسلین میں بھی بعض لوگون نے سرائیں بنوائیں، چنانچہ امراے اکبری میں ایک شخص شیخ عبد الرحیم لکھنوی تھے، جنھون نے ایک عورت کو گھر میں ڈال لیا تھا، جب ان کا انتقال ہوگیا تو اس عورت نے بہت سے پُر تکلف مکانات، باغ، سرا، اور تالاب بنوائے، اور جس باغ میں شیخ موصوف دفن تھے، اس کے ارد گرد کے گاؤن کو لگان پر لیکر اُس باغ کی رونق بڑھاتی رہی، اور پنج ہزاری منصبدارون سے لے کر سپاہی تک جب اس راستہ سے گذرتے تھے، تو حسب حیثیت انکو پر تکلف دعوت دیتی تھی، صاحب مآثر الامرا، ان واقعات کو لکھ کر لکھتے ہیں،

شیوۂ مرضیہ را از دست نداد تا شصت سال کم و بیش احیاے نام شوہر خود نمود

ع نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد[2]،

امراے اکبری میں ایک اور شخص صادق محمد خان ہروی تھے، جنھون نے دھولپور میں جو آگرہ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے، تو طن اختیار کر لیا تھا، اور اس میں ایک سرائے ایک عمارت اور ایک مقبرہ بنوایا تھا، اور اس کے ارد گرد کے دیہات آباد کیے تھے[3]،

اکبر کے بعد جہانگیر کا دور حکومت آیا، تو اس نے اپنے جلوس کے ساتھ ہی جو احکام جاری کیے، ان میں تیسرا حکم یہ تھا کہ جو لوگ لاوارث مرجائیں، ان کے مال و جائداد سے سرکاری طور پر

---

[1] آئین اکبری جلد اول ص ۱۱۵۔ [2] مآثر الامرا، حصہ دوم ص ۶۰۵ و ۶۰۴ [3] ایضاً ص ۷۲۵،

مسجدیں اور سرائیں نبوائی جائیں، ٹوٹے ہوئے پلوں کی مرمت کیجائے، اور تالاب اور کنوئیں کھدوائے جائیں، انھی میں دوسرا حکم یہ تھا کہ جن راستوں میں چوری اور رہزنی واقع ہوتی ہو، اور وہ آبادی سے دور ہوں، وہاں اطراف و جوانب کے جاگیردار سرائے، مسجد اور کنوئیں تیار کرائیں تاکہ وہاں آبادی قائم ہو جائے، اور کچھ لوگ ان سراؤں میں جاکر آباد ہو جائیں۔[1]

جہانگیر کے زمانہ میں اس کے امرائے سلطنت نے بھی متعدد سرائیں نبوائیں، چنانچہ امرائے جہانگیری میں سعید خان چغتا جو پنجاب کے صوبہ دار تھے، خواجہ سراؤں کے بڑے شیدائی تھے، اور ایک ہزار سے زیادہ خواجہ سرا جمع کر رکھے تھے، جن میں دو خواجہ سرا یعنی اختیار خان اور اعتبار خان ان کے سب سے زیادہ معتمد تھے، اور ان میں اختیار خان نے پٹنہ اور بہار میں پل اور سرائے نبوائی تھی۔[2]

امرائے جہانگیری میں ایک اور بزرگ شیخ فرید مرتضیٰ خان بخاری تھے، جنھوں نے بہ کثرت سرائیں نبوائی تھیں، مآثر الامراء میں ہے،

رباط و سرا بسیار بنا گذاشتہ۔[3]

ایک اور امیر اللہ وردی خان تھے جن کو جہانگیر نے معتقد خانی کا خطاب دیا تھا، اور قراول بیگی کی خدمت پر مامور تھے، اور سیر و شکار میں ہمیشہ جہانگیر کے ساتھ رہتے تھے، انھوں نے دلی میں ایک باغ اور ایک سرائے نبوائی تھی۔[4]

شاہجہان کے زمانہ میں اکبر و جہانگیر کے دور حکومت کی طرح اس کے امرائے سلطنت نے بھی بہت سی سرائیں نبوائیں، چنانچہ اعظم خان نے اسلام آباد متھرا میں ایک سرائے نبوائی،[5]

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۵، [2] مآثر الامراء جلد دوم ص ۴۰۸ [3] ایضاً ص ۶۳۹، [4] ایضاً حصہ اول ص ۲۱۵ [5] ایضاً ص ۱۷۹،

خان دوران نصرت جنگ نے سرونج سے برہان پور تک دس دس کوس کے فاصلہ پر[۱] اور قلیچ خان تورانی نے لاہور سے ملتان تک بہ کثرت سرائیں بنوائیں[۲]،

ان تمام سرایوں کے باوجود ہندوستان کے بہت سے راستے سرایوں سے خالی تھے، بالخصوص اورنگ آباد سے اکبر آباد تک اور لاہور سے کابل تک کے راستے میں مسافروں کو سخت تکلیف ہوتی تھی، اس لئے جب عالمگیر کا دور حکومت آیا، تو اس نے عام حکم دیا کہ جن راستوں میں سرائے اور رباط نہ ہو، ان میں خاص سرکاری خزانے سے پختہ اور وسیع سرائیں جو بازار، مسجد، پختہ کنوئیں اور حمام پر مشتمل ہوں بنوائی جائیں، اور ہر مرحلے میں منزل گاہیں تیار کرائی جائیں، جہاں مسافر اتر کر اپنے مال واسباب کو حفاظت کے ساتھ رکھ سکیں، اسی کے ساتھ یہ بھی حکم ہوا کہ جو پرانی سرائیں مرمت طلب ہوں ان کی مرمت کرائی جائے[۳]

امرائے عالمگیری میں بھی بعض لوگوں نے سرائے بنوائی، چنانچہ ایرج خان نے ایلچپور کے قریب ایک سرائے بنوائی، اور ایک گانوں آباد کیا[۴]،

عالمگیر کے بعد بھی بہت سی سرائیں تعمیر ہوئیں چنانچہ شاہ عالم کے زمانہ میں ان کے وزیر خانخاناں نے چاہا کہ ہر شہر میں ان کے نام سے ایک سرا، ایک مسجد اور ایک خانقاہ تعمیر ہو، اور اس غرض سے جا بجا صوبہ داروں کے نام احکام بھی پہنچ گئے، اور ساتھ ساتھ روپیہ بھی روانہ کیا گیا، اور وسیع پیمانہ پر کام بھی شروع ہو گیا، لیکن ان کے انتقال سے اس کی تکمیل نہ ہو سکی[۵]

محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں امین الدین خان سنبھلی نے اپنے وطن سنبھل میں ایک نہایت عمدہ

۱؎ مآثر الامرا جلد اول ص ۸۰۵، ۲؎ ایضاً حصہ سوم ص ۹۱۳، ۳؎ عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۴، ۴؎ مآثر الامرا حصہ اول ص ۲۷۱۔

۵؎ خافی خان جلد دوم ص ۶۷۵، ۶۷۶

سرائے نبوائی[1] حسین علی خان نے بھی جو ساداتِ بارہہ مین تھے، اپنے وطن میں ایک سرائے نبوائی، خافی خان لکھتا ہے،

"در وطن بارہہ نیز بنائے سرا دیل و دیگر بنا ہائے عاقبت بخیر گذاشتہ[2]"

اسی عہد میں نواب آصف جاہ نے جو ۲۰ سال تک دکن کے چھ صوبون کے حاکم رہ چکے تھے، ایک کاروان سرا بنوائی، مآثر الامراء میں ہے،

"مسجد و کاروان سرا و دولت خانہ ویل تعمیر نمود[3]"

مہمان خانے سرائیں اکثر راستون میں قائم کی جاتی تھین، اور ان کے ساتھ ساتھ مسجد، بازار، کنوئیں اور حمام بھی تیار کرائے جاتے تھے، بلکہ بعض سرایون کے متصل دیہات بھی آباد کرائے جاتے تھے، تاکہ مسافرون کی ضروریات کے تمام سامان آسانی کے ساتھ میسر آسکین، لیکن مہمان خانے سرایون سے مختلف ہوتے تھے، اور وہ راستون کے بجائے شہرون میں قائم کئے جاتے تھے، اور ان میں مسافر مستقلاً قیام کر سکتے تھے، لیکن ہمارے مورخین نے ان کا ذکر مہمان خانے کے نام سے نہیں کیا ہے کیونکہ اس زمانہ میں یہ کام رباطون اور خانقاہون سے لیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ تاریخون میں سرایون کے ساتھ ساتھ جابجا رباط کا ذکر بھی آتا ہے، مثلاً

"رباط و سرا بسیار بنا گذاشتہ[4]"

اس قسم کی ۱۲۰ خانقاہیں فیروز شاہ نے دہلی اور فیروز آباد میں اس غرض سے قائم کی تھیں کہ جو مسافر یہان آئیں، وہ ہر خانقاہ میں تین روز تک جو مہمانی کی شرعی مدت ہے، قیام کر سکیں، اور اس طرح ۱۲۰ خانقاہون میں تین تین روز قیام کر کے سال بھر کی پوری مدت بسر کر سکیں، کیونکہ سال کے تین سو ساٹھ دن ہوتے ہیں، اور وہ ۱۲۰ خانقاہون کے سہ روزہ

---

[1] مآثر الامراء ج ۱، ص ۳۵۸ [2] بقیہ خافی خان ص ۹۴۲ [3] مآثر الامرا، حصہ سوم صفحہ ۸۴۲ [4] مآثر الامراء جلد دوم ص ۶۳۹،

قیام سے پورے ہو جاتے ہیں،

ان تمام مہمان خانوں کے متولی وعہدہ دار سنی ہوتے تھے، اور ان کے مصارف سرکاری خزانہ سے ادا ہوتے تھے، تاریخ فیروز شاہی میں ہے،

"وخانقاہا در بلاد براے صادر و وارد بنا کردہ و در شہر دہلی و فیروز آباد صد و بست خانقاہ براے آسایش بندگان الٰہ بر آوردہ بدین نیت کہ چون مسافران از اطراف واکناف جہان درین مکان بیایند، در ہر خانقاہ کسان سہ روز مہمان باشند، و در ہر خانقاہ سلطان فیروز شاہ متولیان سنی وعہدہ داران سنی تعین کردہ، خرچ خانقاہا نقد از خزانہ دیانیدہ[۱]"

معلوم ہوتا ہے کہ مہمانوں کے مستقل قیام سے بعض اوقات یہ خانقاہیں مستقل آبادی کی صورت اختیار کر لیتی تھیں، اگرچہ تاریخوں میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے تاہم ہمارے ضلع اعظم گڈھ میں ایک موضع خانقاہ کے نام سے موسوم ہے، اور غالباً وہ اسی طرح آباد ہوا ہے،

لنگر خانے | فرمانروایانِ اسلام نے ہندوستان میں فقیروں اور محتاجوں کی اعانت و امداد کے لئے مالوہ میں لنگر خانے قائم کئے تھے، جہاں سے ان کو خام غلہ یا پکا پکایا کھانا ملتا تھا، چنانچہ سلطان محمود خلجی نے بہت سے لنگر خانے قائم کئے تھے، جن سے فقراء ومساکین کو غلہ اور کھانا ملتا تھا[۲]،

علاء الدین سید حسین شریف مکی المتوفی ۹۲۷ھ نے بنگال میں بکثرت لنگر خانے قائم کئے تھے، اور بعض لنگر خانوں پر متعدد گاؤں وقف کیے تھے، ریاض السلاطین میں ہے،

"ومساجد ولنگر خانہ در ہر سرکار جابجا تعمیر و مقرر ساختہ، فقراء و دولت گزینان را املاک

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی حصہ دوم ص ۳۰۲ [۲] فرشتہ حصہ دوم ص ۴۴۴ در برہانپور لنگر طعام جاری داشت ص ۳۷ و ۱۰۰،

بسیار عنایت فرمود و بجہت خرچ لنگر خانہ قدوۃ المشائخ شیخ نور قطب العالم قدس اللہ سرہ، مواضع متعددہ تعین فرمود و آثار خیراو درین ملک مشہور افواہ خواص و عام است[1]"

اس کے بعد جہانگیر نے تمام بڑے بڑے شہرون مثلاً احمد آباد، الہ آباد، لاہور، آگرہ اور دہلی وغیرہ بلکہ تمام ممالکِ محروسہ میں فقراء کے لئے غلہ خانے قائم کئے[2] جن سے فقیرون، محتاجون، اور مسافرون کو غلہ اور کھانا ملتا تھا،

یہ لنگر خانے تو مستقل تھے، لیکن قحط کے زمانہ میں تمام شہرون بلکہ قصبون مین ان کے علاوہ عارضی لنگر خانے قائم کر دیئے جاتے تھے، اور ان سے قحط زدہ لوگون کو بڑی مدد ملتی تھی، چنانچہ ایک بار سلطان بہادر گجراتی کے زمانہ میں جو ۹۳۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا، گجرات مین سخت قحط رونما ہوا، تو اس نے فقراء و مساکین کی امداد و اعانت کے لئے ہر شہر میں کئی کئی لنگر خانے قائم کئے، اور اس کے ساتھ حکم دیا کہ جو شخص اس کی سواری کے وقت سوال کرے اس کو ایک مظفری دیجائے، اور اس غرض سے اس زمانہ میں چوگان بازی کے لئے دو بار سوار ہوتا تھا، تاکہ مستحقین کو اس فیاضی سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملے، فرشتہ اس واقعہ کو لکھ کر لکھتا ہے،

"و در رفیہ احوال رعایا کوشش می نمود، تا دران مدت در بلاد گجرات رونق و رواج تازہ پدید آمد[3]"

ایک بار شاہجہان کے زمانہ میں دکن اور گجرات میں سخت قحط پڑا، تو اس نے برہانپور، احمد آباد اور سورت میں بکثرت لنگر خانے جاری کئے، اور اس کے ساتھ یہ حکم دیا کہ خاص

---

[1] ریاض السلاطین ص ۱۳۵، ۱۳۶، [2] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۱۰۰، [3] فرشتہ حصہ دوم ص ۲۱۵،

برہانپور میں جہان ان کا قیام تھا، ہر دوشنبہ کو (یہ شاہجہان کے جلوس کا دن تھا، اور اس وجہ سے ایام متبرکہ میں شمار جاتا تھا) پانچ ہزار روپیہ مستحقین کو دیا جائے، چنانچہ اس حساب سے ۲۰ ہزار روپئے ماہوار کے حساب سے مستحقین کو پانچ مہینہ میں ایک لاکھ روپئے تقسیم کئے گئے، چونکہ احمد آباد میں قحط کا اثر اور مقامات سے زیادہ تھا، اس لئے اس صوبہ کے ناظمون کو حکم ہوا کہ قحط زدہ لوگون کو مزید پچاس ہزار روپئے بھی دیئے جائیں، اس کے علاوہ دو سال کے لئے ستر لاکھ روپئے مالگذاری میں سے معاف کر دیئے،[1]

اس زمانہ میں بعض امراء نے بھی شاہجہان کی تقلید میں لنگر خانہ جاری کیا، چنانچہ صاحب مآثر الامراء میر جملہ کے حال میں لکھتے ہیں،

"دران ہنگام میر جملہ ثانی، بسخاوت بر آوردہ، شب در روز در برہانپور لنگر طعام جاری داشت[2]"

ایک بار کشمیر میں سخت سیلاب آیا، اور تمام فصل برباد ہوگئی، بلکہ غلہ کے پرانے ذخیرے بھی ضائع ہوگئے، ۳۰ ہزار قحط زدہ لوگ دار السلطنت میں آکر فریادی ہوئے، تو شاہجہان نے ان کو ایک لاکھ روپئے دیئے، اور حکم دیا کہ ان غریبون کے لئے دو تین جگہ لنگر خانے قائم کئے جائیں، ان کے علاوہ مزید ۳۰ ہزار روپئے کشمیر کے مستحقین کو عطا فرمائے، اور تربیت خان کو ان کی ہمدردی و نگرانی کے لئے مقرر کیا، لیکن چونکہ ان سے یہ کام بن نہ آیا، اس لئے ظفر خان کو کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا، اور ۲۰ ہزار روپئے اور مستحقین کشمیر کو دیئے،[3] اس کے بعد ظفر خان کی یادداشت سے معلوم ہوا کہ اس ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی امداد سے قحط کا اثر بالکل زائل ہوگیا، اور قحط کے دن عید اور نوروز کے دن سے بدل گئے، لیکن مویشیون کے خریدنے اور تخم ریزی

---

[1] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۳۶۳، ۳۶۴، [2] مآثر الامراء حصہ سوم ص ۴۱۷،
[3] خافی خان حصہ اول ج اول ص ۵۸۷،

کے لئے اگر ۳۰ ہزار روپئے اور دلوائے جائیں، تو ویران شدہ مواضع بالکل آباد ہو جائیں، شاہجہان نے فوراً یہ درخواست منظور کرلی،[1]

ایک بار پنجاب میں اسقدر سخت قحط پڑا کہ لوگون نے اپنے لڑکون کو فروخت کر دیا، بلکہ ذبح کر کے کھا گئے، شاہجہان کو اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ دس مقامات پر دس لنگر خانے جاری کئے جائیں، اور ہر لنگر خانہ پر روزانہ دو سو روپیہ صرف کیا جائے، چنانچہ دو ہزار روپیہ روزانہ کے صرف سے یہ لنگر خانے جاری ہو گئے، اور پچاس ہزار روپئے نادار لوگون کو تقسیم کئے گئے، اور حکم ہوا کہ جس شخص نے اپنے لڑکے کو فروخت کیا ہو، اگر وہ اس کا پتہ چلا سکے تو خزانہ شاہی سے اس کی قیمت واپس کر دی جائے، اور لڑکا اس کے ماں باپ کے حوالہ کر دیا جائے،[2]

محتاجون کی امداد کے مختلف طریقے قحط کے ساتھ جنگ وجدل، فتنہ و فساد اور فوجون کی آمد و رفت کا جو سلسلہ جاری رہتا تھا، اس کی وجہ سے بعض اوقات سخت گرانی پیدا ہو جاتی تھی، اور لوگ سخت مفلوک الحال ہو جاتے تھے، ایک بار عالمگیر کے عہد حکومت میں ان تمام اسباب نے لوگون کو اس قدر مفلوک الحال بنا دیا، کہ اکثر پرگنے ویران ہو گئے، اور دار السلطنت میں محتاجون کا اس قدر ہجوم ہوا کہ راستے بند ہو گئے، عالمگیر کو اس کا حال معلوم ہوا تو حکم دیا کہ علاوہ مستقل غلہ خانون کے شہر میں دس لنگر خانے اور جاری کئے جائیں، اور تمام امرا بھی حسب دستور لنگر خانے جاری کریں، ان کے علاوہ دار السلطنت کے اطراف اور رہگذرون کے آس پاس ۱۲ غلہ خانے قائم کئے جائیں، اس کے ساتھ غلون کی فراہمی کے لئے محصول کی معافی کے احکام صادر کئے،[3]

عالمگیر کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، چنانچہ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں امیر الامرا سید حسین علی خان المتوفی ۱۱۳۲ھ نے بہت سے غلہ خانے قائم کئے، چنانچہ صاحب مآثر الامرا لکھتے

[1] خافی خان حصہ اول ص ۵۹۵ [2] ایضاً ص ۶۴۰ [3] خافی خان حصہ دوم ص ۱۲۴، ۱۲۵،

تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

"در ہمت و مروت یکتا و فور طعام و کثرت اطعام سرکار او مشہور است اجرائے بلغور خانہا از غلہ خام وپختہ و احداث مجلس یازدہم و دوازدہم ہر ماہ در بلاد عظیمہ دکن نمودہ کہ تا حال جاری است[1]"

لنگر خانوں کے علاوہ فرمانروایانِ اسلام نے اہلِ حاجت کی اعانت و امداد کے سیکڑوں طریقے اختیار کر رکھے تھے، مثلاً سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں جو ۶۶۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا، ملک الامرا فخر الدین کوتوال ایک نہایت فیاض اور عالی حوصلہ امیر تھے، ان کا دستور یہ تھا کہ جو لباس ایک بار زیب تن کر لیتے تھے، اس کو دوبارہ نہیں پہنتے تھے بلکہ صدقہ و خیرات کر دیتے تھے، اسی طرح بستر، پلنگ اور فرش و فروش وغیرہ ہمیشہ نئے استعمال کرتے تھے، اور جو سرمایہ اس طرح جمع ہوتا تھا اس کو یتیموں اور مستحق لوگوں کی لڑکیوں کی شادی کے مصارف میں صرف کرتے تھے، تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ اس طرح وہ ہر سال ایک ہزار نادار لڑکیوں کی شادی کا سامان کرتے تھے[2]۔

اس کے بعد فیروز شاہ تغلق نے نادار لڑکیوں کی نکاح کے لئے ایک مستقل محکمہ قائم کیا، اور اس میں متدین اور ایماندار عہدہ دار مقرر کئے، اور حکم دیا کہ جن نادار اشخاص کے یہاں بالغ لڑکیاں ہوں وہ اس محکمہ میں آکر اس کی اطلاع دیں، اور اس محکمہ کے عہدہ دار اس کی پوری تحقیق کر کے ہر شخص کو اس کی حالت کے مناسب مالی امداد دیں،

اس مالی امداد کے تین درجے مقرر کئے گئے تھے۔

درجۂ اول   پچاس تنکہ نقرئی،

---

[1] مآثر الامرا جلد اول ص ۳۰۳، [2] تاریخ فیروز شاہی جلد اول ص ۱۱۷،

درجہ دوم تیس تنکہ نقرئی،

درجہ سوم پچیس تنکہ نقرئی،

چنانچہ اس محکمہ کے قائم ہو جانے کے بعد ہزارون محتاج مسلمانون اور بیوہ عورتون نے اپنی اپنی لڑکیون کے نام درج رجسٹر کرائے، اور مالی امداد حاصل کی[1]

فیروز شاہ کے بعد دور اکبری میں شیخ فرید مرتضیٰ خان بخاری نے گجرات میں سادات کے تمام ذکور و اناث کی فہرست مرتب کی، اور اُن کے لڑکون کی شادی کا سامان اپنی سرکار سے کیا، یہان تک کہ حاملہ عورتون کو روپیہ دیا کہ وہ اس کو امانۃً رکھیں، اور جب بچے پیدا ہون تو ان کی شادی میں صرف کرین[2]،

شاہجہان کا معمول یہ تھا کہ روزانہ قیلولہ اور نماز ظہر سے فارغ ہونے کے بعد نقد وجنس اراضی مزروعہ اور تقرر وظیفہ کے ذریعہ سے بے شوہر اور بوڑھی عورتون کی حاجت روائی کرتا تھا، کنواری اور بیوہ عورتین جن کے ساتھ غربت و افلاس کی وجہ سے کوئی شخص نکاح کرنا پسند نہیں کرتا تھا، ستی النسا خانم کے ذریعہ سے روزانہ اس کی خدمت میں پیش ہوتی تھین، اور وہ انکے نکاح کا سامان کرتا تھا، اور زیور اور لباس وغیرہ سب کچھ دیتا تھا، اور اکثر اوقات جو لوگ اس خدمت پر مامور تھے، وہ خود شاہجہان کے حکم سے ان کے اقران و امثال سے ان کا نکاح کرا دیتے تھے، اور اس کار خیر میں روزانہ کافی روپیہ صرف ہوتا تھا، چنانچہ محمد صالح کنبوہ عمل صالح میں لکھتا ہے،

"چنانچہ مبلغہا ے گرانمند، ہر روزہ باین رہ گذر کہ بہین طریق خیرات و مبرات است صرف می شود[3]"

---

[1] تاریخ فیروز شاہی حصہ دوم ص ۳۴۹، [2] ماثر الامرا جلد دوم ص ۶۳۹، [3] عمل صالح جلد اول ص ۹ ۔ ۲۴۳،

نادار لڑکیوں کے علاوہ، بوڑھے، یتیم، اندھے، اپاہج، بیوہ عورتیں، اور جسمانی عیوب رکھنے والے لوگ اعانت و امداد کے محتاج ہوتے ہیں، اور فرمانروایان اسلام کا فیض عام ان تمام لوگوں کو شامل تھا، تاریخ فیروز شاہی میں فیروز شاہ تغلق کی نسبت لکھا ہے،

"وصدقات خداوند عالم بر پیران و زالان و بیوگان و یتیمان و کوران و معیوبان و جائے ماندگان علی الدوام والاستمرار میرسید[1]"

فیروز شاہ کے بعد محمود شاہ بہمنی نے گلبرگہ، بیدر، قندھار، ایلچپور، دولت آباد، جیول دابل، اور دوسرے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں یتیموں کی تعلیم کا خاص انتظام کیا، اور اندھوں کے مشاہرے مقرر کئے، اور اس میں اس قدر فیاضی سے کام لیا کہ لوگ قصداً آنکھیں پھوڑ کر اندھے بنتے تھے، اور ماہوار تنخواہ لیتے تھے[2]،

سلطان محمود کے بعد سکندر لودی نے فقراء و مستحقین کی امداد و اعانت کا خاص نظام قائم کیا، اور حکم دیا کہ سال میں دوبار تمام ملک کے فقراء و مستحقین کے نام کی فہرست اسکی خدمت میں پیش کی جائے، چنانچہ جب یہ فہرست پیش کی جاتی تھی، تو ہر شخص کی حالت و حیثیت کے مطابق اس کے پاس ششماہی کی رقم روانہ کر دیتا تھا، اس کے ساتھ جاڑوں میں ان کو شال اور کپڑے دیتا تھا، ہفتے میں جمعہ کے روز فقرائے شہر کو جمعگی کے نام سے بھی ایک رقم مرحمت کرتا تھا، اور روزانہ مختلف مقامات پر خام غلہ اور پکا پکایا کھانا تیار کرا کے شہر میں تقسیم کرواتا تھا، اور کوئی سال ایسا نہیں گذرتا تھا کہ فتوحات اور کامیابی کے بہانہ سے فقیروں کو چند بار معقول رقمیں نہ دیتا ہو، ذاتی فیاضیوں کے علاوہ اہل دولت اور ارباب جاہ میں سے جو لوگ فقیروں اور مسکینوں کے لئے وظائف مقرر کرتے تھے، ان کو نہایت معزز

---

[1] فیروز شاہی جلد اوّل ص ۵۷۱، [2] فرشتہ جلد اوّل ص ۳۰۲

سمجھتا تھا، اور اس اعزاز کے حاصل کرنے کے لئے بہت سے لوگ مستحقین کو شریعت کے مطابق مال و دولت دیتے تھے[۵۱]

سکندر لودی کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابراہیم لودی اس کا جانشین ہوا، اور اس معاملے میں اس نے بھی اپنے باپ کی روش کو قائم رکھا، چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے،

"ونیز بر فقراء و مساکین ابواب خیرات و مبرات کشادہ ظائف مقرر فرمودہ ادرارات ائمہ را زیادہ کردہ بگوشہ نشینان و متوکلان فتوح و نذور فرستادہ[۵۲]"

سلطان ابراہیم لودی کے بعد سلطان محمود خان ثانی نے جو ۹۴۳ھ میں گجرات کے تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، فقیروں اور محتاجوں کی خبرگیری کے لئے بہت سے مکانات بنوائے اور وہاں اس غرض سے ملازم مقرر کئے، کہ فقیروں اور محتاجوں کے رنج و راحت سے باخبر رہ کر ان کی ضروریات کے سامان مہیا رکھیں، اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ جو غذا اس کو پسند آتی تھی، اس کی نسبت پوچھتا تھا، کہ فقیروں کو بھی اس قسم کی غذائیں میسر آتی ہیں، حاضرین جواب دیتے تھے، کہ بھلا ان غریبوں کو اس کا مقدور کہاں، اس کے بعد حکم دیتا تھا، کہ اس قسم کی غذا نہایت عمدہ طریقہ پر پکوا کر فقراء کے پاس بھیجی جائے جو نیک لوگ مسجدوں اور مدرسوں میں قیام رکھتے تھے، ان کو جاڑوں میں نہایت عمدہ قبائیں، اور لحاف انعام دیتا تھا، چونکہ بعض قلاش لوگ ان کو فروخت کر ڈالتے تھے، اس لئے حکم دیا کہ ایسے لحاف بنوائے جائیں، جن کو ایک جماعت اوڑھ سکے، اور سب کے سب اس کے فروخت کرنے پر متفق نہ ہوں، راتوں کو تمام گلیوں اور بازاروں میں بہت سی لکڑیاں جلواتا تھا تاکہ جاڑوں میں بے سر و سامان لوگ آگ تاپ سکیں، معمول تھا کہ تمام موسمی میوے پہلے فقیروں

[۵۱] فرشتہ جلد اول ص ۱۸۶، [۵۲] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۸۹،

کے پاس بھیجے جاتے تھے، اس کے بعد شاہی محل میں آتے تھے[1]

سلطان محمود خان ثانی کے بعد امرائے اکبری میں شیخ فرید بخاری نے اس معاملے میں نہایت فیاضی سے کام لیا، اور اپنا یہ خاص معمول کر لیا کہ جب دربار کو جاتے تھے تو راستے میں فقراء کو قبا کمل چادر اور جوتے تقسیم کرتے جاتے تھے[2]

اس کے بعد جہانگیر نے موسم سرما میں فقرائے کشمیر کے لباس کا خاص انتظام کیا، چنانچہ جب اس کو اطلاع دی گئی کہ فقرائے کشمیر جاڑوں کے موسم میں سخت تکلیف برداشت کرتے ہیں، تو اس نے حکم دیا کہ صوبہ کشمیر کا ایک گاؤں جس کی مالگذاری تین چار ہزار روپیہ ہے ملا طالب اصفہانی کے حوالہ کیا جائے تاکہ اس سے فقراء کے لباس اور مسجدوں میں پانی گرم کرنے کا انتظام کریں[3]،

عالمگیر کا دور حکومت آیا تو اس کے سامنے سلطان محمود کی نظیر تھی اسلئے اس نے عام حکم دیا کہ جاڑوں کے موسم میں ہر سال ڈیڑھ ہزار قبا اور ڈیڑھ ہزار کمبل صوبہ احمد آباد کے فقراء و مساکین کو بطور خیرات کے دیتے جائیں، اور اس پر تین ہزار روپیہ صرف کیا جائے، اس حساب سے فی قبا ڈیڑھ روپیہ اور فی کمل آٹھ آنے پڑتے تھے[4]، جس سے ہم اس زمانے میں کپڑوں کی ارزانی کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں، عالمگیر ہی کے زمانہ میں نواب منعم خان خانان المتوفی ۱۰۷۳ھ کے بعد نواب امیر الامراء شائستہ خان ممالک بنگالہ کے صوبہ دار مقرر ہوئے، اور فقراء و غربا کی بیواؤں کی خاص طور پر پرورش کی اور دیہات اور زمینیں معافی میں دے کر ان کو صاحب جائداد بنا دیا، ریاض السلاطین میں ہے:-

---

[1] مرآت احمدی جلد اوّل ص ۹۱ [2] مآثر الامراء حصہ دوم ص ۷۳۹ [3] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۳۵۲، [4] مرآت احمدی جلد اوّل ص ۳۵۶،

"بیوہ ہائے شمر فار و نجبار دبے مایگان را ز دیہات و زمینہا معاف کردہ مالک املاک ساختم[۱]،

سلاطین تیموریہ کے یہاں فقراء و مستحقین کی اعانت کی ایک مستقل صورت یہ تھی کہ سال میں دو بار یعنی شمسی اور قمری دونوں سنوں کے حساب سے اپنی سالگرہ کا جشن مناتے تھے، اور اس موقع پر زر و گوہر اور دوسری قیمتی اشیاء سے اپنا وزن کراتے تھے، اور ان تمام چیزوں کو خیرات کر دیتے تھے، جہانگیر تزک میں لکھتا ہے،

"دوم مرتبہ خود را بہ طلا و نقرہ و سائر فلزات و از قسم ابریشم و پارچہ و از اقسام حبوبات وغیرہ وزن می کنم یک مرتبہ در سر سال شمسی و یک مرتبہ در سر سال قمری و زر این وزن را بہ تحویلداران علحدہ می سپارم کہ بہ فقراء و ارباب احتیاج رسانند[۲]"

یہ طریقہ اکبر کے زمانہ سے شروع ہوا، اور عالمگیر کے زمانہ تک قایم رہا، چنانچہ اس دور کے تمام مورخین اس جشن کا ذکر مزے لے کر کرتے ہیں، عبدالحمید لاہوری بادشاہنامہ میں لکھتا ہے:-

"چون صدقات در دفع مضار بدنی و جانی و جلب منافع روحانی و جسمانی باتفاق اصحاب ملل و نحل و اطباق ارباب دین و دول، نتایج و آثار دارد، حضرت عرش آشیانی آئین زرین وزن اختیار نمودہ ذات مقدس خویشتن را دو مرتبہ یکے بعد از انقضائے سال شمسی و دیگرے، پس از انتہائے سنہ قمری وزن می فرمودند، لیکن در وزن شمسی دوازدہ بار نخستین بار بہ طلا و بازد بار دیگر اشیاء، و در وزن قمری ہشت بار اولیں بار بنقرہ و ہفت بار باشیائے دیگر و وزن فرزندان کامگار یکبار باعتبار سال شمسی بوقوع می آید و وجوہ وزن در مصارف تصدق صرف می شد و حضرت جنت مکانی پیروی حضرت عرش آشیانی نمودہ ہر سالے[۳] ایک

---

[۱] ریاض السلاطین ص ۲۲۲ [۲] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۱۳۰،

منفعت وسم رالعمل می آوردند از آنجا کہ این کار یمنت آثار سبب روائی حاجات نیازمندان است، حضرت جہانبانی دو مرتبہ شخص اکمل خود در اوزان می فرمایند دار فرونی جود گستری در ہر مرتبہ وزن طلا و نقرہ مقرر نمودہ اند، در وزن شمسی نخستین بار بطلا و دوم بار بہ نقرہ و۵ بار باجناس دیگر و در وزن قمری اولین بار بطلا و دیگر بار بہ نقرہ و شش بار بہ دیگر اجناس و پادشاہ زادہ ہاے سعادت پرور را یک مرتبہ بری سنجند[1]

متفرق صدقات وخیرات کی اس قدر کثرت تھی کہ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب لکھنی پڑی گی، اس لئے ہم صرف تزک جہانگیری سے چند واقعات نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جہانگیر لکھتا ہے:۔

"میں نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ راتون کو ارباب استحقاق اور درویش میرے سامنے پیش کئے جائیں، تاکہ ہر ایک کی حالت کو دیکھ کر زمین، روپیہ، نقد، پوشاک انکو مرحمت کرون[2]"

"چونکہ میں نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے، کہ جو درویش اور ارباب حاجت میری درگاہ میں، جمع ہون ان کو دو پہر رات گذر جانے کے بعد میرے سامنے پیش کریں، اس لئے میں نے اس سال اسی طریقہ پر اپنے سامنے اور اپنے ہاتھ سے ۵۵ ہزار روپیہ ایک لاکھ نوے ہزار بیگہ زمین چودہ گاؤن، ۲۷ ہل، اور ۲ ہزار کھلیان دھان درویشون کو دیئے[3]"

یہ فیاضیان صرف مسلمانون کے ساتھ مخصوص نہ تھین، بلکہ ان سے ہندو بھی یکسان طور پر متمتع ہوتے تھے، چنانچہ جہانگیر ایک موقع پر لکھتا ہے،

"میں نے شیخ فضل اللہ اور راجہ دھیر دھر کو روپئے دیئے، کہ راستہ میں فقیر واہل

---

[1] بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری جلد اول ص ۲۴۳ [2] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۱۲۵ [3] " صفحہ ۱۳۵،

برہمنوں کو دیں[1]

دوسرے موقع پر لکھتا ہے،

"ہر دوار ہندوؤں کی ایک مسلّم تیرت گاہ ہے، اور بہت سے برہمن اور تجرد پسند لوگ اس جگہ عزلت گزین ہو کر اپنے دین کے اصول کے مطابق خدا پرستی کرتے ہیں، میں نے ہر ایک کو ان کے استحقاق کے موافق نقد وجنس بطور صدقہ کے دیئے"[2]

شاہجہان کے زمانہ میں صدقات و خیرات کی مذہبی حیثیت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے، چنانچہ محمد صالح کنبوہ لکھتا ہے،

"ضعیفوں، اپاہجوں، تیموں، بوڑھی عورتوں، بوڑھے سپاہیوں کو، روزانہ جو کچھ ملتا ہے اور خزانہ، عامرہ سے جو کچھ تمام دنیا کے حاجت مندوں کو بطور انعام کے دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ میں ازروئے تخمین وقیاس کے کہہ سکتا ہوں کہ ولایت ہندوستان کا عشر جو ایران اور توران کے خراج کے برابر ہے، علما، صلحا، ارباب عمائم، اصحاب سعادت اور ائمہ کی جاگیر و وظائف کے لئے مقرر ہے، اس کے علاوہ اس ماہ مبارک رمضان میں موسوی خان صدر الصدور کو ازسر نو تاکیدی حکم دیا گیا، کہ ہمیشہ فقرا، مساکین اور ارباب استحقاق کو خدمت میں پیش کرتے رہیں کہ اگر کوئی پریشان روزگار بدقسمتی سے ہماری فیاضی سے محروم رہ گیا ہو، تو اس کی حالت کے مطابق نقد روزیانہ سالیانہ گانوں اور کھیت بطور مدد معاش کے دیا جائے، اس مہینہ میں خصوصًا اور ہر سال کے رمضان میں

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۸، [2] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۳۴۳

علاوہ اجبوات کو پریشاں حال حاجت مندون کو باری باری درگاہ والا میں حاضر کرکے ۳۰ ہزار روپیہ عطا کرین، اسی طرح مولود مسعود کے زمانہ میں ۱۲ ہزار روپیے شب برات اور نیز شب معراج میں بھی اسی قدر روپیہ ارباب استحقاق پر خیرات کیا جائے[1]،

سلاطین کے ساتھ اگر امرا، واعیان دولت کی فیاضیون کے واقعات لکھے جائیں تو یہ داستان اور طویل ہو جائے گی، اس لئے ہم صرف ایک واقعہ کے لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں، صاحب مآثر الامراء شیخ فرید بخاری کے تذکرے میں لکھتے ہیں،

"شجاعت را باسخاوت جمع نمودہ بخشش عام او در فیض بر روے خلق باز کردہ ہر کہ باو رسید سے چہرۂ نامی در آئینہ خیال ندیدے تا رسیدن در بار قبا و کمل و چادر را دیا افزاز بدرویشان رہ گذرے قسمت می شد، و ریزگی اشرفی و روپیہ بدست خود می داد، روزے در دیسے ہفت مرتبہ از شیخ گرفت نوبت ہشتم آہستہ بد گفت کہ انچہ ہفت مرتبہ گرفتہ مختفی دارتا درویشان از تو نتانند باہل خانقاہ وار باب توکل و احتیاج و بیوہ زنان در یومیہ تا سالانہ مقرر داشتہ در حضور و غیبت او بند و پروانگی، مجد دمی رسید در جاگیرش بیشتر مدد معاش بود و اطفال آنہا کہ در نوکری او مردہ بودند) در خور ہر کدام درماہہ مقرر کردہ مثل فرزندان در کنار و بغل شیخ باز می کردند و معلم نگاہ داشتہ تربیت می نمود، اما بیاد فروش و کلاونت نمی داد[2]،

نہر | رفاہ عام کی جن چیزون کا ذکر اوپر کیا گیا، اگرچہ ان کا فیض نہایت وسیع و عام تھا،

---

[1] عمل صالح جلد اول ص ۲۰۸ و ۲۰۹، [2] مآثر الامراء حصہ دوم ص ۶۳۹

تاہم خاص خاص طبقات تک محدود تھا، شفاخانون سے صرف مریض فائدہ اٹھا سکتے تھے، سرایوں اور مہمان خانون سے صرف مسافروں کو فائدہ پہنچتا تھا، اور لنگر خانون سے صرف فقرار و مساکین متمتع ہوتے تھے، لیکن نہر، تالاب، کنوئیں، اور پل وغیرہ کسی خاص طبقے تک محدود نہین ہے، بلکہ اس سے مریض و صحیح اور غریب امیر سب یکسان طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور فرمانروایانِ اسلام نے ہندوستان میں اس قسم کے بہ کثرت آثار خیر اپنی یادگار چھوڑے ہیں،

ان چیزون میں ہندوستان جیسے زرعی ملک کے لئے نہرین سب سے زیادہ ضروری ہیں، اور غالبًا سب سے پہلے فیروز شاہ تغلق نے متعدد نہرین جاری کین، چنانچہ اس نے ۷۵۵ھ میں جب دلّی کے پاس دریائے جمنا کے کنارے فیروزآباد کو آباد کیا، تو تلج سے جھجر تک جس کی مسافت ۴۰ کوس ہے، ایک بڑی نہر نکالی، اور ۷۵۶ھ میں دریائے جمنا سے ایک نہر نکال کر اس کے ساتھ سات نہرین اور ملائیں، اور ان کو ہانسی تک لے گیا، اور اس کے بعد حصار فیروزہ کے نام سے ایک حصار قائم کیا، اور اس حصار کے نیچے محل کے پاس ایک تالاب کھدوایا، اور اس کو نہر کے پانی سے پر کیا، آب کھگر سے ایک اور نہر نکالی اور اس کو حصار سرستی سے آگے بڑھا کر نہر سر کھترہ تک پہنچایا، اور اس جگہ فیروزآباد کے نام سے ایک شہر آباد کیا، اور جمنا سے ایک نہر نکال کر اس شہر کے تالاب میں ملایا،[1]

اس کے بعد سلطان زین العابدین نے کشمیر میں نہایت کثرت سے زرعی نہرین جاری کین، چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے،

" اکثر اوقات او بہ تعمیر ولایات و تکثیر زراعات و برآوردن آبہا بجاے رود مصروف می گشت[2]، در کابل و دیگران آبہا ز دور آوردہ جو یہا میکند، و بہانی بست

---

[1] فرشتہ جلد ۱ ص ۱۴۶، [2] ایضاً جلد ۲ ص ۳۴۲،

وزراعتہا بسیاری فرمود، ودر مملکت کشمیر ہیچ زمینے بے آب وزراعت نماند۔[1]

اس کے بعد تیموری دور میں ایرانی طرز کی نہرون کا رواج ہوا اور اکبر کے دورِ حکومت میں اس کی ابتدا ہوئی، ایران میں نہریں اور چشمے باغون اور گھرون میں جاری رہتے ہیں، اور لوگ ان سے بآسانی فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن ہندوستان میں اس قسم کی نہروں اور چشمون کا وجود نہ تھا، چنانچہ بابر تزک میں لکھتا ہے:-

"درباغ وعمارتہا آب روان نے"

یہان کے لوگون کا دارومدار صرف کنوون، تالابون اور ندیون کے پانی پر تھا جن کی نہایت کثرت تھی، اور بعض شہرون اور دیہاتون کے متصل واقع تھیں، لیکن ان سے نہریں اور چشمے نکال کر گھرون، اور باغوں میں نہیں لائے جاتے تھے، بلکہ لوگ کنوون اور تالابون کی طرح ندیون سے پانی نکال کر اپنے گھرون میں لاتے تھے، اور اس کو استعمال کرتے تھے، لیکن دورِ تیموری مین خانخانان نے بالکل ایرانی طرز پر برہانپور میں اس قسم کی ایک نہر نکالی اور لعل باغ سے مسجد جامع تک جو برہانپور کے میدان کے پہلو یعنی وسط شہر میں واقع ہے، اس کو پختہ کرایا، اور مسجد میں ایک حوض اور ایک عمارت تیار کرائی، کہ اس میں اس نہر کا پانی جمع رہے، اور لوگ آسانی کے ساتھ وضو کر سکین، اور وہان سے اہلِ شہر اپنے مکانون میں پانی لے جا سکیں، اور وہ اہلِ شہر کے اکثر مکانون میں جاری ہو سکے،

مولانا فرید الدین منجم دہلوی نے اس نہر کی تاریخ بنا یہ نکالی ہے،

---

[1] ایضاً ص ۳۴۳

سپہ سالارِ گیتی خانخانان | ستونِ بارگاہِ شہریاری
کفِ رادش پلِ ردِ سوال است | نم دستش ز جود ابرِ بہاری
روان کردہ بشہر اندر قناتے | کز و سیراب شد سوقی و داری
در ایامِ جہانگیرِ جہان بخش | کہ از فرقش بناز دتاج داری
گرفت انجام کار چشمۂ خیر | مبادا انجام جریانش زباری
بود چون دولت نامیش لازال | بود تا دور ہائے روزگاری
دلِ دانا ز تاریخش بہ پرسید | جوابش داد ہاتف خیر جاری[1]
۱۰۲۴ھ

اس کے بعد ۱۰۴۹ھ میں علی مردان خان کشمیر سے شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میرے ساتھ ایران کے چند اشخاص ہیں، جو نہروں کے کھودنے میں مہارت رکھتے ہیں، اگر حکم ہو تو دریائے راوی سے ایک نہر نکال کر شہر میں لائی جائے جس سے شہر کے مزروعات اور باغات سرسبز و شاداب ہوں، اور شہر کی رونق کے ساتھ زمینوں کے محاصل میں بھی اضافہ ہو، شاہجہان نے اس تجویز کو پسند کیا، اور اس کے مصارف کے لئے لاکھ روپیہ عطا کئے، علی مردان خان نے اس کام کے لئے ایک معتبر شخص کو مقرر کیا، اور اس نے ۴۸ کوس جریبی کی مسافت سے کہ راوی اور لاہور میں اسی قدر فاصلہ تھا، نہر کھودنی شروع کی،[2] لیکن چونکہ اس سے لاہور کے آس پاس کے باغوں میں اچھی طرح پانی نہیں پہنچتا تھا، اس لئے شاہ جہان نے لاکھ روپیہ اور دیئے، لیکن اس سے بھی نہر کی مرمت نہ ہو سکی، اور پچاس ہزار روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اب ملا علاء الملک تونی نے جو فنون ریاضی کے ماہر تھے، اور علم آب تراز سے بھی واقفیت رکھتے تھے، اس نہر کو پانچ

[1] مآثر رحیمی جلد دوم ص ۶۰۲، ۶۰۳ [2] خافی خان جلد اول ص ۵۸۱،

کوس تک قائم رکھکر ۳۰ کوس تک اور کھدوایا، اور اس ترمیم واصلاح کے بعد شہر میں کافی پانی آنے لگا،[۱]

اس کے بعد قطب الملک سید عبد اللہ خان نے جو فرخ سیر کے وزیر اعظم تھے ۱۱۲۷ھ میں شاہ جہان آباد میں ایک نہر نکالی جس کی نسبت صاحب مآثر الامرا لکھتے ہیں،

"از آثار اوست نہر ہیٹ پر گنج واقع شاہجہان آباد کہ از بے آبی حکم کربلا داشت، قطب الملک در سنہ (۱۱۲۷ھ) سبع وعشرین ومایۃ والف نہرے از اصل نہر شاہجہان برید ہ آورد و آن خطّہ را در وفور آب احیا نمود،"

میر عبد الجلیل بلگرامی نے اس نہر کے متعلق دو شعر کا ایک تاریخی قطعہ لکھا ہے،

بحر جود و فیض قطب الملک عبد اللہ خان — نہر جبرے کرد جاری آن وزیر محتشم
بہر آن عبد الجلیل واسطی تاریخ گفت — نہر قطب الملک مد بحر احسان وکرم[۲]

تالاب نہروں کی طرح آب پاشی اور دوسری ضروریات کے لئے تالابوں کی بھی ضرورت ہے، فرمانروایانِ اسلام میں سلطان علاؤالدین خلجی نے سب سے زیادہ اس طرف توجہ کی، اور دوسری عمارتوں کے ساتھ بکثرت تالاب کھدوائے، چنانچہ فرشتہ میں ہے،

"آن قدر عمارت کہ در عہد او بنا یافت از مسجد و خانقاہ و حوض و منار و حصار در ہیچ عصرے بوقوع نپیوستہ بنا شدہ،"[۳]

اس کے بعد تیموری دور میں شہنشاہ اکبر نے تعمیرات کا ایک مستقل محکمہ قائم کیا، اور اسی کے ذریعہ سے بکثرت تالاب کھودے گئے، آئین اکبری میں ہے،

"وفراوان آب گیر وچاہ کہ جان داروے زندگان وآبروے زمینہا است بروے کار آید"[۴]

---

[۱] مآثر الامرا حصہ سوم ص ۵ ۲۲ [۲] ایضاً ص ۱۴۰ [۳] فرشتہ جلد اول ص ۱۲۱ [۴] آئین اکبری جلد اول ص ۱۱

اس محکمہ کے علاوہ دورِ اکبری میں انفرادی کوششوں سے بھی متعدد تالاب کھودے گئے، چنانچہ امراءِ اکبری میں شیخ عبدالرحیم لکھنوی نے ایک عورت کو گھر میں ڈال لیا تھا، اور جب ان کا انتقال ہوا، تو اس نے بہت سے پُر تکلف مکانات بنوائے اور تالاب کھدوائے[1]، اسی دور میں شاہ قلی خان المتوفی ۱۰۱۰ھ نے اپنے وطن نارنول میں ایک بہت بڑا تالاب کھدوایا[2]،

امراءِ اکبری میں ایک اور نہایت فیاض بزرگ شیخ فرید تقفی خان تھے، انھوں نے دلّی میں فرید آباد کو آباد کیا تھا، اور اس میں بہت سی عمارتوں کے ساتھ ایک تالاب بھی اپنی یادگار میں چھوڑا، چنانچہ مآثر الامراء میں ہے:۔

دردہلی فرید آباد با عمارات و تالاب یادگار گذاشت[3]،

امراءِ اکبری میں اعتماد خان نے بھی آگرہ سے ۷ کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں اعتماد پور کے نام سے آباد کرایا، اور اس میں ایک تالاب کھدوایا، اور اسی گاؤں میں اپنا مقبرہ بھی تعمیر کرایا[4]، جو آج زیارت گاہِ عام و خاص ہے،

ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دیہاتوں کی آبادی اور رونق کا ایک ضروری جزو تالاب بھی تھے، اس لئے جو لوگ دیہاتوں کو آباد کرتے تھے، وہ وہاں اور چیزوں کے ساتھ تالاب بھی کھدواتے تھے،

اکبر کے بعد جہانگیر نے تالابوں کے کھدوانے کا ایک خاص نظام قائم کیا اور اپنی تخت نشینی کے ساتھ ہی عام اعلان کیا کہ

درممالکِ محروسہ از کافر و مسلمان ہر کس کہ فوت شود مال و منالِ او بورثۂ او واگذارند،

---

[1] مآثر الامراء حصہ دوم ص ۵۶۵ [2] آثر الامراء حصہ دوم ص ۶۰۸ [3] ایضاً ص ۶۳۹ [4] ایضاً حصہ اوّل ص ۵۰

ہیچ کس دراں دخل فساز دواگر وارث نداشتہ باشد بجہت ضبط آں اموال مشرف و تحویلدار علحدہ تعیین نمایند تاآں وجہ بمصارف شرعی کہ ساختن مساجد و سراہا و مرمت پلہائے شکستہ احداث تالابہا و چاہ ہا باشد صرف شود[١]"

اسی زمانے میں ملک عنبر نے دکن میں ایک تالاب کھدوایا، اور اس سے ایک گانون کی رونق و آبادی میں اضافہ کیا، چنانچہ صاحب مآثر الامراء لکھتے ہیں،

"باایں ہمہ فساد و ہنگامہ (کہ پیوستہ با فوج مغل و لشکر دکن زد و خورد داشتہ) موضع کھرکی پیچ کروہے، دولت آباد را کہ امحال بہ خجستہ بنیاد و رنگ آباد موسوم است) باحداث تالاب و طرح باغ و عمارت عالیہ معمورہ عظیم ساخت[٢]"

جہانگیر کے بعد شاہجہان نے عمارتوں اور باغوں کی رونق و سرسبزی کے لئے متعدد حوض و تالاب بنوائے، چنانچہ حافظ رخنہ نے سہرند میں اکبر کے زمانہ میں ایک نہایت عمدہ باغ لگوایا تھا، ایک بار شاہجہان نے اس میں قیام کیا، تو اس کے متصل ایک نہایت عمدہ تالاب کھدوایا[٣]، اسی مقام پر دیانت خان فوجدار سہرند کو حکم دیا کہ ایک نہایت عمدہ عمارت تیار کرائی جس کے ایک طرف باغ اور دوسری طرف تالاب ہو[٤]، کشمیر کے ایک گاؤن اچول میں جس کا نام شاہجہان نے صاحب آباد رکھا تھا، جہانگیر نے جو شاہی عمارتیں تیار کرائی تھیں، وہ شاہجہان کو پسند نہ آئیں، اس لئے حکم دیا کہ ان کے بجائے دوسری عمارتیں آبشاروں اور حوضوں کے ساتھ تعمیر کرائی جائیں[٥]،

شاہجہان کے بعد اگرچہ عالمگیر نے خود کوئی حوض یا تالاب نہیں کھدوایا، لیکن امرائے

---

[١] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ٥ [٢] مآثر الامراء حصہ سوم ص ٩ [٣] بادشاہ نامہ حصہ دوم

[٤] ایضاً ص ٩، [٥] ایضاً حصہ دوم ص ١٥١

عالمگیری میں خان زمان نے قصبہ نارنول میں ایک عظیم الشان تالاب کھدوایا۔ جس کے سامنے شاہ قلی خان کے تالاب کی کوئی وقعت نہیں رہی، چنانچہ صاحب مآثر الامرا لکھتے ہیں،

"در ظاہر آن قصبہ خلیل ساگر تالابے برساخت کہ تال شاہ قلی خان محرم راہش آبرو نماند"[1]

عالمگیر کے بعد محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں حسین علی خان نے اورنگ آباد میں ایک حوض بنوایا جس کو عضد الدولہ عوض خان المتوفی ۱۱۴۳ھ نے اور بھی زیادہ وسیع کیا، چنانچہ خافی خان لکھتا ہے،

"حوض آب در خجستہ بنیاد بنا گذاشتہ اوست، اگرچہ عضد الدولہ عوض خان بہادر در وسعت ارتفاع عمارت مسجد افزودہ اما اصل بانی بنائے خیر جاری آن حوض دریا موج در ایام تابستان از قلت آب سکنۂ خجستہ بنیاد در عذاب بودند حسین علی خان گردیدہ"[2]

کنوئیں: فرمانروایان اسلام نے ہندوستان میں تالابوں کی طرح نہایت کثرت سے کنوئیں بھی کھدوائے، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے اپنے دور حکومت میں ڈیڑھ سو کنوئیں کھدوائے تھے[3]، اس کے بعد شیر شاہ نے بنگال سے لے کر اکبر آباد، مانڈو اور بہت تک مسافروں کے لئے راستوں میں پختہ کنوئیں تیار کرائے تھے[4] شیر شاہ کے بعد اکبر نے ایک مستقل محکمہ تعمیرات قائم کیا اور اس کے ذریعہ بکثرت کنوئیں کھدوائے[5]،

خلاصۃ التواریخ میں ہے کہ اکبر نے اجمیر سے فتح پور تک ایک ایک کوس کے فاصلے

---

[1] مآثر الامرا، حصہ اول ص ۸۰۶، [2] خافی خان حصہ سوم ص ۹۴۲ [3] فرشتہ جلد اول ص ۱۵۱ [4] خافی خان جلد اول ص ۱۰۷ [5] آئین اکبری جلد اول ص ۱۱۵

پر پختہ کنوئیں کھدوائے تھے تاکہ وہ کوس کی علامت قرار پائیں اور اسی کے ساتھ منارے بھی بنوائے تھے، اور ان پر شکار شدہ ہرنوں کی سینگیں لگوائی تھیں "تاکہ رہروان را اعتمادے ودلیلے بودہ باشد"

اکبر کے بعد جہانگیر نے ایک عام قاعدہ مقرر کر دیا تھا کہ جو لوگ لاوارث مر جائیں اُن کے مال سے سرکاری طور پر مسجدیں اور سرائیں تعمیر کرائی جائیں، ٹوٹے ہوئے پلوں کی مرمت کرائی جائے اور کنوئیں اور تالاب کھدوائے جائیں، یہ تو خاص سرکاری انتظام تھا، لیکن جاگیرداروں کے لئے یہ حکم تھا کہ جو راستے آبادی سے دور ہوں، اور وہاں چوریاں اور ڈکیتیاں ہوتی ہوں، وہاں سرائے، مسجد اور کنوئیں تیار کرائیں تاکہ کچھ لوگ وہاں آباد ہو جائیں[۱]، اس کے علاوہ جہانگیر نے آگرہ سے لاہور تک ایک ایک کوس پر سنگ میل نصب کرائے اور تین تین کوس کے فاصلہ پر کنوئیں کھدوائے، چنانچہ تزک میں لکھتا ہے:-

"بیش ازیں حسب الحکم از دار الخلافہ آگرہ تا دریائے اٹک دو طرفہ درخت نشانیدہ خیاباں ترتیب دادہ اند، ہمچنیں از آگرہ تا بنگالہ و در نیولا حکم کردم کہ از آگرہ تا لاہور بر سر ہر کروہے میلے بسازند کہ علامت کروہ باشد و بفاصلہ سہ کروہ چاہ آبے تا متردّدین آسودہ و مرفہ الحال آمد و رفت نمایند از تشنگی و تابش آفتاب بے محنت و صعوبت نکشند"[۲]

عالمگیر نے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، راستوں میں جو سرائیں تعمیر کرائی تھیں، ان کے ساتھ پختہ کنوئیں بھی کھدوائے تھے،

حمام | ہندوستان میں حمام صرف اسلامی دورِ حکومت کی تمدنی پیداوار ہے، ہندوؤں کے یہاں حمام کا مطلق رواج نہ تھا، چنانچہ ملا عبد الباقی نہاوندی مآثر رحیمی میں لکھتے ہیں،

---

[۱] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۵ [۲] ایضاً ص ۲۸۰،

در ولایت ہندوستان و امصار و بلاد آن بجہت آنکہ آین وسعت آباد در تصرف کفرہ و ہنود بودہ، در نزد آن گروہ حمام ساختن ظاہر امتنع است، از ین سعادت محروم بودند و مسلمانان کہ درین دیار بودہ اند ازین رہگذر مشقت و آزار بسیار میکشیدہ اند[1]،

بابر نے اپنی تزک میں ہندوستان کی تمدنی حالت پر جو اجمالی ریویو کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانہ تک ہندوستان میں حمام کا وجود نہ تھا، چنانچہ وہ لکھتا ہے،

" یخ و آب سرد نے در بازار ہائے او طعام خوب و نان خوب نے حمام نے و مدرسہ نے شمع و مشعل نے او شمعدان نے "،

لیکن تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر سے پہلے ہندوستان میں فیروز شاہ حمام تعمیر کرا چکا تھا تاہم آرام و آسایش کے ساتھ حمام تکلف و نفاست کی چیز بھی ہے، اور سلاطین تیموری تکلف و نفاست میں اور مسلمان فرمانروایانِ ہندوستان سے بڑھے ہوئے تھے، اور یہ تکلف بابر ہی کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا، چنانچہ خافی خان ایک موقع پر لکھتا ہے،

" بعدہ ہمراہ سلطان جنید بخدمت و ملازمت حضرت فردوس مکانی محمد بابر شاہ غازی رفتہ روشناس گشت و چندگاہ در رکاب ماندہ از اطوار سلطنت مغلیہ واقف و محرم گشتہ اکثر بزبان می آورد کہ از اندازۂ روش و نسق جنتہ معلوم می شود کہ انہا را از ہندوستان بیرون کردن چندان کار نیست رفتار بتمسخر و ہذیان گفتن و راطون می ساختند، و دیگر نیز بیان می آورد کہ چون مغلان با سباب و تزک دگر و آوری اشیائے خود آرائی و تن پروری آن قدر ریختہ اند[2]

---

[1] مآثر رحیمی جلد دوم ص ۶۰۰ و ۶۰۱، [2] فرشتہ جلد دوم ص ۱۵۱،

کہ ہمہ کارگی و جزو ی با مراد نوکران قرشی واگذ اشتہ اند[۱]

اس بنا پر تیموری دور میں حمام کا زیادہ رواج ہوا، اور بکثرت حمام تعمیر ہوئے، چنانچہ اکبری دور میں عبد الرحیم خانخان نے برہان پور کے میدان میں ایک نہایت عمدہ حمام بنوایا، جس کی نسبت ملا عبد الباقی نہاوندی لکھتے ہیں:-

" در ایران بصفا و پاکیزگی آن ہم نمی رسد، و فقرا و مساکین از ان فیض می برند[۲]

جہانگیر نے اگرچہ خود کوئی حمام نہیں بنوایا، تاہم اس کے دور میں بھی بعض حمام تعمیر ہوئے، وہ خود تزک میں لکھتا ہے،

" حسب الالتماس آصف خان بمنزل او کہ در کنار جمنا اساس یافتہ رفتہ شد حمامے ساختہ در نہایت صفا و نفاست بغایت محظوظ گشتم"[۳]

اس کے بعد شاہجہان نے کشمیر میں شالہ مار یعنی باغ فرح بخش" کے متصل شمالی جانب ایک نہایت عمدہ حمام بنوایا[۴] اور اس کے ارکان سلطنت میں وزیر خان نے بھی لاہور میں ایک حمام تعمیر کیا[۵]، شاہجہان کے بعد عالمگیر کے زمانہ میں نہایت کثرت سے حمام تعمیر ہوئے، چنانچہ اس نے یہ حکم دیا کہ جن راستوں میں سرائیں نہ ہوں، ان میں سرائیں قائم کیجائیں، اور ہر سرائے کے ساتھ ایک حمام بھی ہو[۶]، امرائے عالمگیری میں امانت خان میرک نے بھی لاہور میں ایک حمام بنوایا، جس کی نسبت صاحب مآثر الامرا لکھتے ہیں،

" حمام طرح نمودہ کہ مشہور عالم است"[۷]

---

[۱] خافی خان حصہ اوّل ص ۱۰۹ [۲] مآثر رحیمی جلد دوم ص ۶۰۱،

[۳] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۰۰، [۴] بادشاہ نامہ حصہ دوم ص ۴۲، [۵] مآثر الامرا حصہ سوم ص ۹۳۵، [۶] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۴، [۷] مآثر الامرا حصہ اول ص ۲۶۳،

عالمگیر کے زمانہ میں ایک اور مشہور حمام تھا جس کو سنجر بیگ نے بنوایا تھا[1]،

پل فرمانروایانِ اسلام کے دورِ حکومت میں ہندوستان میں نہایت کثرت سے پل تیار ہوئے،

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے ایک سو پل بنوائے تھے[2]، اس کے بعد سلطان زین العابدین نے کشمیر میں نہایت کثرت سے پل بنوائے[3]،

شہنشاہِ اکبر نے اگرچہ خود کوئی پل نہیں تعمیر کرایا، تاہم اس کے امراء میں خانخانان نے جونپور میں جو پل تعمیر کیا، اس کی شہرت آج بھی قائم ہے، چنانچہ صاحبِ مآثر الامراء لکھتے ہیں،

" از ابنیہ خانخانان (کہ بمرورِ دہور دمعنی ایام یادگار خواہد ماند) پل جونپور است کہ صراط المستقیم ۱۸۹۰ھ تاریخ آنست واز اعاظم جسور ممالک محروسہ است[4]"

جہانگیر نے جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے، لاوارث لوگوں کے مال کا ایک مصرف شکستہ پلوں کی مرمت و اصلاح قرار دیا تھا، اس کے علاوہ اس نے بذاتِ خود بھی بعض پل تعمیر کرائے، چنانچہ تزک میں لکھتا ہے،

" پنج ہزار روپیہ دیگر از زرِ وزن بجہت تعمیر پل بابا حسن ابدال و عمارتے کہ در آن جا واقع است حوالہ ابوالوفا پسر حکیم ابوالفتح شد کہ اہتمام نمودہ پل و عمارت مذکور را در نہایت استحکام بہ انصرام رساند[5]"

جہانگیر کے بعد عالمگیر نے نہایت کثرت سے پل تعمیر کرائے، اور عام حکم دیا کہ

" در ہر موضع کہ پل درکار باشد نیز باستحکام تمام بسازند[6]"

---

[1] مآثر الامراء جلد دوم ص ۳۶۶، [2] فرشتہ جلد اول ص ۱۵۱، [3] ایضاً جلد دوم ص ۳۴۳، [4] مآثر الامراء جلد اول ص ۵۴۶، [5] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۷۷، [6] عالمگیرنامہ ص ۱۰۸۵،

عالمگیر کے دورِ حکومت میں شائستہ خان امیر الامراء نے بھی نہایت کثرت سے پل تعمیر کرائے، چنانچہ صاحب مآثر الامراء ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں،

"آثارِ خیر از قبیل رباط و مسجد و جسر (کہ لکھا بصرف آن رفتہ) در چار دانگ ہندوستان بسیار یادگار"[۱]

اس کے بعد محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں حسین علی خان نے اپنے وطن بارہ میں پل تعمیر کروائے[۲] اسی دور میں نواب آصف جاہ نے دکن کے ایک مقام میں ایک پل تعمیر کیا، چنانچہ مآثر الامراء میں ہے،

"و آبادی نظام آباد بالائے گھاٹی فردا پور (کہ در ویرانہ محض بود) طرح انداخت و مسجد و کاروان سراو دولت خانہ و پل تعمیر نمود"[۳]

پلون کے علاوہ فیروز شاہ تغلق نے پچاس بند بھی بندھوائے تھے[۴]،

بازار | اسلامی دورِ حکومت میں بہ کثرت بازار قائم کئے گئے، بالخصوص سکندر لودی نے ان تمام مقامات پر بازار قائم کئے، جہان ہندو غسل کرتے تھے[۵]، عالمگیر نے ہندوستان کے جن راستون میں سرائیں تعمیر کروائی تھیں، اُن کے ساتھ بازار بھی قائم کئے تھے[۶]،

اس کے علاوہ رفاہِ عام کی اور بھی بہت سی چیزیں وجود میں آئیں، مثلاً فیروز شاہ نے سو مقبرے بنوائے، جہانگیر نے تمام بڑے بڑے شہرون میں ڈھائی تین گز کی بلند دیوارین اس غرض سے بنوائیں کہ جب بوجھ اٹھانے والون کو ستانے کی ضرورت پیش آئے تو اپنے سر کے بوجھ کو اتار کر خود اس پر رکھ سکیں اور پھر دوبارہ اٹھانے میں اُن کو کسی

---

۱ مآثر الامراء حصہ دوم ص ۰۵ ، ۲ تقبیہ خافی خان ص ۹۴۲، ۳ مآثر الامراء حصہ سوم ص ۸۴۲ ۴ فرشتہ جلد اوّل ص ۱۵۱، ۵ فرشتہ جلد اوّل ص ۱۸۶ ۶ عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۷،

مدد گار کی حاجت نہ پڑے، چنانچہ تزک میں لکھتا ہے،

"روز جمعہ بست و دوم چہار کروہ مسافت طے نمودہ در موضع بازیچہ سعادت نزول اتفاق افتاد،
دورین راہ دیوارہا بنظر درآمد از دو نیم گز تا سہ گز بعد از تحقیق معلوم شد کہ مردم بقصد ثواب ساختہ اند
کہ چون حمالے در راہ ماندہ شود بار خود بران دیوار نہادہ نفسے راست سازد و باز بے مدد غیرہ
بفراغت بر داشتہ متوجہ مقصد گردد و این تعرف خاصہ اہلِ گجرات است، بسیار مرا این فکر
ساختن خوش آمد، فرمودم کہ در جمیع شہرہائے کلان بہمین دستور دیوارہا از طرف بادشاہی بسازند۔"[1]

راستوں اور گلیوں کی صفائی ہندوستان میں فرمانروایانِ اسلام نے راستوں اور گلیوں کی
صفائی اور روشنی کا ضرور کوئی انتظام کیا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ تاریخوں میں اس کی تفصیل
نہیں ملتی، البتہ بساتین السلاطین میں فرمانروایانِ سلسلہ عادل شاہیہ کے جو ضوابط سلطنت مذکور
ہیں، ان میں اس کا بھی ایک خاص ضابطہ موجود ہے، چنانچہ اس ضابطہ کے الفاظ یہ ہیں،

"از دربار بادشاہی راستہائے بازار تا ہر دو دروازہ از دو جانب با تمام کمال
برسانند و معمور دارند چہ بازارہا از دو طرف معمور باشد ہمہ جانب سودا خرید ی نزدیک
خواہد شد، و درمیان راستہ بازارہا نگذارند کہ خیمہ و چھپرہ و دوکان بنا بدارند بجز دو راستہ
درمیان ہیچ دوکان حاجت نیست، و دران کوشد کہ بقال و زیات و بزاز و خیاط
و زین و خیمہ دوز و طباق و ہر قوے پہلوے ہمدیگر یک راستہ بمانند و دوکان داشتہ
باشند[2] تا کہ راستہ و بازارہا با تمام معمور می شوند، محلہ ہا و کوچہ ہا منظور بدارند
و پیوستہ شاہراہ ہا و کوچہ ہا و بازارہا بتاکید پاک و صاف نگہداشتہ در مدنظر
نظر در ہائے راہ ہیچ خاس و خاشاک افتادن ندہند و از دو راستہ بازار ہیچ دوکانے

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۱۰، [2] بساتین السلاطین ص ۳۵۴،

ناآباد و خراب نگذارند[1]

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں رستون کی صفائی اور دوکانون کی ترتیب کا انتظام اس زمانہ سے کم نہ تھا،

موذی جانورن کا مارنا موذی جانورون کے حملوں سے رعایا کا محفوظ رکھنا رفاہِ عام کی ایک صورت ہے۔ اور بعض فرمانروایانِ اسلام نے اس میں اس قدر کوشش کی تھی۔ کہ اپنے حدودِ سلطنت کو موذی جانورون سے بالکل پاک و صاف کر دیا تھا، چنانچہ سلطان محمود خلجی کے زمانہ میں کسی مسافر کو شیر نے پھاڑ ڈالا۔ اس کی ماں اور بچے اس کے دربار میں آئے اور درندوں کے حملوں کی شکایت کی، سلطان نے اپنے حدودِ سلطنت میں ہر جگہ فرمان بھیج دیا کہ تمام درندہ جانور مار ڈالے جائیں، اور اس کے بعد اگر کہین درندے نظر آئیں تو ان کے عوض وہان کے حاکم کو قتل کر دیا جائے، نتیجہ یہ ہوا کہ

"ازین رہگذر در زمان دولت فرخندہ او و بعد از و سالہا کس در ولایت مالوہ شیر و گرگ و دیگر سباع نمی دید[2]،

سودی قرض لینے کی ممانعت رفاہِ عام کے متعلق اوپر جن جن چیزون کا ذکر کیا گیا، وہ تمامتر مادی صورت میں موجود تھیں، لیکن ان کے علاوہ رفاہِ عام کی اور بھی بہت سی شکلیں ہیں، جن کی کوئی مادی صورت نہیں ہے، لیکن وہ ان مادی چیزون سے بھی زیادہ مفید خلق ہیں، مثلاً سودخواری ایک ایسی لعنت ہے کہ جو شخص اس کے شکنجے میں گرفتار ہو جاتا ہے، وہ بمشکل اس سے رہائی حاصل کر سکتا ہے، اس وقت صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں یہ وبا پھیلی ہوئی ہے، اور اس کے انسداد کے لئے ہر طرف سے

[1] ماٰثر السلاطین ص ۳۰۵ [2] فرشتہ دوم ص ۲۵۴

شور و غل کیا جا رہا ہے تاہم اس کے دفعیہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن سلاطینِ اسلام میں سلطان محمود بیگڑہ نے اپنے سپاہیون کو عام حکم دیا تھا کہ ان میں کوئی شخص سودی قرض نہ لے، صرف یہی نہیں بلکہ ایک مستقل خزانہ اس غرض سے قائم کر دیا تھا، کہ جس سپاہی کو قرض کی ضرورت پیش آئے، وہ ایک میعاد معین کے لیے اس سے لے لے، مراتِ احمدی میں ہے،

"و حکم کردہ بود کہ ہیچ کس از لشکریان من قرض ربا نگیرد، و خزانہ علٰحدہ مقرر کردہ بود کہ از سپاہی ہر کس بقرض حاجت داشتہ باشد باد بدہد و بوعدہ بگیرد، می فرمود کہ اگر مسلمانان قرض ربا نخورند از دست ایشان غذا چگونہ آید[1]"

بیروزگاری کا انسداد | بے روزگاری سے مختلف اخلاقی بُرائیان مثلاً گداگری، آوارگی، رہزنی، اور چوری وغیرہ پیدا ہوتی ہیں، اور اس زمانہ میں تو بے روزگاری سیاسی شورشون کا بھی ایک بڑا سبب بن گئی ہے، موجودہ سلطنتون کو اگرچہ قوم و ملک کے اصلاحِ اخلاق اور تہذیبِ نفس کی کوئی پروا نہیں، لیکن وہ سیاسی شورشون کو ہر ممکن طریقہ سے دبانا چاہتی ہیں، با این ہمہ وہ اس زمانہ کے بیکارون کے برسرِ روزگار کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتین، لیکن فرمانروایانِ اسلام میں سب سے پہلے تغلق شاہ نے اس طرف توجہ مبذول کی، اور رعایا کے ہر فرد کو کسی نہ کسی کام میں لگانا چاہا، لیکن اس کا مقصد خود غرضی یعنی کسی سیاسی شورش کا دبانا نہ تھا، بلکہ محض رعایا کی بہبودی مدنظر تھی، چنانچہ تاریخ فیروز شاہی میں ہے،

"و عجب نیکخواہی عام کہ در ذات سلطان تغلق شاہ مجبول بودہ است کہ ہم اہل مملکت خود را آسودہ و غنی خواستے و محتاج و بے نوا نتوانستے دید، و دوران گوشیدے کہ رعایا و لشکری و کل طوائف دیگر ہمہ ہمیشہ در فراغ باشند و با راحت زیند و این عادت قدیم و عادت خو

---

[1] مراتِ احمدی جلد اوّل ص ۷۰،

سلطان تغلق شاہ بودہ است کہ رعایا ولایت او و ملکِ او مسلمان و ہندو کارے و کسے و زراعتے و حرافتے کنند کہ ازان کار کسب آسودہ شوند و از احتیاج سوال و بیچارگی و درماندگی مضطر نشوند و نیک خواہی عام سلطان در باب رعایا، بجدے بودے کہ در باب گدایان دلہا خواستے اگر ترک گدائی گیرند و بکارے و کسبے مشغول شوند و از خواری سوال و ننگ بینوائی و احتیاج در یا خلاص یابند و جماہیر طوائف مملکت از دنبال کسب و کار خود آسودہ و مرفہ الحال باشند، و کارے و فعلے و گناہے و تباہی، از ایشان در وجود نیاید[1]۔

اس کے بعد فیروز شاہ نے اس صیغہ کو بھی ترقی دی اور کوتوال کو حکم دیا کہ شہر میں جتنے بیکار لوگ ہوں، وہ دربار میں حاضر کیے جائیں، اس حکم کے بعد کوتوال شہر نے ہر محلہ دار کو طلب کیا، اور اُن سے ہر ایک کے حالات دریافت کیے، اور محلہ داروں نے بڑے بڑے شہر فامر کو جو ناداری سے کسی کو منہ تک نہیں دکھلا سکتے تھے، کوتوال کے سامنے پیش کیا، کوتوال نے ان لوگوں کے نام اور حالات لکھے، اور ان کو دربار میں حاضر کیا، اور فیروز شاہ نے ہر ایک کو کسی نہ کسی کام سے لگا دیا[2]،

ارزانی رعایا کی فلاح و بہبود کا تمامتر دار و مدار اسباب معاش اور ضروریات زندگی کی ارزانی پر ہے، بالخصوص غلے اور کپڑے کی ارزانی ایک ایسی چیز ہے جس سے ملک و قوم کا غالب حصہ خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر سکتا ہے، لیکن جب تک اس کے لئے خاص آئین و ضوابط نہ منضبط کئے جائیں، یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا،

سلطان علاء الدین کے زمانہ میں مغلوں کے حملوں کا خوف ہمیشہ لگا رہتا تھا، اور وہ انکے انسداد کی ہر ممکن تدبیر سوچتا رہتا تھا، اس کی سب سے موثر تدبیر اس کی سمجھ میں یہ آئی کہ فوج کی تعداد

---

[1] تاریخ فیروز شاہی جلد اول ص ۴۳۵، ۴۳۶، [2] ایضاً جلد دوم ص ۳۴۴،

زیادہ بڑھائی جائے، اور ان کو اسپ وسلاح اور دوسرے فوجی ساز و سامان سے آراستہ کیا جائے، لیکن اس کے لئے کافی روپیہ کی ضرورت تھی، اور سلطان کا خزانہ اس عظیم الشان فوجی مصارف کا زیادہ دنون تک متکفل نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے اس نے فوجی معاملات میں شان چنگیزی پیدا کرنی چاہی، اور ترکی ممالک کی طرح فوجی سپاہیون کو بہت کم تنخواہ پر ملازم رکھنا چاہا، اس نے ارکانِ سلطنت کے سامنے اس خیال کو ظاہر کیا، تو سبنے بالاتفاق یہ رائے دی کہ اگر ضروریاتِ زندگی ارزان ہو جائیں، تو تھوڑی سی تنخواہ میں بہت سے سپاہی ملازم رکھے جا سکتے ہیں، سلطان نے یہ رائے پسند کی اور سب سے پہلے غلہ کی ارزانی کے لئے تمام غلون کا حسب ذیل نرخ مقرر کیا،

گیہون	فی من	ساڑھے سات جیتل[1]
جو	"	چار جیتل
چنا	"	پانچ جیتل
چاول	"	"
ماش	"	"
موٹھ	"	تین جیتل

اور اس نرخ کے قائم رکھنے کے لئے چند ضوابط بنائے، جو حسب ذیل ہیں،

(۱) غلے کی منڈیون میں سرکاری عہدہ دار جن کو شحنہ کہتے تھے، مقرر کئے کہ وہ نہایت ہوشیاری سے سرکاری نرخ کو قائم رکھیں، اور تاجرون کو اس میں کمی بیشی کا موقع نہ دین،

(۲) سرکاری محاصل میں جو غلہ وصول ہو تو اس کو جمع رکھا جائے، تاکہ اگر بازار میں غلہ کی

---

[1] جیتل تانبے کا ایک پیسہ تھا، اور اس زمانہ میں من ۴۰ سیر کا، اور سیر ۲۴ تولہ کا ہوتا تھا،

کمی ہو، تو سرکاری غلہ مقررہ نرخ کے موافق فروخت کیا جا سکے، اس غرض سے بعض جگہ مالگذاری میں صرف غلہ لیا جاتا تھا، اور اس طریقہ سے دلّی میں اس قدر غلہ آتا تھا، کہ کوئی محلّہ ایسا نہ تھا، جس کے دو تین گھر سرکاری غلہ سے پر نہ ہوں، اگر قحط پڑ جاتا تھا، یا تاجرانِ غلہ کسی وجہ سے غلّہ نہیں لاتے تھے، تو منڈی میں یہی سرکاری غلّہ فروخت ہوتا تھا، اور اس میں غلہ کی کمی نہیں ہوتی تھی،

۳۔ ملک کے تمام غلّہ فروش شحنہ کی رعایا بنا کر جمنا کے کنارے بسائے جائیں، تاکہ اطراف ملک سے غلّہ لاکر سرکاری نرخ کے موافق فروخت کریں، اور اس معاملہ میں ان سے تحریری معاہدہ لیا جائے کہ کسی شخص کو احتکار یعنی غلّہ کے روک رکھنے کا موقع نہ دیا جائے، اور اس بارے میں اس قدر سختی کی گئی کہ اگر یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ کسی شخص نے غلہ روک رکھا ہے، تو اس غلہ کو سرکاری غلون میں داخل کر لیا جاتا تھا، اور اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا،

۴۔ کاشتکار اپنی ضرورت سے زیادہ غلّہ کھیت ہی پر فروخت کر دیں، اور اس سے زیادہ ایک دانہ بھی گھر پر نہ لے جائیں، اس کے ساتھ عمال رعایا سے مالگذاری کھیت ہی پر وصول کر لیں، تاکہ کاشتکار اپنے حصّہ سے زائد غلّہ گھر میں لے جاکر جمع نہ کر سکیں،

۶۔ روزانہ غلہ کے نرخ اور منڈی کے تمام معاملات کی اطلاع بادشاہ کو دیجائے، اور قحط کے زمانہ میں ہر شخص صرف اپنی ضرورت کے موافق غلہ خریدے اور اس پر اس شدت سے عمل کیا گیا، کہ اگر مقررہ ضوابط میں ذرہ برابر بھی خلل پڑتا تھا، تو منڈی کا تمام عملہ سزایاب ہوتا تھا، اور جو لوگ ضرورت سے زیادہ آدھ سیر غلہ بھی خریدتے تھے، وہ معتوب ہوتے تھے، اس کے لئے خاص خاص گماشتے اور جاسوس مقرر تھے، جو شدت سے اس حکم پر عمل کراتے تھے، اور بادشاہ کو خفیہ طور پر تمام معاملات کی اطلاع دیتے تھے،

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ قحط کے زمانہ میں بھی یہی نرخ قائم رہتا تھا، اور غلہ کے انبار میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی،

غلہ کی طرح تمام سوتی اور ریشمی کپڑون کی بھی حسب ذیل قیمتیں مقرر کی گیئں،

جیرہ دہلی	۱۶ تنکہ	جیرہ کونلہ	۶ تنکہ
سرے صاف اعلیٰ	۵ تنکہ[۱]	خز دہلی	۱۶ تنکہ
سرے صاف میانہ	۳ تنکہ	خز کوتلہ	۶ تنکہ
سرے صاف ادنی	۲ تنکہ	مشروع شعری بہین	۳ تنکہ
سلائی اعلیٰ	۴ تنکہ	بردبین یا دوال لعل	۶ جیتل
سلائی میانہ	۳ تنکہ	بردادنی	۳ جیتل
سلائی ادنی	۲ تنکہ	استر لعل ناگوری	۲۴ جیتل
کرپاس اعلی ۲ گز	۱ تنکہ	استر ادنی	۱۲ "
کرپاس میانہ ۳ گز	۱ تنکہ	شیرین بافت بہین	۵ تنکہ
کرپاس ادنی ۴ گز	۱ تنکہ	شیرین بافت متوسط	۳ تنکہ
کرپاس سادہ	۱۰ جیتل	شیرین بافت ادنی	۲ تنکہ

اور اس نرخ کو قائم رکھنے کے لئے حسب ذیل ضوابط وضع کئے،

۱۔ دروازہ بداون کے قریب ایک وسیع صحرا میں سرائے عدل کے نام سے ایک سرائے قائم کی، اور حکم دیا کہ اطراف وجوانب سے سوداگر جو کپڑے لائیں، ان کو کسی بازار یا کسی کے گھر میں نہ اتارین، بلکہ براہِ راست سرائے عدل مین لاکر شاہی نرخ کے مطابق صبح سے ظہر کے

---

[۱] تنکہ سونے اور چاندی کا ایک سکہ تھا جس کا وزن ایک تولہ ہوتا تھا، اس جگہ تنکہ سے چاندی کا تنکہ مراد ہے،

وقت تک فروخت کرین، اس ضابطہ کے خلاف اگر کوئی شخص کسی کے گھر یا کسی بازار میں اپنا مال اتار کر نرخ شاہی سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتا تھا، یا خرید و فروخت کے مقررہ وقت کی پابندی نہیں کرتا تھا، تو اس کا مال بحق شاہی ضبط کر لیا جاتا تھا، اور اس کو سزا دی جاتی تھی،

۲۔ شہر و اطراف ممالک کے تمام سوداگران پارچہ کے نام درج دفتر کرائے اور ان کو حکم دیا کہ بدستور معہود کپڑون کو لاکر سرائے عدل میں شاہی نرخ کے مطابق فروخت کرین، اس ضابطہ کا یہ اثر ہوا، کہ شاہی کپڑون کی ضرورت باقی نہیں رہی، بلکہ خود تاجران پارچہ اس کثرت سے کپڑے لانے لگے جو مدتون سرائے عدل میں پڑے رہتے تھے، اور فروخت نہیں ہوتے تھے،

۳۔ امرا اور رؤسا کو حکم دیا کہ جب وہ عمدہ باریک اور قیمتی کپڑے خرید کرنا چاہیں، تو رئیس بازار سے پروانہ حاصل کرین، چنانچہ اس ضابطہ کے مطابق رئیس بازار امرا و رؤسا کی حیثیت اور ضرورت کے مطابق پروانہ دیتا تھا، اور جس شخص کی نسبت معلوم ہو جاتا تھا، کہ وہ کپڑے کا تاجر نہیں ہے، بلکہ سرائے عدل سے عمدہ کپڑے ارزان قیمت پر خرید کر باہر زیادہ قیمت پر فروخت کرنا چاہتا ہے، اس کو پروانہ نہیں دیتا تھا، اس بندش سے تاجران پارچہ بھی عمدہ کپڑے ارزان قیمت پر خرید کر باہر نہیں لیجا سکتے تھے، اور اس طرح ان کو گران قیمت پر ان کے فروخت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا،

۴۔ ۲۰ لاکھ تنکہ ملتان کے تاجران پارچہ کو شاہی خزانہ سے دلوایا تاکہ اطراف ملک سے کپڑے لاکر سرائے عدل میں شاہی نرخ کے مطابق فروخت کرسکین،

غلے اور کپڑے کی طرح گھوڑون کی بھی حسب ذیل قیمتین مقرر کین،

اوّل درجہ کا گھوڑا	سو سے ایک سو بیس تنگہ تک
دویم درجہ کا گھوڑا	اسی سے ۹۰ تنگہ تک
سویم درجہ کا گھوڑا	پینسٹھ سے ستر تنگہ تک
ٹٹو	دس بارہ سے بیس پچیس تنگہ تک

ان قیمتون کے قائم رکھنے کے لئے بھی چند ضابطے مقرر کئے،

(۱) حکم دیا کہ کیسہ دار (وہ لوگ جو ارزانی کے وقت سستے دام پر چیزین خریدتے ہیں، اور گرانی کے زمانہ میں مہنگے دام پر فروخت کرتے ہیں،) سوداگرون سے گھوڑے نہ خریدین، اور سوداگر بھی ان کے بجاے بازار میں خرید وفروخت کرین، اور اس معاملہ میں دونون سے معاہدہ لیا گیا، لیکن جو لوگ ارزان خری اور گران فروشی کی لذت سے آشنا تھے، وہ اس سے باز نہیں آتے تھے، اس لئے ان کو سخت سزائین دین، اور بعض کو قتل اور بعض کو جلا وطن کیا،

۲- دلالون پر اس قدر تشدد کیا کہ اگر یہ معلوم ہو جاتا تھا، کہ ایک گھوڑا بھی نرخ بادشاہی کے مطابق فروخت نہیں کیا گیا ہے، تو تمام دلالانِ شہر معتوب ہوتے تھے، اور مجرم اور غیر مجرم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا،

۳- ہر چالیسوین روز گھوڑون کی جنس اور قیمت کی تحقیقات کرتا تھا، اور اگر اس میں ذرہ برابر بھی فرق وتفاوت معلوم ہوتا تھا، تو تمام دلال معتوب ہوتے تھے،

اسی طرح چھوٹی بڑی تمام چیزون کا ایک خاص نرخ مقرر کیا گیا، فرشتہ لکھتا ہے،

"وہر چہ کہ در بازار بخرید وفروش آن احتیاج می باشد بادشاہ نرخ آن قرار دادے و نظر براینکہ این چیز محقر است مثل سوزن وشانہ وکفش وکوزہ گلی نیند اختے، وبہاے ہمہ چیز از نان تا بریان واز حلواے صابونی تا لیڈی واز پودینہ تا تنبول بحضورِ خویش مشخص گشتے"

اس اصول کے مطابق ذیل کی چیزون کے حسب ذیل نرخ مقرر کئے،

مصری	فی سیر دو جیتل
شکر تری	" ایک "
شکر سرخ	" آدھی "
روغن کنجد	تین سیر ایک "
روغن ستور	ڈیڑھ سیر "
نمک	پانچ سیر "
دودھ	پانچ سیر "

غرض اسی طرح بھیڑ بکری، گائے اور بھینس وغیرہ کی بھی مناسب قیمتین مقرر کی گئین، سلطان علاءالدین نے ان قیمتون کے قائم رکھنے کے لئے اس قدر اہتمام کیا، کہ سوداگرون کے حالات، اور قیمت کی تحقیقات کے لئے روزانہ تین جگہون سے اطلاعات حاصل کرتا تھا، ایک تو منڈی کے شحنہ سے، دوسرے لائیں بازار سے، تیسرے ان جاسوسون سے، جو خاص طور پر اسی کام کے لئے مقرر کئے گئے تھے، اس پر تسکین نہین ہوتی تھی، تو کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے بچون کو جو خرید و فروخت کے معاملات سے ناواقف ہوتے تھے، چند تنکہ دیکر بازار بھیجتا تھا، کہ لڑکون کے پسند کی چیزین خرید کر بادشاہ کے پاس لائیں، اگر معلوم ہوتا کہ نرخ یا وزن میں کمی بیشی کی گئی ہے، تو دوکاندار کو کم سے کم جو سزا دیتا تھا، وہ یہ تھی کہ ان کے ناک کان کاٹ لیتا تھا[1]

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، و تاریخ فیروز شاہی جلد اول ص ۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-

سلطان علاؤالدین کے بعد یہ نرخ قائم نہ رہ سکا، اور دوبارہ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی، البتہ اسلامی سلطنت کے دور تنزل میں نواب جعفرخان المتوفی ۱۱۳۵ھ نے اس کی طرف شدت سے توجہ کی، اور اس میں حسب ذیل طریقوں سے کامیابی حاصل کی،

۱۔ متمول لوگوں کے پاس غلہ کے ذخیرے نہیں رہنے دیتے تھے،

۲۔ ہر ہفتہ غلوں کا نرخ دریافت کرتے تھے، اور خود رعایا سے نرخ پوچھتے تھے،

۳۔ اگر بیوپاری ذرہ برابر بھی نرخ میں کمی کرتے تھے، تو ان کو سزا دیتے تھے، اور ان کی تشہیر کرتے تھے،

۴۔ جازون پر ضرورت یعنی خوراک سے زیادہ غلہ لادنے نہیں دیتے تھے جس سے غلہ کی برآمد بند ہوگئی تھی،

ان بندشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ

"در عہد او نرخ برنج فی روپیہ پنج شش من از بازار بود و اجناس دیگر ہمین قیاس، چنانچہ بخرچ یک روپیہ در ماہ پلاؤ و قلیہ ہر روز می خوردند، از ین ممر فقرو مساکین مرفہ الحال بودند"[1]

عمارتیں | ہندوستان میں اسلامی عمارات کی بنیاد اگرچہ مسلمان فاتحین کی آمد کے پہلے ہی دن سے پڑ گئی تھی، اور سب سے پہلے ناصر الدین سبکتگین اور اس کے بعد سلطان محمود غزنوی نے تعمیر مساجد اس کا آغاز کیا تھا، لیکن اس سلسلے کو سلطان علاء الدین خلجی نے جو ۶۹۵ھ میں تخت نشین ہوا تھا، بہت زیادہ وسعت اور ترقی دی، اور مسجدون کے علاوہ اور بھی نہایت کثرت سے مختلف قسم کی عمارتین بنوائیں، چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے،

---

[1] ریاض السلاطین، ص ۲۴۳،

"و آن قدر عمارت کہ در عہد او بنا یافت از مسجد و خانقاہ و حوض و منار و حصار در ہیچ عصرے بوقوع نیامدہ، (تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۲۱)

سلطان علاء الدین کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق نے بھی اس معاملہ میں نہایت ناموری حاصل کی اور قلعہ تغلق آباد کے علاوہ اور بھی نہایت کثرت سے عمارتیں بنوائیں، مآثر رحیمی اور تاریخ فرشتہ میں ہے:-

"در ساختن عمارت رغبت تمام داشت، عمارت قلعہ تغلق آباد و دیگر بناہا فرمودہ و بغایت عمارت دوست بود، و بیشتر اوقات او صرف عمارت شدے[۱]"

اس کے بعد فیروز شاہ نے نہایت کثرت سے مسجدیں بنوائیں اور سلاطین گذشتہ کی تعمیر کردہ عمارتوں کی مرمت اور اصلاح کروائی، چنانچہ خود لکھتا ہے:-

"و مساجد بنا نہادم، و دیگر بقاع خیر بادشاہان ماضیہ را از مسجد و خانقاہ، و مدرسہ و چاہ و حوض و پل و مقبرہ کہ مندرس شد، در تجدید معمور ساختم، و اہل خدمت بر جمیع مساجد و مدارس و خوانق و حمام و چاہ معین ساختہ وظیفہ قرار دادم[۲]"

ان تمام عمارتوں کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں تاہم فرشتہ کو جو تعداد معلوم ہو سکی، وہ حسب ذیل ہے:

مسجد	۴۰	شفاخانہ	۵۰
مدرسہ	۳۰	مقبرہ	۱۰۰
خانقاہ	۲۰	حمام	۱۰
محل	۱۰۰		

جونپور کی مشہور مسجدیں اسی کی بنوائی ہوئی ہیں،

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۳۰ و مآثر رحیمی جلد اول ص ۱۴۳، [۲] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۵۱،

فیروز شاہ کے بعد سلطان سکندر نے ۷۹۵ھ مین کشمیر میں ایک نہایت عالیشان مسجد بنوائی، لیکن ایک مدت کے بعد یہ مسجد جل گئی، تو سلطان حسین نے اس کو از سر نو تعمیر کرانا شروع کیا لیکن اثنائے تعمیر ہی میں اس کا انتقال ہوگیا، تو اس کے وزیر ابراہیم باکرے نے ۹۰۹ھ میں تعمیر کے کام کو درجۂ تکمیل تک پہنچایا، جہانگیر نے اس کی نسبت لکھا ہے،

" الحق از حکام کشمیر اثرے بہتر ازین نماندہ[۱]"

فرمانروایان کشمیر میں سلطان سکندر کے بعد اس سلسلہ میں سلطان زین العابدین نے نہایت ناموری حاصل کی، اور کشمیر میں نہایت کثرت سے عمارتین تعمیر کروائین، جو سلاطین تیموریہ کے زمانہ تک قائم تھیں، چنانچہ جہانگیر ایک موقع پر تزک میں لکھتا ہے:-

" آثار و علامات وعمارت او در کشمیر بسیار است"

ان میں سے جہانگیر نے ایک خاص عمارت کا تذکرہ کیا ہے، جو سلطان زین العابدین کے تعمیری کارناموں میں نہایت اہمیت رکھتی ہے، وہ لکھتا ہے، کہ" ان تمام عمارتون مین ایک عمارت جس کا نام زین لنکا ہے، اولر نامی تالاب کے اندر بنائی گئی ہے، اس تالاب کا عرض و طول تین کوس سے زیادہ ہے، اور اس کا چشمہ ایک گہرے دریا کے اندر ہے، اس عمارت کے بنانے مین اوس نے بڑی کوشش کی، اور پہلی بار کشتی میں بھر کر بہت سے پتھر منگوا کر اس مقام پر گروائے، جہان یہ عمارت تعمیر ہوئی، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا، اسی طرح پتھر سے لدی ہوئی کئی ہزار کشتیان ڈبوئی گئین، اور بڑی محنت کے بعد گیارہ سو گز کا ایک قطعۂ زمین پانی سے نکلا جس پر ایک چبوترہ بنایا گیا، اور اس چبوترہ کے ایک کنارہ پر اس نے ایک عمارت بنوائی جس میں وہ عبادت کیا کرتا تھا، کشمیر کے حکام میں سے تین شخصوں نے اس چبوترے کے تین ضلعون پر عمارتین بنوائیں،

---

[۱] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۳۰۲۔

لیکن ان مین کوئی سلطان زین العابدین کی عمارت کا مضبوطی میں مقابلہ نہیں کرسکتی۔[۱]

فرشتہ نے بھی کسی قدر اختلاف کے ساتھ اس عمارت کا ذکر کیا ہے، اور اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس چبوترے پر باغ، مسجدین اور دوسرے مکانات بھی بنوائے گئے تھے، اور ان سب کے مجموعہ نے ایک ایسا دلکش منظر پیدا کردیا تھا، کہ فرشتہ کے الفاظ میں

"بدان نزاہت و لطافت و غرابت جائے کم خواہد بود، و فی الواقع بخوبی آن عمارت شاید کہ در کم جائے از عالم بودہ باشد"[۲]

فرشتہ نے سلطان زین العابدین کی ایک اور عمارت کا ذکر کیا ہے، جو بارہ منزلہ تھی، اور اس کی بعض منزلون پر پچاس حجرے، ایوان اور جھروکے تھے، اور باوجود اس وسعت اور بلندی کے پوری عمارت لکڑی کی تھی۔[۳]

اس کے بعد سکندر لودی نے نہایت کثرت سے مسجدین بنوائین، اور اپنی سلطنت کی تمام مسجدون میں قاری خطیب اور جاروب کش مقرر کئے، اور ان کی تنخواہیں مقرر کین۔[۴]

اس کے بعد بابر ۹۳۲ھ میں تخت نشین ہوا تو جو مسجدین اور خانقاہین جنگ کے زمانہ میں ویران ہوکر غیر مسلمون کے بیلون اور گھوڑون کا استھان بن گئی تھین ان کو نئے سرے سے تعمیر کروایا، اور ان میں موذن اور جاروب کش مقرر کئے، چنانچہ خافی خان ۹۳۴ھ کے واقعات کے سلسلہ میں لکھتا ہے،

"و مساجد و خانقاہ کہ جا بجا نگاہ اسپان و گاوان کافران گشتہ بود ہمہ را صاف و تعمیر نمودہ موذن و جاروب کش مقرر فرمود،"[۵]

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۴۶، ۴۷، ۴۸ [۲] فرشتہ جلد دوم ص ۳۳۵، ۳۴۳، [۳] فرشتہ جلد دوم ص ۳۳۵، [۴] ایضاً جلد اول ص ۱۰۶، ۱۰۷، [۵] خافی خان حصہ اول ص ۶۳،

اسی صدی میں سلطان ناصر الدین خلجی نے اس سلسلہ میں نہایت نام پیدا کیا، اور مالوہ میں اس کثرت سے عمارتیں تعمیر کروائیں کہ مالوہ کے محاصل سے سترہ کروڑ روپیے جو اس کو ملے تھے، اس میں سے پانچ کروڑ روپیے تعمیرات میں صرف ہو گئے، صاحب مآثر رحیمی نے اس کے ایک محل کا جو باغ فیروزہ میں تعمیر ہوا تھا، ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ

"در باغ فیروزہ قصرے طرح انداخت کہ سیاحان ربع مسکون نشان ندادہ اند"[1]

جہانگیر نے بھی اس کی بعض عمارتیں دیکھی ہیں اور تزک میں ان کا ذکر کیا ہے[2]

قلعہ رہتاس بھی جس کی بنیاد شیر شاہ نے ڈالی تھی، اور سلیم شاہ نے اس کی تکمیل کی، اسی صدی کی یادگار ہے، جہانگیر نے اس قلعہ کو دیکھا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے تمام دروازوں پر تعمیر کا خرچ ایک پتھر پر کندہ ہے جس کی مجموعی تعداد سولہ کروڑ دو لاکھ دام یعنی ہندوستان کے حساب سے ۴۰ لاکھ پچیس ہزار روپیہ ہے[3]

ان سب کے بعد ۹۶۳ھ سے اکبر کا دور سلطنت شروع ہوا اور اس دور کی تمدنی ترقیوں نے ہندوستان قدیم کو بالکل بدل کر ایک نیا ہندوستان پیدا کر دیا، چنانچہ خافی خان لکھتا ہے،

"ورسیدن صاحب کمالاں ایران و توران و روم و درجرگہ جان نثاران این سلسلۂ عالیہ داخل گردیدن وہندوستان راز زینت تمیز و تبدیل از وضع سابق دادن مخصوص عہد سلطنت سو تش آشیانی بود"[4]

اور اس دور ترقی کا جو اثر عمارت وغیرہ پر پڑا، ان کے متعلق خافی خان لکھتا ہے،

---

[1] مآثر رحیمی جلد اول ص ۱۶۱، [2] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۰۴

[3] تزک جہانگیری ص ۳۵، [4] خافی خان حصۂ اول ص ۱۰۹،

"دور تمام سوادِ اعظم ہندوستان عماراتِ عالی دلبا سہاے فاخرہ ومنازل خوش وبت تن و دلکش و دیگر ما تحتاج لذتِ زندگانی در عہدِ آن واضع آئین دولت وبانی نسق سلطنت رواج گرفت"[1]

لیکن اس تمدنی انقلاب کے زمانہ میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں، ان کی مختلف قسمیں تھیں،

۱۔ عام رعایا نے عمدۂ پاکیزہ اور بلند عمارتیں بنوائیں،

۲۔ خود اکبر نے شاندار عمارتیں تعمیر کروائیں،

۳۔ امرا نے اس میں بادشاہ کی تقلید کی، اور عمدہ عمارتیں تعمیر کروائیں،

لیکن تاریخوں میں پہلی قسم کی عمارتوں کا کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ خود اکبر اور اس کے امرا نے جو عمارتیں تعمیر کروائیں، ان میں مشہور عمارتوں کا ذکر مورخین نے کیا ہے، جن میں سب سے مشہور قلعہ آگرہ ہے، جس کو سب سے پہلے سکندر لودی نے پتھر اینٹ اور چونے کا تعمیر کرایا تھا، لیکن اکبر نے ۹۷۳ھ میں سنگِ سرخ سے اس کی تعمیر کروائی، اسکے اندر سنگ مرمر کی ایک مسجد اور دوسری عمارتیں بنوائیں، اور ۹۸۰ھ میں ۲۰ لاکھ روپیے کے خرچ سے تیار ہو گیا،[2] لیکن صاحبِ ماثر الامرا نے لکھا ہے کہ یہ قلعہ آٹھ سال میں قاسم خان میر بحر کے اہتمام میں سات کرور تنکہ یعنی ۳۵ لاکھ روپیہ کے صرف سے تیار ہوا، اور ۹۷۲ھ میں دریاے جمنا کے کنارے شہر کے مشرقی جانب پہلے قلعہ کی جگہ جو بوسیدہ ہو گیا تھا، اس کی بنیاد ڈالی گئی، اس کی دیوار کا عرض ۳۰ گز اور بنیاد سے کنگرہ تک کی بلندی ساٹھ گز ہے، سنگِ سرخ کو تراش کر باہم اس طرح جوڑا ہے کہ اس کی درز میں ایک بال کی بھی گنجایش نہیں ہے، اس کی بنیاد ہر جگہ پانی کی تہ تک پہنچائی گئی ہے، اور مزید احتیاط کے لئے آہنین حلقے لگا کر

---

[1] خافی خان حصہ اول ص ۲۳۶، [2] خافی خان حصہ اول ص ۱۶۵،

پتھروں کو ایک دوسرے پر بٹھایا ہے[1]،

اکبر نے جب الٰہ آباد کو آباد کیا تو وہاں بھی دریائے گنگا وجمنا کے درمیان ایک نہایت مضبوط قلعہ تعمیر کروایا،

اکبری دور کی ایک اور مشہور یادگار فتحپور سیکری کی مسجد ہے،

جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے:۔

"یکے از اعاظم آثار کہ در عہدِ دولت و زمانِ خلافت حضرت عرش آشیانی بظہور آمدہ این مسجد و روضہ است بمثل این مسجد در ہیچ بلادے نیست عمارتش ہمہ از سنگ در کمالِ صفا ساختہ نہادہ پنج لک روپیہ از خزانۂ عامرہ صرف شدہ[2]،

اس کے بعد اس کے تمام جزئیات کی تفصیل کی ہے،

مؤرخین نے اس دور کی انہی تین مشہور عمارتوں کا ذکر تصریح کے ساتھ کیا ہے، ان کے علاوہ اکبر نے اور جو عمارتیں تعمیر کروائیں، ان کا ذکر ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اجمالاً کیا ہے،

چنانچہ آئینِ عمارت میں لکھتا ہے:۔

"ازین رو گیتی خدیو پیوستہ عالی بنا طرح فرماید"،

لاہور کے متعلق لکھا ہے،

"چون چندگاہ پایۂ تخت شد والا کاخہا برافراختہ آمد"[3]

اکبر کے علاوہ اس دور میں امرائے اکبری نے بھی متعدد عمارتیں بنوائیں، چنانچہ اعتماد خاں نے آگرہ سے چھ کوس کے فاصلہ پر اعتماد پور کے نام سے ایک گاؤں آباد کیا، اور اس میں ایک تالاب

---

[1] مآثر الامراء حصہ سوم ص ۷۳، [2] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۴۶،

[3] آئین اکبری جلد دوم ص ۱۵۲،

ایک عمارت اور اپنا مقبرہ بنوایا،[۱] آج بھی یہ مقبرہ موجود ہے، اور اعتماد الدولہ کے نام سے مشہور ہے،

خداوند خان دکنی نے قصبہ روہنکھیرہ میں ایک مسجد بنوائی جس کی نسبت صاحب مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ باوجود استداد زمانہ کے اب تک شکست و ریخت سے محفوظ ہے،[۲]

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس دور میں بعض ہندو امراء نے بھی مسجدیں بنوائیں، چنانچہ راجہ بھگونت داس نے لاہور میں ایک جامع مسجد بنوائی جس میں اکثر لوگ نماز جمعہ پڑھتے تھے،[۳]

شاہ قلی خان محرم نے نارنول میں توطن اختیار کیا، تو وہاں بہت سی شاندار عمارتیں بنوائیں، اور ایک تالاب کھدوایا،[۴]

صادق محمد خان ہروی نے دھولپور کو جو آگرہ سے ۲۰ کوس کے فاصلہ پر ہے اپنا وطن بنایا تو وہاں ایک سرائے، ایک عمارت اور ایک شاندار مقبرہ بنوایا، اور آس پاس کے دیہات کو آباد کیا،[۵]

اسلامی دور میں فن تعمیر کی ترقی نے کتبہ نویسی کا ایک مستقل فن پیدا کر دیا تھا، اور دور اکبری میں میر معصوم بھکری نے اس میں خاص نام پیدا کیا تھا، وہ نہایت خوشخط کتبہ نویس تھے، اور ہندوستان سے لیکر تبریز و اصفہان کے راستوں اور منزلوں میں ہر جگہ مسجدوں اور عمارتوں کے پتھروں پر اپنے اشعار کندہ کئے تھے، قلعۂ آگرہ اور جامع مسجد فتحپور کے دروازے کے کتبے انہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، کتبہ نویسی کے ساتھ انھوں نے نیک کاموں کے لئے بہت سی عمارتیں بھی بنوائیں، بالخصوص شہر سکھر میں جو ان کا مولد تھا،

---

[۱] مآثر الامراء، جلد اول ص ۵۰۹ [۲] ایضاً جلد اول ص ۶۵۹ [۳] ایضاً جلد دوم ص ۱۳۱ [۴] ایضاً ص ۶۰۲ [۵] ایضاً ۶۲۹،

اس قسم کی بہ کثرت عمارتیں تعمیر کرائیں، پنجاب میں بھکر کے گرد جو دریا واقع تھا، اس میں ایک عمارت ستیا سر نامی بنوائی جس کی نسبت صاحب مآثر الامرا لکھتے ہیں،

"از نوادر روئے زمین است، گنبد دریائی تاریخ آنست"[1]

اسی زمانہ میں یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں قلعہ ارک، عید گاہِ قدیم، اور گلبرگہ میں شیخ محمد سراج جنیدی کا روضہ اور اس کے منارے بنوائے[2]

اس کے بعد جہانگیر کا دورِ حکومت شروع ہوا جو اگرچہ تعمیری حیثیت سے کچھ زیادہ شہرت نہیں رکھتا، تاہم اس دور کی سب سے زیادہ مشہور عمارت سکندرہ یعنی اکبر کا مقبرہ ہے، جس کو جہانگیر نے ۱۵ لاکھ کے صرف سے تعمیر کروایا تھا، اس کے علاوہ متفرق عمارتیں ہیں، جو اس نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں تعمیر کروائیں، مثلاً اجمیر میں ایک تالاب اناساگر نامی تھا، جہانگیر نے اس کے کنارے متعدد عمارتیں بنوائی تھیں، اور شاہجہان نے اجمیر کے سفر میں انہی میں قیام کیا تھا[3]

ایک سفر میں باباحسن ابدال کے پل اور اس کے پاس کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے زر وزن سے پانچ ہزار روپے دیئے، اور حکم دیا کہ پل اور عمارتیں نہایت مستحکم طور پر بنوائی جائیں،[4]

ایک بار سیر و شکار کے موقع پر خواجہ جہان کو حکم دیا کہ ایک ایسی عمارت تیار کروائے جو اس کے ٹھہرنے کے قابل ہو، چنانچہ خواجہ جہان نے تین مہینے میں ایک عالی شان عمارت تعمیر کروادی، جو جہانگیر کو نہایت پسند آئی،[5]

جہانگیری دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں نئی عمارتوں کے ساتھ شاہانِ ماضیہ کی

---

[1] مآثر الامرا حصہ سوم ص ۳۲۸ - [2] بساتین السلاطین ص ۲۲، ۲۳ [3] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۸۰

[4] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۷۷، [5] ایضاً ۹۳ -

عمارتوں کی مرمت واصلاح بھی ہوئی مثلاً مانڈو میں سلاطینِ غوریہ اور خلجیہ کے جو آثار باقی تھے، جہانگیر نے ان کی مرمت کروائی، اور وہاں جانے سے پہلے عبدالکریم معموری کو حکم دیا کہ وہاں جاکر کچھ نئی عمارتیں بنوائے اور سلاطینِ ماضیہ کی عمارتوں کی مرمت کروائے۔[1] اس حکم کے مطابق اس نے چند روز میں بعض قدیم عمارتوں کی مرمت کرائی، اور بعض مقامات پر نئی عمارتیں بنوائیں، تقریباً تین لاکھ روپیہ صرف ہوا، اور نہایت دلکش عمارتیں تیار ہوئیں، چنانچہ خود جہانگیر لکھتا ہے:

"در ہیچ جا بدان نزاہت و لطافت عمارتے معلوم نیست باپستے کہ این عمارت رفیع در شہرہائے رفیع کہ قابلیت نزول اجلال می داشت واقع می بود۔[2]"

صاحبِ مآثر الامرا لکھتے ہیں:

"و دران سال در مانڈو بحکم بادشاہی عمارات دلکش ترتیب یافتہ نشیمنہائے سلاطین ماضیہ ترمیم پذیرفت۔[3]"

گجرات میں کانکریہ ایک تال ہے جس کو سلطان احمد بانی شہر احمد آباد کے نواسے قطب الدین محمد نے بنایا تھا، اور اس تال کے درمیان ایک باغیچہ اور ایک عمارت تعمیر کروائی تھی، اور آمد و رفت کے لئے تال کے کنارے سے اس عمارت تک ایک پل بندھوایا تھا۔ چونکہ امتدادِ زمانہ سے یہ عمارت گر پڑ گئی تھی، اس لئے جب جہانگیر احمد آباد کی طرف روانہ ہوا تو صفی خان بخشی گجرات نے شاہی خزانہ سے اس کی مرمت کروائی، اور ایک جدید عمارت جس کا رخ تال کی طرف تھا، تعمیر کروائی، اور ایک باغیچہ لگوایا۔[4]

احمد آباد میں سلاطین گجرات نے جو عمارتیں بنوائی تھیں، چونکہ وہ بالکل ویران ہوگئی تھیں،

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۱۳۸، [2] ایضاً ص ۱۸۰، [3] مآثر الامراء جلد دوم ص ۵۳۸ [4] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۰۷۔

اس لئے جہانگیر کے زمانہ میں مقرب خان نے ان کو نئے سرے سے بنوایا، اور اس کے ساتھ دوسری ضروری عمارتیں بھی تعمیر کروائیں، چنانچہ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے،

"منازل سلاطین گجرات کہ در درون بدر واقع بود درین پنجاہ شصت سال خراب شدہ واثرے از آنہا نماندہ نمایئہ جمعے از بندہا اکہ بحکومت این ملک تعین بودند، عمارات ساختہ اند درین ولا کہ از ماندو متوجہ احمد آباد شدم مقرب خان منازل قدیم را از سر نو تعمیر نمودہ نشیمنہائے دیگر کہ ضروری بود مثل جھروکہ عام وخاص وغیرہ ترتیب داد[۱]،

جہانگیر نے کشمیر کے راستوں اور منزلوں میں بھی بہت سے مکانات بنوائے تاکہ خیمہ وغیرہ کی ضرورت نہ ہو، چنانچہ تزک میں منزل نور آباد کے متعلق لکھتا ہے،

" از کھاٹ بھٹ تا کشمیر بدستوریکہ تا پیر پنجال درراہ منزل بمنزل خانہا ونشیمنہا ساختہ اند درین راہ نیز اساس یافتہ واحتیاج خیمہ وسائر رخوت فراشخانہ احتیاج نیست[۲]"

کشمیر میں ایک چشمہ آصف آباد تھا، جو مچھی بھون کے نام سے مشہور تھا، اس جگہ یمین الدولہ نے جہانگیر کے حکم سے بہت سی عمارتیں، حوض، نہر اور باغات تیار کرائے تھے، اور شاہجہان نے کشمیر کے سفر میں اسی جگہ قیام کیا تھا[۳]، جہانگیر نے کشمیر کی رونق وآبادی بڑھانے کے لئے جو عمارتیں تعمیر کرائیں اس کا اندازہ بادشاہ نامہ کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے،

"در زمان حضرت جنت مکانی کہ در اواخر سلطنت پنج مرتبہ تشریف فرمودند، چون توجہ والا مصروف تربیت این سرزمین نشاط انگیز باز ساختن عمارات واصلاح درختان میوہ دار بیوند وجز آن داشتند از آنچہ بود بسیار بیش شد[۴]"

---

[۱] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۱۲ [۲] ایضاً مطبوعہ نولکشور ص ۳۰۶ [۳] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۵۰، [۴] ایضاً ص ۵۵،

جہانگیر کا یہی تعمیری ذوق ہے، جو اس کو سلاطینِ ماضیہ کی عمارتوں کی سیر پر آمادہ کرتا ہے، اور وہ نہایت ژرف نگاہی سے ان کو دیکھتا ہے، اور ان کے ایک ایک جزئیات کی تفصیل کرتا ہے، چنانچہ تزک میں اس نے اس قسم کی متعدد عمارتوں کا تذکرہ کیا ہے، ایک موقع پر لکھتا ہے،

"مانڈو مدتوں اس ملک کے بادشاہوں کا پایہ تخت رہا ہے، اور گذشتہ بادشاہوں کے آثار و عمارات وہاں اب تک موجود ہیں، اور ان کو اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے، میں ان بادشاہوں کی عمارت کی سیر کے لئے روانہ ہوا، اور پہلے مسجد جامع میں جو سلطان ہوشنگ غوری کی تعمیر کردہ ہے، آیا، نہایت عمدہ عمارت ہے، اور تمام پتھر تراش کر بنائی گئی ہے، اور باوجودیکہ ایک سو اسی سال اس کی تعمیر پر گذر چکا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آج ہی معمار نے اس کی تعمیر کا کام ختم کیا ہے، اسکے بعد حکام خلجیہ کے مقبرے میں آیا،[۱]"

اسی طرح گجرات میں جامع مسجد کے دیکھنے کے لئے گیا ہے، اور اس کے ایک ایک جزئیات کی تفصیل کی ہے اور لکھا ہے کہ

"این مسجد از آثار سلطان احمد بانئ شہر احمد آباد است، والحق این مسجد بناے است نہایت عالی،[۲]"

تیموری دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس دور سے ہندوستان میں ایک جدید طرز تعمیر کا رواج ہوا، اور وسیع اور پر فضا عمارتیں تعمیر ہوئیں، جہانگیر اگرچہ ہندوستان کا دلدادہ ہے، اور یہاں کی بہت سی چیزوں کو پسند کرتا ہے، تاہم اس کو ہندوانہ طرز کی تنگ و تاریک عمارتیں پسند نہیں، بلکہ وہ عمارات میں وسعت اور فضائیت تلاش کرتا ہے، چنانچہ تزک میں ایک

[۱] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۱۹۱ [۲] ایضاً ص ۲۱۲، ۲۱۳

موقع پر لکھتا ہے،

"چون منازل و عمارات درون حصار بروش ہند وان اساس یافتہ و خانہا اپنے ہوا دکم قفا ساختہ اند دلنشین نیفتاد و خاطر نیز تبوقف راضی نشد، جائے بنظر در آمد کہ یکے از نوکران رستم خان متصل بحصار قلعہ ساختہ باغچہ دلنشینے مشرف بہ صحرا خالی از فضائے وہوائے نیست[۱]"

جہانگیر کے زمانہ میں امرا اور وابستگان دولت نے بھی بہت سی عمارتیں بنوائیں، چنانچہ ہلال نامی خواجہ سرانے جو ابتدا میں جہانگیر کا میر تزک تھا، قصبہ رنگتہ میں جو آگرہ سے ۶ کوس کے فاصلہ پر واقع ہے، (یہ قصبہ اس کی جاگیر میں تھا) ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کیا، اور ایک پختہ سرائے بنوائی، اور اس کا نام ہلال آباد رکھا، اس نے آگرہ میں مدار دروازہ کی جانب بھی ایک بلند اور عمدہ عمارت بنوائی[۲]، امرائے جہانگیری واکبری میں شیخ فرید مرتضیٰ خان بخاری نے جو نہایت فیاض تھے،

۱- احمد آباد میں ایک محلہ آباد کیا جس کا نام بخارا تھا،

۲- شاہ وجیہ الدین گجراتی کا روضہ اور مسجد تعمیر کیا،

۳- دلی میں فرید آباد کو آباد کیا، اور اس میں تالاب اور عمارتیں اپنی یادگار چھوڑیں،

۴- لاہور میں ایک محلہ آباد کیا،

۵- لاہور کے چوک میں ایک بڑا حمام بنوایا،[۳]

اس عہد میں ملک عنبر نے موضع کھرکی میں جو دولت آباد یعنی اورنگ آباد سے پانچ کے فاصلہ پر واقع تھا، تالاب، باغ اور بہت سی بلند عمارتیں تعمیر کروائیں، اور اس طرح اسکی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا،[۴]

---

[۱] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۵۸ [۲] مآثر الامراء حصہ دوم ص ۴۰۷ [۳] ایضاً جلد دوم ص ۶۳۹

[۴] ایضاً حصہ دوم ص ۹۰

جہانگیر کے بعد شاہجہان کا دورِ حکومت شروع ہوا، جو تعمیری حیثیت سے خاص طور پر امتیاز رکھتا ہے، اس دور میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں، ان میں تاج محل جو شاہ جہان کی محبوب بیوی ارجمند بانو بیگم المخاطب بہ ممتاز محل کا مقبرہ ہے، نہایت مشہور ہے، ممتاز محل نے ۱۰۴۰ھ میں بہ مقام برہان پور انتقال کیا تھا، اور اس کی لاش وہیں باغ زین آباد میں بطور امانت کے دفن کی گئی تھی، اس کے ۶ مہینے کے بعد شاہزادہ محمد شجاع وزیر خان اور ستی خانم صدر النساء اس کو اکبرآباد میں لائے اور دریائے جمنا کے جنوبی کنارے پر دفن کیا، اور وہیں یہ مقبرہ مکرمت خان کے اہتمام میں ۱۲ سال کی مدت میں پچاس لاکھ روپیہ کے صرف سے تعمیر کیا گیا، اور حویلی اکبرآباد اور پرگنہ نگرچند کے ۳۰ گانون جن کی مالگذاری ایک لاکھ روپیہ تھی، اور مقبرہ کے آس پاس کی دوکانیں اور عمارتیں جن کا کرایہ دو لاکھ تھا، اس کے مصارف کے لئے وقف کئے گئے[۱]،

شاہجہانی عہد کی مشہور عمارتوں میں دوسرا درجہ قلعہ شاہجہان آباد کا ہے، جو ساٹھ لاکھ روپیہ کے صرف سے آٹھ سال کی مدت میں تیار ہوا، تعمیر کا کام پہلے غیرت خان کے اہتمام میں شروع ہوا، پھر الہ وردی خان کی داروغگی میں اس کی تعمیر ہوئی، اور مکرمت خان کے اہتمام میں تکمیل کو پہنچا[۲]،

اس قلعہ اور شہر کی فصیل کی تیاری کے بعد قلعہ کے متصل شاہجہان نے ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کا حکم دیا، جس کی نظیر ابتدائے اسلام سے ہندوستان میں موجود نہ تھی، یہ مسجد[۳] دس لاکھ روپیہ کے صرف سے ۶ سال کی مدت میں تین چار امرا یعنی خلیل اللہ خان، جعفر خان، سعد اللہ خان اور روح اللہ خان کے اہتمام میں تعمیر ہوئی،

ع؎ قبلۂ حاجات آمد مسجد شاہ جہان

---

[۱] مآثر الامرار جلد اول ص ۱۶۰ و خافی خان حصہ اول ص ۵۹۶ [۲] خافی خان حصہ اول ص ۲۸۱،

اس کی تکمیل کی تاریخ ہے[۱]

اس قسم کی دوسری مسجد آگرہ کی جامع مسجد ہے، جو قلعہ اکبرآباد کے متصل ۲ لاکھ روپیہ کے صرف سے سات سال کی مدت میں سنگ سرخ سے تعمیر کی گئی[۲]

شاہجہان نے خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ کے روضہ کی زیارت کی تو روضے کے مغربی جانب ایک نہایت عمدہ مسجد سنگ مرمر کی بنوائی[۳]

اکبر کے زمانہ سے لیکر جہانگیر کے زمانہ تک قلعہ اکبرآباد کے جھروکہ دولت خانہ خاص و عام کے سامنے کوئی ایسا ایوان نہ تھا، کہ اس میں تمام متوسلین سلطنت بیٹھکر بارش اور دھوپ سے محفوظ رہ سکیں، بلکہ اس کے لئے کپڑے کا ایک ایوان کھڑا کر دیتے تھے، اور اسی میں تمام متوسلین سلطنت بیٹھتے تھے، لیکن شاہجہان کے حکم سے اس کے سامنے ۷۰ گز کا لمبا اور ۲۲ گز کا چوڑا ایک ایوان ۴۰ دن کی مدت میں تیار ہوا، اور اس کے تین طرف چاندی کے کٹھرے بنوائے گئے، اور ان میں تمام متوسلین سلطنت کے لئے جیسا کہ بادشاہ نامہ میں بہ تفصیل مذکور ہے حسب مراتب جگہیں مقرر کی گئیں، طالب کلیم نے یہ رباعی اسی ایوان کے وصف میں لکھی ہے،

این تازہ بنا کہ عرش ہمسایۂ اوست	رفعت حرفے ز تربیت پایۂ اوست
باغیست کہ ہر ستون سرش سر دست	کا سایش خاص و عام در سایۂ دست

شاہجہان نے اسی قسم کا ایک ایوان دارالسلطنت لاہور اور برہان پور[۴] میں بھی جھروکہ دولت خانہ خاص و عام کے سامنے بنوایا، اور عمارات شاہ برج کی تکمیل کرائی، جس کے تفصیلی حالات

[۱] خافی خان حصہ اول ص ۴۹۵، [۲] ایضاً صفحہ ۷۲۸،

[۳] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۸۰ [۴] خافی خان حصہ اول ص ۴۰۴،

بادشاہ نامہ میں مذکور ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ہر قسم کے نقش و نگار کے ساتھ مختلف شہروں اور ان کے باغوں کی تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں۔[1]

لاہور میں دولت خانہ خاص اور آرام گاہ دولت خانہ عالی کی جو عمارتیں جہانگیر نے تعمیر کروائی تھیں چونکہ وہ شاہجہان کو پسند نہ تھیں، اس لیے زمانہ سفر کشمیر میں ان کی جگہ نئی عمارتیں بنوائیں، اور ان کا نقشہ تیار کر کے وزیر خان اور عمارات شاہی کے دوسرے عہدیداروں کے سپرد کیا، اور حکم دیا کہ کشمیر کی واپسی کے زمانہ تک تمام عمارتیں مکمل ہو جائیں۔[2] کشمیر میں ایک موضع کا نام وہ اچول تھا، جہاں جہانگیر نے دولت خانہ خاص تعمیر کروایا تھا، لیکن یہ عمارت پرانی ہو گئی تھی، اور اس کا نقشہ بھی شاہجہان کے پسند کے موافق نہ تھا، اس لیے اثنائے سفر کشمیر میں حکم دیا کہ خاص شاہی قیام کے لیے دوسری عمارتیں جن میں آبشار، اور حوض ہوں تعمیر کرائی جائیں، اور ان کے علاوہ دولت خانہ خاص و عام بھی تعمیر ہو۔ چنانچہ اس جگہ پہلے سے بہتر عمارتیں تعمیر ہو گئیں۔[3]

شاہان تیموریہ کو شکار کا نہایت شوق تھا، اور اس غرض سے خاص خاص مقامات شکار کے لیے مخصوص کر لیے گئے تھے، اور وہاں کئی کئی دن قیام ہوتا تھا، اس لیے ان شکار گاہوں میں قیام کرنے کے لیے لازمی طور پر عمارتیں تعمیر کروانی پڑتی تھیں، دارالسلطنت لاہور کے اطراف میں ایک شکار گاہ تھی جس کا اصلی نام جہانگیر آباد تھا، لیکن ہرن منارہ کے نام سے مشہور تھی، جہانگیر نے اپنے عہد حکومت میں اس جگہ ایک عمارت تعمیر کروائی تھی، لیکن وہ شاہجہان کو پسند نہ آئی اسلئے حکم دیا کہ اس جگہ دوسری عمارت تعمیر کروائی جائے، چنانچہ ایک سال میں اسی ہزار روپیہ کے صرف سے نہایت عمدہ عمارت

[1] بادشاہ نامہ حصہ اول ۲۲۲ تا ۲۲۵ [2] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۱۲، ۱۳۔ [3] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۵۱

تیار ہو گئی،[۱]

دار السلطنت اکبر آباد کے پاس ایک او ر شکار گاہ باری نامی تھی، جس کے تالاب کے دو سال کی مدت میں ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ کے صرف سے شاہ جہان نے عمارتین تعمیر کروائی تھین، چونکہ یہ عمارتین سنگ سرخ سے تعمیر ہوئی تھین، اس لئے ایک شکار کے سفر میں شاہجہان نے ان میں قیام کیا تو ان کا نام لال محل رکھا،[۲]

اودے پور میں رانا اودے سنگھ نے پہاڑ کے اوپر اور تالاب بجولہ اور تالاب اودے ساگر کے درمیان جو عمارتین تعمیر کرائی تھین، چونکہ وہ بالکل ہندوون کے طرز تعمیر کے مطابق تیار ہوئی تھین، اس لئے وہ شاہجہان کو پسند نہ تھین، اس کے ساتھ بعض لڑائیون میں ویران بھی ہو گئی تھین، اس لئے شاہجہان کے حکم سے ان کھنڈرون کی جگہ تیموری طرز تعمیر کے مطابق نئی عمارتین تعمیر ہوئین، اور پہاڑ کے اوپر بھی تال کے سامنے عمدہ عمارتین بنوائی گئین، اور امراء و متوسلین نے بھی دولت خانہ کے ارد گرد بلند عمارتین بنوائین،[۳] اور اس طرح گویا ایک پورا شہر جدید طرز تعمیر کے مطابق آباد ہو گیا،

اس دور میں ایرانی طرز تعمیر کے مطابق پشاور میں جو عمارتین تیار ہوئی تھیں، وہ اگرچہ اثناے سفر کابل میں شاہ جہان کو پسند نہ آئیں، لیکن علی مردان خان نے اصفہانی طرز تعمیر کے مطابق بازار میں جو مسقف راستے بنوائے تھے، اور بازار کے چارون طرف کو ثمن بغدادی کے طریقے پر آراستہ کیا تھا، وہ اس کو نہایت پسند آئے، اس لئے ان کو دیکھا تو حکم دیا کہ اس کا نقشہ مکرمت خان ناظم دہلی کے پاس جس کے اہتمام میں شاہجہان آباد کا نو تعمیر قلعہ بن رہا تھا، روانہ کیا جائے،[۴]

---

۱ بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۱۴۳ ۲ ایضاً ۲۴۳ ۳ عمل صالح جلد اول ص ۴۴، ۴ خافی خان حصہ اول ص ۲۲۰،

شاہ جہانی عہد میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں، ان کے مصارف کی تعداد ہمارے مورخین نے ڈھائی کروڑ بتائی ہے، اور ان کی تقسیم اس طرح کی ہے،

تاج گنج	۵۰ لاکھ
آگرہ کی دوسری عمارتیں	۵۲ لاکھ
قلعہ شاہجہان آباد	۵۰ لاکھ
جامع مسجد دہلی	۱۰ لاکھ
عمارات و باغاتِ لاہور	۵۰ لاکھ
عماراتِ کابل	۱۲ لاکھ
کشمیر کی سیرگاہیں	۸ لاکھ
قندھار کی عمارتیں	۸ لاکھ
احمد آباد اور اجمیر وغیرہ کی عمارتیں[1]	۱۰ لاکھ

بادشاہ نامہ کے مصنف نے اگرچہ مجموعی تعداد یہی رکھی ہے، لیکن تقسیم میں کسی قدر اختلاف کیا ہے، اس کی تصریح کے مطابق اس کی تقسیم یہ ہے،

عماراتِ آگرہ	ایک کرور دس لاکھ	اس میں سے ساٹھ لاکھ روپئے، اندرونِ قلعہ کی مسجد پر جو سنگ مرمر کی ہے اور دولت خانہ اور دوسری عمارتوں اور باغوں پر صرف ہوئے، اور پچاس لاکھ تاج محل پر،

---

[1] مآثر الامراء جلد دوم ص ۸۱۶۔

عماراتِ شاہجہان آباد ٭ پچاس لاکھ جامع مسجد کی تعمیر کے مصارف اس سے الگ ہیں،

عماراتِ و باغاتِ لاہور ٭ ″

عماراتِ کابل ٭ ۱۲- لاکھ

عماراتِ کشمیر ٭ ۸- لاکھ

حصار قندھار و بست زمیند اور ٭ ۸- لاکھ

عماراتِ اجمیر و احمد آباد،[ل] ٭ ۱۲- لاکھ

لیکن اکثر یورپین مورخ اور یورپین سیاح اس تعداد کو صحیح نہیں سمجھتے اور سلاطین تیموریہ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے معماروں اور مزدوروں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا، اور ان سے بطور بیگار کے کام لیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں غلہ کی ارزانی کی وجہ سے معماروں اور مزدوروں کی شرح اجرت بہت کم تھی اور غالبًا تاریخوں اور کتبوں میں صرف معماروں اور مزدوروں اور مصالح کے اخراجات کی تعداد درج ہے، ان کے علاوہ جو مصارف تھے، وہ ان سے الگ ہیں، مثلاً تعمیرات کے اسٹاف یعنی اعلیٰ عہدہ داروں کی تنخواہ اس سے الگ ہے، پتھر شاہی کانوں سے لائے جاتے تھے، لکڑی بھی شاہی جنگلوں سے آتی تھی، بلور اور جواہرات کا بار خزانہ عامرہ پر تھا، لیکن بہرحال اگر مصارف کی تعداد اس سے زیادہ ہو تو اس کو تسلیم کر لینے میں ہمارا کوئی ہرج نہیں بلکہ اس سے سلاطینِ تیموریہ کی بلند حوصلگی اور فیاضی کا مزید ثبوت ملتا ہے،

امراء کی عمارتیں ٭ شاہجہان کے علاوہ امرائے شاہجہانی میں جن لوگوں نے مختلف مقامات میں عمدہ

ل بادشاہ نامہ حصہ دوم ص ۱۴۸،

عمارتیں بنوائیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

اعتقاد خان | اس نے آگرہ میں جدید وضع کی ایک حویلی تعمیر کروائی، جو وہاں کی اور حویلیوں سے بہتر تھی، مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے آگرہ میں تین شخصوں یعنی خواجہ جہان جہانگیری، خواجہ دسی دیوان سلطان پرویز اور اعتقاد خان نے جدید وضع کی حویلیوں کی بنیاد ڈالی، لیکن ان میں سب سے بہتر حویلی اعتقاد خان کی تھی، چونکہ وہ شاہجہان کو پسند آئی، اس لئے اعتقاد خان نے بطور پیشکش کے اس کو شاہجہان کی نذر کیا، اور بعد کو شاہجہان نے امیر الامراء علی مردان خان کو بطور انعام کے دیدیا۔[1]

احمد نیازی خان | نیازی بڑا فیاض امیر تھا، اس کے باپ نے اشٹی برار میں توطن اختیار کیا تھا، اور وہیں اس کی قبر تھی، اس تعلق سے احمد نیازی خان نے اس قصبہ کی آبادی بڑھانے کی کوشش کی اور ایک باغ لگوایا، ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی اور اپنے باپ کا مقبرہ بنوایا۔[2]

شاہجہانی عہد میں بھرجی برم ساہ، ایک امیر تھا، جو بگلانہ کا زمیندار تھا، جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے لڑکے برم شاہ کو شاہ جہان نے مسلمان کر کے دولت مند خان کا خطاب دیا، اور پرگنہ پونار خاندیس کو بطور انعام کے مرحمت کیا، اس نے اس قصبہ میں نہایت پر تکلف عمارتیں بنوائیں، جن کے آثار صاحب مآثر الامراء کے زمانہ تک باقی تھے۔[3]

خان دوران نصرت جنگ | دکن کا صوبہ دار تھا، اس نے دکن کا انتظام اس خوبی سے کیا کہ قدیم نظام بالکل بدل گیا، اور ملک کی آبادی ترقی کر گئی، چنانچہ برہانپور کی تمام

---

[1] مآثر الامراء جلد اول ص ۱۸۲ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۸۱ [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۴۱

اسی کے دور کی یادگارین ہیں، صاحب مآثر الامراء لکھتے ہیں،

"بیشتر عمارات عمدہ برہانپور در وقت او شدہ متعددی زمین آباد کنانیدی از دست

داز سر دیبج تا برہانپور بدہ کردہی سرا ہا ساختہ اوست[۱]"

رشید خان انصاری | بڑا فیاض امیر تھا، اس نے برہان پور کی عید گاہ کی توسیع کرائی اور اس میں نہر کا پانی لایا[۲]،

سرفراز خان دکنی | مضافات ناندیر میں پرگنہ لوہ گانون اس کی جاگیر میں تھا، اس نے اس پرگنہ کے ایک گانون بولی نامی میں توطن اختیار کیا، اور اس میں ایک مسجد اور دوسری بلند عمارتین بنوائین، جن کی وجہ سے اس گانون کو دوسرے قصبات پر تفوق حاصل ہوگیا[۳]،

وزیر خان حکیم علیم الدین | پنجاب کے ایک قصبہ چنیوٹ میں پیدا ہوا تھا، ۱۰۵۰ھ میں انتقال کیا، اور نہایت کثرت سے عمارتین اپنی یادگار چھوڑین، چنانچہ لاہور میں حمام، بازار اور متعدد حویلیان اور ایک جامع مسجد بنوائی، لاہور کے پاس وزیر آباد کے نام سے، ایک قصبہ آباد کیا، اور قصبہ چنیوٹ کے گرد ایک پختہ فصیل قائم کی، اور بہت سی پختہ عمارتین بنواکر وہان کے لوگون کو دین، بازارون مین سڑکین، دوکانین، مسجدین، مدرسے شفاخانے، کنوئین، اور حوض بنواکر وہان کے لوگون پر وقف کئے، غرض صاحب مآثر الامرا کے الفاظ ہیں:-

"دنوے وطن را آراست کہ این دولت بہیچ امیرے دیگر در ہندوستان میسر نشدہ[۴]"

اسلام خان | اس کو میر محمد نعمان رحمہ اللہ کے ساتھ خاص عقیدت تھی، اس لیئے ان کے مزار کے پاس ۱۰۵۰ھ میں ایک عظیم الشان مسجد بنوائی، کشمیر کی عید گاہ بھی

---

[۱] مآثر الامرا حصہ اول ص ۵۶، ۵۷، [۲] مآثر الامرا ج ۲ ص ۲۵۰، [۳] ایضاً ص ۱۱۴، [۴] مآثر الامرا حصہ سوم ص ۹۳۵/۹۳۶

اسی کی بنوائی ہوئی ہے[1]

عالمگیری دور کی عمارتیں | شاہجہان کے بعد عالمگیر کا دورِ حکومت آیا جو سادگی اور کفایت شعاری کا دور ہے، اس لیے اس دور میں جدید عمارتیں بہت کم تعمیر ہوئیں، صرف ضروری عمارتوں کی تعمیر اور مرمت و اصلاح کی گئی، مثلاً شہر بیجاپور اور اس کے آس پاس کی آبادیاں چونکہ مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے بالکل ویران ہو گئی تھیں اس لئے عالمگیر نے وہاں چھاونی قائم کی اور عمارتیں بنوائیں[2] قلعہ ستارہ اور قلعہ پرلی میں شاہان بیجاپور نے جو مشہور مسجدیں تعمیر کی تھیں، جو نکہ ہندوؤں کی دست برد سے بالکل ویران ہو گئی تھیں، اس لئے عالمگیر نے دوبارہ ان کی تعمیر کا حکم دیا[3] اسی طرح جلوس کے پہلے ہی سال جب اس کو اطلاع ملی کہ بہت سی مسجدیں اور عبادتگاہیں بے رونق اور ویران ہو گئی ہیں، تو حکم دیا کہ ممالک محروسہ میں جہاں کہیں اس قسم کی مسجدیں پائی جائیں، ان کی ترمیم و تجدید کی جائے، اور امام و موذن اور نوکر اور فرش اور روشنی کے مصارف مقرر کئے جائیں[4] چنانچہ اس حکم کے موافق احمد آباد کی بہت سی مسجدوں کی مرمت ہوئی[5]

سلاطین تیموریہ کے عہد میں جدید عمارتوں کی تعمیر کا ذوق لازمۂ امارت ہو گیا تھا، لیکن عالمگیر نے شرعی حیثیت سے عہد قدیم کے تمام امیرانہ و شاہانہ ساز و سامان کی اصلاح کی اور اپنے جلوس کے اکیسویں سال حکم دیا کہ

(۱) اہلِ قلم نقرئی دوات کے بجائے چینی و سنگ ملمع کی دواتیں استعمال کریں،

(۲) طلائی و نقرئی عود سوز دربار خاص و عام میں نہ سلگائے جائیں،

---

[1] مآثر الامراء حصہ اول ص ۲۱۹، ۲۲۰ [2] خافی خان حصہ دوم ص ۳۰۱ [3] ایضاً ص ۴۷۲، [4] عالمگیر نامہ جلد دوم ص ۱۰۸۵ [5] مرآۃ احمدی جلد دوم ص ۷،

(۳) انعامات کی رقمین بجائے خوانہائے نقرہ کے سپر مین رکھ کر ملاحظۂ عالی میں لائی جائین،

(۴) خلعت خانہ مین بجائے سنرق کپڑون کے کلابتونی کپڑے استعمال کئے جائین،

اور انہی احکام کے سلسلہ میں امراء کے تعمیری ذوق پر بھی پابندی عائد کی، اور حکم دیا کہ چہار صدی سے بالاتر امراء بلا حکم شاہی جدید عمارتون کے تعمیر کی جرات نہ کرین[۵]

چہار صدی سے بالاتر امراء کی تخصیص سے ثابت ہوتا ہے کہ بڑے بڑے امراء جو عمارتین تعمیر کرواتے تھے، اُن سے صرف نام ونمود کا اظہار مقصود ہوتا تھا، جو شرعی حیثیت سے ناپسندیدہ امر تھا، اس لئے عالمگیر نے ان پر پابندی عائد کر دی تاکہ غیر ضروری عمارتون کے بجائے ضروری عمارتین تعمیر ہون، لیکن باین ہمہ عالمگیری دور بھی امراء کی تعمیرات سے خالی نہین ہے، اور اس دور میں بھی متعدد امراء نے عمارتین تعمیر کروائی ہیں، چنانچہ ان کے نام حسب ذیل ہیں،

خانزمان اس نے برار کی صوبہ داری کے زمانہ مین موضع ہرم میں توطن اختیار کر لیا تھا، اور اس کا نام خانزمان نگر رکھا تھا، اور یہان بہت سی شاندار عمارتین بنوائی تھین جن کے آثار صاحب مآثر الامراء کے زمانے تک باقی تھے، اس نے برہان پور میں بھی ایک حویلی بنوائی تھی،[۲]

عبدالنبی عالمگیر کے زمانہ میں متھرا کا فوجدار تھا، وہان ایک مسجد بنوائی تھی،[۳] عالمگیر کے بعد اگرچہ تنزل کا دور شروع ہو گیا، تاہم اس دور میں بھی امراء کا ذوق تعمیر قائم رہا، اور انھون نے متعدد عمارتیں بنوائین، چنانچہ امرائے محمد شاہی میں امین الدولہ امین الدین خان سنبھلی نے اپنے وطن میں نہایت عمدہ عمارت، باغ اور سرائے بنوائی،[۴] عضد الدولہ عوض خان

---

۵ ترجمہ مآثر عالمگیری ص ۱۱۱، ۲ مآثر الامراء حصہ اول ص ۷۹۲، ۳ ایضاً جلد دوم ص ۷۹۴، ۴ حصہ اول ص ۱۲۵۸

نے شاہ گنج واقع شہر خجستہ بنیاد میں ایک مسجد بنوائی، مسجد کے سامنے جو حوض پڑتا تھا اسکو اگرچہ حسین علی خان نے بنوایا تھا، لیکن عوض خان نے اس کو اور وسیع کیا، اس شہر میں انکی حویلی اور بارہ دری بھی مشہور تھی۔[1]

نواب آصف جاہ نے ۱۱۴۱ھ میں برہانپور کی شہر پناہ کی بنیاد ڈالی، جو مدتوں میں تیار ہوئی، اس کے علاوہ مسجد، کاروان سرا اور دولت خانہ بنوایا۔[2]

ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں نے جو عمارتیں تعمیر کرائیں، یہ ان کی نہایت مختصر اور نامکمل تاریخ ہے، کیونکہ

۱۔ اس سلسلہ میں ہمارے مورخین نے صرف ان امرا و سلاطین کا نام لیا ہے، جنھوں نے تعمیرات میں خاص شہرت و ناموری حاصل کی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو امرا و سلاطین اس معاملہ میں بہت زیادہ شہرت نہیں رکھتے تھے، انھوں نے بھی کچھ نہ کچھ عمارتیں ضرور تعمیر کروائی ہوں گی،

۲۔ مشہور سلاطین و امرا، کی تمام عمارتوں کا تفصیلی ذکر بھی تاریخ کی کتابوں میں نہیں ہے بلکہ ضمنی موقعوں پر خاص خاص عمارتوں کے نام آگئے ہیں۔

۳۔ رفاہ عام کے سلسلہ میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں، وہ اس سے الگ ہیں،

۴۔ مسلمان امرا و سلاطین نے جو شہر اور قصبے آباد کئے، ان کی عمارتیں بھی اس میں داخل نہیں تاہم عمارتوں کی کثرت اور وسعت کا اندازہ مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے، مثلاً

شفاخانے | جہانگیر نے تمام بڑے بڑے شہروں میں شفاخانے تعمیر کروائے تھے، دوسرے

---

[1] مآثر الامرا، حصہ دوم ص ۸۳۴ [2] ایضاً حصہ سوم ص ۸۸۲

امراء و سلاطین نے جو شفا خانے بنوائے تھے، وہ اس سے الگ ہیں،

سرائیں | سرایوں کا ایک طویل سلسلہ دلی سے دولت آباد، اور لاہور تک بنگالہ اور سنار گاؤں سے آب سندتک، اورنگ آباد سے اکبر آباد تک اور لاہور سے کابل تک پھیلا ہوا تھا، ان میں شیر شاہ نے دہلی سے لاہور تک دو دو کوس اور بنگالہ اور سنار گاؤں سے آب سند تک اور آگرہ سے مانڈو تک کوس کوس بھر کے فاصلہ پہ سرائیں بنوائیں اور چونکہ بنگالہ اور آب سند کی درمیانی مسافت ڈیڑھ ہزار کوس اور آگرہ سے مانڈو تک کی مسافت تین سو کوس کی ہے، اس لئے بنگال اور سندھ کے راستہ میں ڈیڑھ ہزار اور آگرہ اور مانڈو کے راستہ میں تین سو سرائیں تعمیر ہوئیں، شیر شاہ نے بنگال کے راستہ میں جو سرائیں تعمیر کروائی تھیں، ان میں دو سرایوں کے درمیان اس کے جانشین سلیم شاہ نے ایک اور سرائے کا بھی اضافہ کیا، اور اس طرح یہ تعداد اور بھی زیادہ ہو گئی، متفرق سرائیں ان سے الگ ہیں، اور مہمان خانے بھی اسی سلسلہ میں داخل ہیں،

حمام | متفرق حماموں کے علاوہ عالمگیر نے اورنگ آباد سے اکبر آباد تک اور لاہور سے کابل تک جو سرائیں بنوائی تھیں، ان میں ہر سرائے کے ساتھ ایک حمام اور ایک بازار کا ہونا لازمی تھا، سکندر لودی نے ان تمام مقامات میں جہاں ہندو اشنان کرتے تھے، بازار قائم کئے تھے،

مساجد | سکندر لودی نے ان مقامات پر مسجدیں بھی تعمیر کروائی تھیں، اور عالمگیر کی تعمیر کردہ سرایوں میں ہر سرائے کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی،، ان کے علاوہ مسجدوں کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سلطان احمد نے احمد آباد کے

باہر جو گانون آباد کرائے تھے، ان مین ایک ہزار مسجدین تھین،

مقبرے مقبرون کی تعداد غیر محدود تھی، دار السلطنتون اور ان شہرون میں جہان امراء و سلاطین کے ساتھ علماء، مشائخ، اور فقراء و صوفیہ کثرت سے رہتے تھے، ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، آگرہ میں شہر کے چارون طرف خصوصًا لب جمنا کوسون تک باغات کے اندر ان مقابر کا سلسلہ چلا گیا تھا، اب امتدادِ زمانہ سے اگرچہ اکثر مقبرے منہدم ہو گئے ہیں، تاہم اب بھی شہر کے قرب و جوار میں کوسون تک مقبرون کے شکستہ گنبد اور تہ خانے نظر آتے ہین، چونکہ یہ مقبرے اکثر زندگی ہی مین تعمیر کرائے جاتے تھے، اس لئے ہر شخص اپنی یا اپنے محبوب کی آخری یادگار کو اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے کی کوشش کرتا تھا، چنانچہ ابو الفضل دلی کے متعلق لکھتا ہے،

"و بسا زندگان برائے خواب دلپسین دل گزین جا ہا و ا نعمابر ساختہ اند،"

یہ ذوق اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ انسان تو انسان گھوڑون، کتون اور ہرنون وغیرہ کی یادگار میں بڑی بڑی عمارتین اور مورتین بنائی جاتی تھین، چنانچہ آگرہ میں اس قسم کی متعدد یادگارین موجود ہین،

اس قسم کی عمارتین زیادہ تر امراء و سلاطین تعمیر کرواتے تھے، عام رعایا کی عمارتین ان سے الگ ہیں، اور ان کا اندازہ صرف مورخین کے اجمالی بیانات سے ہو سکتا ہے، مثلاً جہانگیر تزک میں آگرہ کی نسبت لکھتا ہے کہ

"اس کی کثرت عمارت کا یہ حال ہے کہ عراق، خراسان اور ماوراء النہر کے شہرون کے مثل متعدد شہر آباد ہو سکتے ہیں، اکثر آدمیون نے سہ منزلہ اور چہار منزلہ عمارتین بنوائی ہیں، آدمیون کی کثرت کا یہ حال ہے کہ کوچہ و بازار میں بمشکل چل پھر سکتے ہیں[1]"

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۳

ابوالفضل آئین اکبری میں دلی کے متعلق لکھتا ہے،

"وعماراتِ عالی از سنگ و خشت فروغ افزائے چشم و عشرت فروز دل"[۵۱]

پل، تالاب، حوض، کنوئیں، اور منارے سلسلۂ عمارات سے الگ ہیں، اور ان سب کے مجموعے نے اسلامی ہندوستان کا جو نقشہ قائم کر دیا تھا، وہ صاحب خلاصۃ التواریخ کے الفاظ میں حسب ذیل ہے،۔

"ہندوستان اس قدر وسیع ملک ہے کہ دوسرے ممالک اس کی عشر عشیر وسعت بھی نہیں رکھتے، لیکن باوجود اس وسعت کے ہر جگہ آباد ہے، اور ہر طرف، ہر ضلع میں، ہر شہر میں ہر قصبے اور گاؤں میں اور ہر رباط اور قلعے میں مسجدیں، عبادتگاہیں، خانقاہیں، حوضے، اور دوسری قسم کی عمدہ عمارتیں، باغات، درخت، ہری بھری زراعت اور نہریں اس کثرت سے ہیں کہ دوسرے ممالک میں اس قسم کی آبادی کا بہت کم پتہ چلتا ہے، عام گذرگاہوں میں ہر نہر اور ہر نالے پر مضبوط پل بندھے ہوئے ہیں، اور دریاؤں میں کشتیاں تیار رہتی ہیں، ہر کوس کے فاصلے پر بلند منیارے بنے ہوئے ہیں، جو کوس کی علامت ہیں، اور ان سے راستوں کی رہنمائی بھی ہوتی ہے، دو کوس کے فاصلہ پر مسافروں کے اترنے اور آرام کرنے کے لئے سرائیں بنی ہوئی ہیں، جن میں ہمہ وقت کھانے پینے کی چیزیں، دوائیں، عطر اور دوسرے ضروری سامان موجود رہتے ہیں، تمام راستوں میں سایہ دار اور میوہ دار درخت، کنوئیں اور تالاب ہیں، جو خوشگوار پانی سے لبریز رہتے ہیں، مسافر درختوں کے سایہ میں سیر کرتے ہوئے، میوے کھاتے ہوئے سرد پانی پیتے ہوئے گویا باغ کی روشوں پر چلتے ہیں،

---

[۵۱] آئین اکبری ج ۲ ص ۱۳۴،

نئے شہر قصبے اور گانون

از مولانا عبدالسلام ندوی

مسلمانون کی آمد سے پہلے ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ دیہاتون پر مشتمل تھا، اس لئے راجاؤن کے دار الحکومت کے علاوہ بڑے شہر کم تھے، مسلمانونکی آمد کے بعد فوجی ضرورت اور تمدنی، صنعتی اور تجارتی ترقی کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے اور بڑے شہر آباد ہوئے ان کی تفصیل طویل ہے، تاریخی ترتیب کے ساتھ ان کا مختصر تذکرہ یہ ہے،

رنگ پور اختیار خلجی سنہ ۶۰۰ھ | لکھنوتی کے اطراف مین سب سے پہلے بختیار خلجی نے شعائر اسلام کو رواج دیا، بنگال کی سرحد پر ایک نیا شہر رنگ پور کے نام سے آباد کر کے اس کو اپنا پائے تخت بنایا، اور اس شہر اور اس ملک مین بہت سی مسجدین، خانقاہیں اور مدرسے بنوائے[1]،

اُچ سلطان التمش سنہ ۶۲۵ھ | ریاست بہاولپور (پنجاب) مین یہ شہر نہر ستلج کے جنوبی کنارے پر آباد ہے، پہلے اس کا نام دیوگڑھ تھا، سید جلال الدین بخاری نے اس پر حملہ کیا تو اس کا بادشاہ اپنی لڑکی کو چھوڑ کر بھاگ گیا، وہ سید موصوف کے ہاتھ پر اسلام لائی،

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۲۹۳

اور ان کے حکم سے شہر اُچ کو آباد کیا، بعد کو جلال الدین خوارزمی نے اس کو ویران کر دیا، لیکن پھر سلطان التمش نے اس کو دوبارہ آباد کیا، اور وہ ایک بڑا شہر ہو گیا، جس میں بڑے بڑے علماء اور متمول لوگ رہتے تھے لیکن اس وقت وہ ایک چھوٹا سا گمنام شہر ہے، [۱]

دولت آباد سلطان محمد تغلق شاہ — دیوگیر یا دیوگڑھ دکن میں ایک نہایت قدیم شہر تھا، جس کو سلطان محمد تغلق شاہ نے از سر نو آباد کیا، اور اس کا نام دولت آباد رکھا، ہمارے مورخین نے اس شہر کے آباد کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے، کہ جب سلطان محمد تغلق شاہ کے زمانے میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور بہت سے ملک اس کے قبضۂ اقتدار میں آ گئے، تو اس نے ایک ایسے مقام کو پائے تخت بنانا چاہا، جو ان تمام ممالک کے وسط میں ہو، تاکہ یہاں سے تمام ممالک کا انتظام آسانی کے ساتھ کیا جا سکے، خوش قسمتی سے دیوگیر ان تمام ممالک کے وسط میں واقع تھا، اور دہلی، گجرات، لکھنوتی، ست گانون، ستارگانون، تلنگ، کارناٹک، ہیسور اور رکیتلہ سے برابر کے فاصلے پر آباد تھا، یا بہت کم فرق تھا، اس لئے اس نے اسی شہر کو دولت آباد کے نام سے پایہ تخت بنایا، اور دلی کو ویران کر کے وہاں کے تمام قدیم باشندوں کو اس نو تعمیر شہر میں منتقل کر دیا،

ہمارے مورخین نے دلی کی اس ویرانی کا بڑا ماتم کیا، لیکن محمد تغلق شاہ نے دولت آباد کا جو نقشہ تجویز کیا تھا، اگرچہ وہ اس کے مطابق مکمل طور پر آباد نہ ہو سکا، تاہم دلی سے کم درجہ کا شہر نہ تھا، چنانچہ صبح الاعشیٰ کا مصنف مسالک الابصار کے حوالے سے لکھتا ہے،

---

[۱] معجم الامکنہ ص ۷

دیوگڑھ ایک قدیم شہر ہے سلطان محمد بن تغلق شاہ نے اس کی تجدید کی اور اس کا نام قبۃ الاسلام رکھا، لیکن سلطان نے اس سے مفارقت کی اور وہ مکمل نہ ہوسکا، سلطان نے اس شہر کی جو تقسیم کی تھی، اس کے رو سے ہر گروہ کے لئے الگ الگ محلے قائم کئے تھے، فوج، وزراء، کلرک، قضاۃ، علما، اور مشائخ و فقرا سب کے لئے الگ الگ محلے تھے، اور ہر محلے میں ضروری چیزیں مثلاً مسجد، بازار، حمام، پن چکی، آتش خانے، اور ہر قسم کے دستکار یہاں تک کہ سنار، رنگریز اور موچی موجود تھے تاکہ ایک محلے کا آدمی خرید و فروخت اور لین دین میں دوسرے محلے کا محتاج نہ ہو، اور ہر محلے کی حیثیت ایک مستقل شہر کی سی ہو[1]

فرشتہ لکھتا ہے:۔

وشہر دیوگڑھ را دولت آباد نام کردہ عمارات عالیہ طرح افگند و گرد قلعہ دیو کر خندق کردہ و بر بالا گھاٹ دولت آباد نزدیک بورہ باغات و حوضہائے بزرگ ساخت، و خواجہ حسن دہلوی آن وقت در دولت اباد کہ آیہ الذی لم یخلق مثلہا فی البلاد در شان اوست فوت شدہ بانجا مدفون گردید[2]

ابن بطوطہ لکھتا ہے،

"دولت آباد بہت بڑا شہر ہے، جو عظمت اور وسعت میں دلی کا مقابلہ کرتا ہے اس کے تین حصے ہیں، ایک حصے میں بادشاہ اور اس کا لشکر رہتا ہے، اور اسی کو دولت آباد کہتے ہیں۔

دوسرے حصے کا نام کٹکہ ہے،

تیسرے حصے کو جو قلعہ ہے، دیوگڑھ کہتے ہیں، اور بادشاہ کا استاد خان اعظم

---

[1] صبح الاعشیٰ جلد ۵ صفحہ ۷۰، [2] فرشتہ جلد اول ۱۳۶،

قطلو خان اسی شہر میں رہتا ہے[1]،

شہاب پور (شہاب الدین غوری ۷۴۷ھ) | کشمیر میں ایک گانون ہے، اس کو سلطان شہاب الدین ابن شمس الدین شاہ مرزا کشمیری نے آباد کیا[2]،

کھمبی گر | اس گانون کو بھی اسی بادشاہ نے کشمیر میں آباد کیا[3]،

جونپور (فیروز شاہ ۷۵۲ھ) | اس شہر کو فیروز شاہ نے اپنے چچازاد بھائی سلطان فخرالدین جونہ کے نام پر آباد کیا[4]، اور بعد میں وہ سلاطین شرقیہ کا دارالحکومت اور علم و فضل کا مرکز ہو گیا، اسی طرح قنوج کے پاس بھی ایک شہر فیروز آباد کے نام سے آباد کرایا،

قطب الدین پور (قطب الدین ۷۹۶ھ) | کشمیر میں اس شہر کو سلطان قطب الدین بن شمس الدین شاہ مرزا کشمیری نے آباد کیا، اور وہاں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا[5]،

احمد آباد (احمد شاہ ۸۱۳ھ) | سلطان احمد شاہ گجراتی ۷۹۳ھ میں پیدا ہوا، اور سلطان مظفر کے انتقال کے بعد رمضان المبارک ۸۱۳ھ میں تخت نشین ہوا، منجمین نے پیشنگوئی کی تھی کہ اس سے ایک ایسا کام بن آئیگا جس کے ذریعہ سے اس کا نام نیک دنیا میں ہمیشہ باقی رہے گا، فرشتہ نے لکھا ہے کہ بظاہر یہ کارنامہ شہر احمد آباد گجرات کا آباد کرنا ہے[6]،

احمد آباد کے آباد ہونے سے پہلے شہر پٹن اور کچھ دنوں جانپانیر دارالسلطنت رہا، لیکن

---

[1] ابن بطوطہ جلد دوم ص ۱۲۶ [2] معجم الامکنۃ ص ۳۶ و فرشتہ جلد دوم ص ۳۳۹
[3] معجم الامکنۃ ص ۲۴۹ و فرشتہ جلد دوم ص ۳۳۹ [4] آئین اکبری
جلد دوم ص ۱، [5] معجم الامکنۃ ص ۴۱ [6] فرشتہ جلد دوم
ص ۱۸۲،

سلطان احمد نے احمد آباد کو آباد کر کے اپنا دار السلطنت بنایا، چونکہ اس نے بہت دنوں تک سلطنت کی اور اپنے دور حکومت میں اس شہر کی آبادی کے بڑھانے میں سعی بلیغ کرتا رہا، اس لئے وہ بڑا وسیع اور پُر رونق شہر ہو گیا[۱]

احمد آباد کی تعمیر کا آغاز چار آدمیوں کے ہاتھ سے ہوا، ایک شیخ احمد کھتو، دوسرے سلطان احمد، تیسرے شیخ احمد، چوتھے ملا احمد، چنانچہ داغ بیل ڈالنے کے وقت جب زمین کی پیمائش کی گئی، تو اس کا ایک سرا سلطان احمد کے ہاتھ میں اور دوسرا شیخ احمد کھٹو کے ہاتھ میں تھا، شیخ احمد کھٹو تو مشہور مشائخ میں تھے، اور مرأت سکندری میں لکھا ہے کہ شیخ احمد، اور قاضی ملا احمد بھی بزرگ وقت اور صاحب کمال تھے، اور سلطان احمد بھی صلاح ظاہری و باطنی سے آراستہ تھا، اور انہی کی برکت سے ایسا پُر رونق شہر آباد ہوا، جسکا نام دنیا میں جواب نہ تھا، ۸۱۶ھ میں احمد آباد کی فصیل تیار ہوئی اور ۸۱۷ھ میں مانک چوک کے قریب احمد آباد کی مشہور مسجد بنی[۲]

فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان احمد شاہ جب ایک جنگ کے سلسلے میں قصبہ اساول میں پہونچا تو وہاں کی آب وہوا اس کو پسند آئی اور ۸۱۵ھ کے اواخر میں شیخ احمد کھٹو کے استخارہ و استشارہ سے دریاے سابرمتی کے کنارے ایک شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام احمد آباد رکھا، جو چند دنوں میں آباد ہو کر شاہانِ گجرات کا دار السلطنت ہو گیا، اور قصبہ اساول اس کا ایک محلہ بنگیا، امرار و سلاطین کے مکانات پختہ ہیں، یعنی گچ اور اینٹ سے بنے ہوئے ہیں، بقیہ گھر کھپریل ہیں، بازار اسقدر وسیع و فراخ ہیں کہ دس گاڑیاں پہلو بہ پہلو چل سکتی ہیں، دوکانیں پختہ ہیں،

---

[۱] خلاصۃ التواریخ ذکر صوبہ گجرات [۲] مرات سکندری ص ۲۵-۲۶،

اور قلعہ اور مسجد جامع بھی تعمیر کی گئی ہیں، شہر کے باہر تین سو ساٹھ پورے آباد ہیں، اور ہر ایک میں بازار، مسجد اور دیوار بند ہے[1]،

خلاصۃ التواریخ میں ان پوروں کی نسبت لکھا ہے،

"ناگزیر شہر ہا و ہر یکے پیدا بازار، مسجد، خانقاہ و منار دکتا بہائے شگرف درو ہست"

صاحب مرات احمدی نے ان پوروں کی تعداد ۳۸۰ بتائی ہے، اور لکھا ہے کہ

پورہ عبارت از محلہ بزرگیست مشتمل بر عمارات عالی و مزار ہائے مملو از نفائس و نوادر کہ ہر کدام درحقیقت شہریست عظیم[2]"

فرشتہ لکھتا ہے،

"در باب معموری و دیگر خصوصیات احمد آباد اگر گفتہ شود کہ در تمامی ہندوستان بلکہ در کل جہان بان عظمت و آراستگی شہرے موجود نہ شدہ مبالغہ نبودہ باشد"

احمد نگر. احمد شاہ | سلطان احمد شاہ نے گجرات کی سرحد پر ۸۳۰ھ میں ایک اور شہر احمد نگر آباد کیا اور اس کے گرد پتھر کی ایک مضبوط فصیل قائم کی اور اس کو اپنا مستقر قرار دیا[3]، آج کل اسکو "امنگر" کہتے ہیں، اس کے علاوہ ایک قصبہ ہے دہار دوحد کے نام سے کوہستان کے درمیان آباد کیا اور اسکے گرد ایک فصیل قائم کی،

سلطان علاء الدین کے عہد سلطنت میں الغ خان نے ۷۰۴ھ میں قصبہ کارٹھ کے گرد جو فصیل قائم کی تھی، از سر نو اس کی مرمت کروائی اور قصبہ کا نام سلطان آباد رکھا[4]،

(احمد آباد بیدر ۸۲۵ھ) ایک پرانا شہر ہے، جو زمانہ قدیم میں راجایان دکن کا پایہ تخت تھا،

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۸۳، لیکن بنار احمد آباد کی تاریخ ۸۱۵ھ نہیں ہے، بلکہ ۸۱۳ھ ہے [2] مرات احمدی جلد اول ص ۱۱۸. [3] مرات احمدی جلد اول ص ۵۱، [4] مرات احمدی جلد اول ص ۵۱،

ایک جنگ کے سلسلے میں سلطان احمد شاہ بہمنی جب قلعہ بیدر کے اطراف میں پہونچا تو سیر و شکار کے لئے روانہ ہوا اور اثنائے سیر میں اس کی نگاہ سے ایک صحرا گذرا جو نہایت سرسبز و شاداب تھا، اس صحرا میں ایک لومڑی نظر آئی، اور بادشاہ کے حکم سے چند شکاری کتے اسکے پیچھے چھوڑے گئے، کتے جب لومڑی کے پاس پہونچے تو اس نے اُن پر حملہ کیا، اور بادشاہ کو لومڑی کی اس جرأت پر سخت تعجب ہوا، اور اس کو اس سرزمین کی آب وہوا کا اثر خیال کیا، اور اس خیال سے اس مقام کو پایۂ تخت بنانا چاہا، ارکان سلطنت نے بھی اس کو پسند کیا، اور اس طرح ایک شہر کی بنیاد ڈالی گئی، اور اس کا نام احمد آباد بیدر رکھا گیا،

قدیم زمانے مین جہان بیدر کا قلعہ تھا، دار الامارت تیار کیا گیا، اور شیخ آذری اسفراینی نے اس کی شان مین یہ دو شعر لکھے،

حبذا قصر مشید کہ ز فرطِ عظمت	آسمان سدۂ از پایۂ این درگاہ است
آسمان ہم نتوان گفت کہ ترکِ ادب است	قصر سلطان جہان احمد بہمن شاہ است

ملا شرف الدین مازندرانی نے جو مشہور خوشنویس تھے، ان کو جلی خط میں لکھا، اور اہل تلنگی سنگ تراشون نے اس کو ایک بڑے پتھر پر کندہ کر کے دروازے پر لگایا، بادشاہ کی نظر سے یہ اشعار گذرے تو شیخ آذری کو ایک بڑا صلہ دیا،[۱]

نعمت آباد احمد شاہ بہمنی ۸۲۵ھ سلطان احمد شاہ بہمنی ۸۲۵ھ کو فقراء و مشائخ سے نہایت حسن عقیدت تھی، اس کے زمانے میں شاہ نعمت اللہ ماہانی کے کشف و کرامت کا بڑا شہرہ تھا، احمد شاہ نے اس شہرت کو سنکر ان کی خدمت میں چند اشخاص کو وکیل بنا کر روانہ کیا، اور انکے ذریعہ سے انکے ہاتھ پر بیعت کی اور شاہ صاحب سے درخواست کی کہ اپنی اولاد میں سے کسی کو دکن میں روانہ فرمائیں،

[۱] فرشتہ جلد اول ص ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶،

شاہ صاحب کے صرف ایک لڑکے شاہ خلیل اللہ تھے جن کی جدائی کو انھوں نے گوارہ نہیں کیا، اور اپنے پوتے شاہ نور اللہ کو روانہ کیا، جب وہ احمد آباد بیدر کے قریب پہونچے تو انکا استقبال کیا، اور جس جگہ ملاقات ہوئی تھی، انکے اعزاز میں ایک گاؤن آباد کر کے اس کا نام نعمت آباد رکھا،[1]

عہد سلطان زین العابدین ۸۲۶ھ فرمانروایانِ کشمیر میں سلطان زین العابدین (۸۲۶ھ) کا دور حکومت جن مختلف حیثیتون سے امتیاز رکھتا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ اس نے اپنے دور حکومت میں مختلف شہر آباد کئے، اور ان میں علماء و فضلاء کو آباد کیا تاکہ مسافرون کو کھانا، اور محتاجون کو حسب ضرورت نقد و جنس تقسیم کریں، اس نے کوہ ماران کے پاس ایک جدید شہر آباد کیا تھا، جس کی آبادی کا سلسلہ پانچ کوس تک پھیلا ہوا تھا،[2]

برہانپور نصیر خان فاروقی ۸۳۳ھ خاندیس کے بادشاہ نصیر خان فاروقی ۸۳۳ھ نے اس شہر کو اپنے پیر شیخ برہان الدین محمد بن الناصر الہانسوی کے نام پر آباد کیا، اور اس نے عمدہ عمدہ محل بنوائے اور اس کو اپنا دار السلطنت قرار دیا، اکبر کے زمانے تک اس کا شمار بہترین شہرون میں کیا جاتا تھا، اور اکبر کے حکم سے علی خان نے اس میں ایک شاندار مسجد بنوائی تھی،[3]

زین آباد نصیر خان فاروقی ۸۳۳ھ اس شہر کو بھی برہانپور کے قریب نصیر خان فاروقی ۸۳۳ھ نے شیخ زین الدین داؤد بن الحسین شیرازی کے نام پر آباد کیا،[4]

مبارک آباد (مبارک شاہ ۸۳۷ھ) ۸۳۷ھ میں مبارک شاہ نے دریائے جمنا کے کنارے اس شہر کو آباد کیا، اور اس کی شہادت اسی شہر میں ہوئی،[5]

ٹپیالہ عہد بہلول لودی ۸۵۵ھ چونکہ پنجاب پر کابل اور بلخ کے مغلون کا حملہ بار بار ہوتا رہتا تھا،

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۳۲۹ [2] فرشتہ جلد دوم ص ۳۴۳ [3] معجم الامکنہ ص ۱۰۱ فرشتہ جلد دوم ص ۲۷۶،

[4] معجم الامکنہ ص ۳۰۰ فرشتہ جلد دوم ص ۲۷۶ فرشتہ میں اسکو قصبہ لکھا ہے [5] خافی خان حصہ اول ص ۲۹۰،

اس لئے وہ نہایت ویران ہوگیا تھا، اور زمین کی پیداوار بہت کم ہوگئی تھی، سلطان بہلول لودی کے زمانے میں جب تاتار خان لاہور کا صوبہ دار مقرر ہوا تو رائے رام دیو بھٹی نے اس سے تمام پنجاب کو ۹ لاکھ ٹنکہ پر اجارۃً لے لیا، اتفاق سے وہ مسلمان ہوگیا اور ۸۶۰ھ میں تاتار خان کی اجازت سے ایک ویران مقام پر پٹیالہ کی بنیاد ڈالی، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس نے پہلے جس جگہ شہر کو آباد کرنا چاہا تھا، وہاں کوئی بدشگونی ہوگئی، اس لئے جگہ کو بدل کر دوسری جگہ ایک ٹیلے پر شہر کی بنیاد رکھی، چونکہ پنجابی زبان میں پٹا کے معنی مبادلہ کے ہیں، اس لئے جگہ کی تبدیلی کیوجہ سے شہر کا نام پٹیالہ پڑ گیا، اور متعدد گانون کی آبادی اور زرعی پیداوار کی ترقی سے وہ ایک پرگنہ قرار پایا، اور اس کی مالگذاری میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا، لیکن باایں ہمہ ابتدا میں شہر کی آبادی بہت معمولی تھی، لیکن اکبر کے زمانے میں جب شمشیر خان خواجہ سرا اس پرگنہ کا کروری مقرر ہوا، تو اس نے بہت سی شاہانہ عمارتیں تعمیر کرائیں، ایک تالاب کھدوایا، اور ایک عمدہ باغ بنوایا اور رفتہ رفتہ شہر کی رونق اور آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا گیا، اس کے بعد شیخ مشائخ کروری نے متعدد عمارتون اور باغون سے شہر کی آبادی میں اضافہ کیا، پھر عالمگیر کے زمانے میں مرزا محمد جان وزیر خانی نے جو اس پرگنہ کے امین تھے، بہت سی دوکانیں بنوائیں، اور ایک پختہ بازار قائم کیا، بانکی رائے اور سبحان سنگھ قانونگو اور انکی اولاد نے عمدہ عمارتیں، کاروان سرا، جامع مسجد اور باغ بنوا کر شہر کی رونق بڑھائی، بازار میں گنگا دہر نے ایک پختہ کنوان کھدوایا، اور شہر سے باہر لاہور کے راستے میں ایک چھوٹا سا باغ ایک زینہ دار کنوئیں کے ساتھ تیار کر دیا، چونکہ ان دونون کا پانی گنگا کے پانی کی برابری کرتا تھا، اس لئے ان کے پانی کو گنگا دہر کہنے لگے،

اگرچہ اس شہر کے کنارے نہایت کثرت سے باغ موجود تھے لیکن امر سنگھ قانونگو نے شالامار کے نمونے کا ایک نہایت عمدہ سہ منزلہ باغ بنوایا جس کی پہلی منزل کا رخ شمشیر خان کے تالاب کے مقابل تھا،

اس شہر کے اطراف میں بہت سے اولیاء اللہ کے مزار موجود ہیں، اور بابا نانک کا مکان بھی اسی شہر کے قریب بارہ کوس کے فاصلے پر دریائے راوی کے کنارے موجود ہے اور ان کی اولاد وہاں آباد ہے[1]،

مصطفیٰ آباد | سلطان محمود شاہ بیگڑہ | فرمانروایان گجرات میں سلطان محمود شاہ بیگڑہ ۹۱۴ھ کو ملک کی آبادی کا اسقدر خیال تھا کہ جب شہر اور دیہات میں کوئی خالی دوکان دیکھتا یا کوئی گرا پڑا گھر نظر آتا تو اس کی تحقیقات کر کے اس کو آباد کرتا[2] تاریخ فرشتہ میں ہے کہ اس نے ۸۷۳ھ میں سیر و شکار کے سلسلے میں ملک کا دورہ کیا اور اس طریقہ سے

"اکثر ممالک خویش دراہ نظر کیمیا اثر اور دو د بمعموری د آبادانی کوشید و جنگل و ویرانے در مملکت خود نگذاشت[3]"

ملک کی اس عام آبادی کے علاوہ اس نے گجرات میں متعدد شہر آباد کئے، جن میں مصطفیٰ آباد کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس شہر کو اس نے راو منڈلیک کے شکست دینے اور اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد آباد کیا اور خود اپنے ہاتھ سے اس کا سنگِ بنیاد رکھکر مسجدیں اور عمارتیں تعمیر کردائیں، دوکانیں بنوائیں، اور بازار لگوائے، شاہی حکم سے امراء نے بھی اپنے قیام کے لئے مکانات بنوائے، اور وہاں قیام گزین ہوگئے۔ ملک کی عام آبادی کے ساتھ اس شہر کے آباد کرنے سے اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ

---

[1] خلاصۃ التواریخ ذکر لاہور [2] مرات احمدی جلد اوّل ص ۶۰ [3] فرشتہ جلد دوم ص ۱۹۷،

اس کے اطراف میں شعائر اسلام کی ترویج و اشاعت ہوئی[۱]

سلطان محمود کو اس شہر کے آباد کرنے میں سخت زحمتیں پیش آئیں، کیونکہ لوگ احمد آباد کے مکانات کو چھوڑ کر مصطفےٰ آباد کی پہاڑیوں مین قیام کرنا پسند نہین کرتے تھے، اور واویلا مچاتے تھے، اسی خیال سے سلطان نے احمد آباد مین آکر ممالک محروسہ کا انتظام امرا کے سپرد کر دیا تھا، اور ولایت گرنال (گرنار) کا انتظام جس میں یہ شہر واقع تھا، خود اپنے ہاتھ میں لیا تھا، بہرحال اس نے مصطفےٰ آباد میں قیام کرکے متعدد باغات لگوائے اور احمد آباد کے درجہ کا ایک شہر آباد ہو گیا[۲]، آج کل اس کو جوناگڈھ کہتے ہیں،

محمود آباد | اس نے احمد آباد سے ۱۲ کوس کے فاصلے پر محمود آباد کے نام سے ایک دوسرا شہر آباد کیا، جس کی عمارتوں کے آثار و علامات ۱۱۷۰ھ تک باقی تھے[۳]، سلطان محمود ثانی نے اسی شہر کو اپنا پائے تخت قرار دیا اور احمد آباد سے محمود آباد تک دو رویہ بازار لگوائے، اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس کے اطراف میں عمارتین بنوائین، اس طریقہ سے احمد آباد اور محمود آباد دونوں ملکر ایک شہر ہو گئے، اور ارباب صنائع کے جمع ہونے سے احمد آباد میں صنعت و حرفت کا بازار گرم ہو گیا،

محمد آباد | محمود آباد کے آباد کرنے کے بعد جب اس نے ۸۸۹ھ میں جانپانیر کے قلعے کو فتح کیا، تو اس کو وہان کی آب ہوا نہایت پسند آئی، اور اس کو اپنا پائے تخت بنالیا، اس تقریب سے قلعہ کے نیچے رسول اللہ صلعم کے اسم مبارک پر ایک شہر محمد آباد کے نام سے آباد کیا، اور مصطفےٰ آباد کو اپنے چھوٹے لڑکے خلیل خان کے حوالے کرکے اس شہر کے آباد

---

[۱] فرشتہ جلد دوم ص ۱۹۸ [۲] فرشتہ جلد دوم ص ۲۰۰ و تاریخ احمدی جلد اول ص ۶۲

[۳] مرأت احمدی جلد اول ص ۶۳، ۶۴ [۴] مرات احمدی جلد دوم ص ۴،

کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوگیا، اور ایک نہایت عظیم الشان جامع مسجد بنوائی، شہر کے گرد فصیل کھنچوائی، اور اطراف شہر میں باغات لگوائے، امراء، وزراء، تجار اور اہل حرفہ نے بھی اپنے لئے مکانات بنوائے، اور اس طرح ایک نہایت عمدہ شہر تیار ہوگیا، مسجد کے محراب کے سامنے ۹۱۴ھ میں ایک پر تکلف منبر بنوایا جس کی تاریخ ایک شاعر نے یہ لکھی ہے،

حضرت شاہ عاقبت محمود ——— آن سلاطین پناہ دین پرور
پیش محراب مسجد از تعظیم ——— منبرے ساخت خوب خوش منظر
سال تاریخ منبر و محراب ——— قلمی شد بخطبہ و منبر[1]

دولت آباد | سلطان محمود کے بیٹے سلطان مظفر حلیم نے جو رمضان ۹۱۷ھ میں تخت نشین ہوا تھا، اس شہر کو بڑودہ کے ایک ضلع میں آباد کیا تھا، اور آج بھی شہر بڑودہ کے نام سے مشہور ہے[2]، اور آج بھی اس سے تھوڑے فاصلہ پر اس کے آثار موجود ہیں،

شیرگڈھ شیرشاہ ۹۴۷ھ | شیر شاہ (۹۴۷ھ) نے اپنے جلوس کے اوائل میں قنوج کو چھوڑ کر نئے سرے سے ایک شہر گنگا کے کنارے آباد کیا، اور یہ نو آباد شہر شیر گڈھ کے نام سے مشہور ہوا[3]،

فیروز آباد | اسی طرح سلطان علاء الدین کی آباد کردہ پرانی دلی کو بھی اس نے چھوڑ کر، ہمایون کے قلعہ دین پناہ کے درمیان فیروز آباد کے نام سے ایک شہر تین کوس کی لمبائی میں آباد کیا[4]،

---

[1] مرات احمدی جلد اول ص ۷۴ و فرشتہ جلد دوم ص ۲۱۲: [2] مرات احمدی جلد اول ص ۷۶،
[3] خافی خان جلد اول ص ۳۶۲ [4] خافی خان حصہ اول ص ۳۶۳،

احمد نگر (احمد نظام شاہ ۹۰۰ھ) احمد نظام شاہ نے سنہ ۹۰۰ھ میں اس کی بنیاد ڈالی اور اپنے نام پر احمد نگر رکھا، دو تین سال میں ایک نہایت عمدہ شہر آباد ہوگیا، اور کچھ دنوں کے بعد ایک پختہ قلعہ تعمیر کروایا جس کے اندر اپنے رہنے کے لئے نہایت عمدہ محل تعمیر کروائے، احمد نظام شاہ کے مرنے کے بعد یہ قلعہ اس کی اولاد کے قبضہ میں رہا، پھر سنہ ۱۰۰۹ھ میں شہزادہ دانیال نے جو اکبر کا لڑکا تھا، اس کو فتح کر لیا[1]،

اعتماد پور (دور اکبر ۹۶۳ھ) پھول ملک ایک خواجہ سرا تھا جس کو اکبر نے اعتماد خان کا خطاب اور ہزاری منصب عطا فرمایا تھا، اس نے آگرہ سے چھ کوس کے فاصلے پر اعتماد پور کے نام سے ایک قصبہ آباد کیا تھا، اور اس میں ایک تالاب کھدوایا تھا، اور ایک عمارت بنوائی تھی، اپنا مقبرہ بھی یہیں بنایا تھا[2]، یہ تالاب اور مقبرہ اب بھی موجود ہے،

مول منوہر نگر (اکبر ۹۶۳ھ) رائے لونکرن کچھواھہ جو پرگنہ سانبھر کا زمیندار تھا، امرائے اکبری میں داخل تھا، ایک موقع پر اکبر قصبہ انبیر میں خیمہ زن تھا، معلوم ہوا کہ یہاں پہلے ایک قدیم شہر آباد تھا، جو اب حوادثات زمانہ سے ویران ہو کر بالکل تودۂ خاک ہوگیا ہے، تو اس نے نئے سرے سے اس کو آباد کیا، اور خود اپنے ہاتھ سے سنگ بنیاد رکھ کر اس کی تعمیر کے لئے بعض امراء کو مقرر کیا، چند دنوں میں شہر آباد ہوگیا، تو چونکہ وہ رائے لونکرن کچھواھہ کی زمینداری میں واقع تھا، اس لئے اسکے بیٹے رائے منوہر داس کے نام پر اس کا نام مول منوہر نگر رکھا[3]،

لاہور (اکبر ۹۶۳ھ) مشہور ہے کہ راجہ رامچندر کے لڑکے لھو نے اس کو آباد کیا تھا، لیکن جب ایک مدت کے بعد یہ شہر ویران ہونے لگا تو اس کی مرکزی حیثیت جاتی رہی،

---

[1] آثر الامراء حصہ سوم ص ۹۰۶ [2] آثر الامراء جلد اول ص ۹۰ [3] آثر الامراء جلد دوم ص ۱۱۶، ۱۱۷

اور اس کے بجائے سیالکوٹ دار السلطنت ہو گیا، مسلمانوں کے دورِ حکومت میں پھر اسکے نصیب جاگے اور وہ دوبارہ دار السلطنت قرار پایا، چنانچہ جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کو فتح کیا تو اس کے منظورِ نظر غلام ملک ایاز نے یہاں ایک پختہ قلعہ بنوایا، اور ایک نیا شہر آباد کیا، اس کے بعد سلطان محمود کی اولاد میں خسرو شاہ اور سلطان خسرو نے اس کو اپنا دار السلطنت بنایا، اور ۳۰ سال تک وہ سلطان محمود کی اولاد کا دار السلطنت رہا، لیکن اس کے بعد کسی بادشاہ نے اس کو اپنا دار السلطنت نہیں بنایا، اس لئے وہ سلطان مبارک شاہ کے زمانے تک بالکل ویران ہو گیا، چنانچہ اس نے ایک جنگ کے سلسلے میں جب ۸۲۵ھ میں دریائے راوی کے کنارے ایک مہینے تک قیام کیا تو نئے سرے سے اس کو آباد کیا، اور اس کی فصیل کی مرمت کروائی،[1] لیکن دار السلطنت ابتک دہلی ہی رہا، پھر سلطان بہلول لودی کے امرا میں تاتار خان نے اگرچہ چند روز تک اس کو اپنا دار السلطنت بنا لیا، لیکن اس کے بعد کسی بادشاہ نے اس شہر میں قیام نہیں کیا، اس لئے اس کی رونق جاتی رہی اس کے بعد بابر کے لڑکے کامران مرزا نے لاہور میں قیام اختیار کیا جس کی وجہ سے اس کی آبادی میں بہت کچھ ترقی ہوئی، لیکن لاہور کی رونق اور آبادی کا اصلی سلسلہ اکبر کے زمانے سے شروع ہوا اور اس نے قلعہ شہر پناہ اور دولت خانہ کو تعمیر کرکے شہر کی رونق میں ایک نیا اضافہ کیا، ابو الفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے:

"درین دولت ابد پیوند قلعہ دارک از خشت پختہ ساختہ اند و چون چندگاہ پایۂ تخت شد والا کاخہا بر افراختہ آمد و دلکشا باغہا شادابی دیگر بخشید، و گوناگون مردم ہر شہر را نبگاہ شد و شگرف کارہا بر ساختند

---

[1] خافی خان حصہ اول ص ۹۰

و در آبادی و بزرگی از اندازہ گذشت ۱؎

اکبر کے بعد اس کے جانشین اس کی آبادی کو ترقی دیتے رہے، چنانچہ جہانگیر نے وہاں شاندار عمارتیں بنوائیں، اور امراء اور شاہزادوں کی عمارتوں سے شہر کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا، شاہجہان نے اس کی آبادی میں اور اضافہ کیا، شہر کے کنارے اگرچہ بکثرت باغات تھے، لیکن اس نے شالامار کشمیر کے نمونے پر یہاں بھی شالامار کے نام سے ایک باغ تیار کروایا،

عالمگیر کے زمانے میں جب دریائے راوی کا بہاؤ شہر کی طرف ہوگیا، تو اس کی وجہ سے اکثر عمارتوں اور باغوں کو نقصان پہونچا، عالمگیر نے عمارتوں کو اس نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے دو کوس کا ایک مضبوط بند بندھوایا، اور امراء و خوانین نے دریا کے سامنے بہت سی دلفریب عمارتیں تعمیر کیں، اور ہر سال شہر کی ترمیم و تعمیر میں شاہی خزانہ سے رقم کثیر صرف کی جانے لگی،

لاہور کے ہر کوچہ و بازار میں اگرچہ مسجدیں نہایت کثرت سے تھیں لیکن عالمگیر نے پانچ لاکھ روپیہ کے صرف سے دریا کے کنارے دولت خانہ کے سامنے ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی، وسط شہر میں وزیر خان کی جامع مسجد بھی تیموری دورِ حکومت کی عمدہ یادگار ہے ۲؎،

الہ آباد (اکبر ۹۷۳ھ) اس کا قدیم نام پراگ تھا، اکبر نے دریائے گنگا اور جمنا کے درمیان ایک قلعہ تعمیر کیا اور ایک شہر آباد کر کے اس کا نام الہ باس رکھ دیا، لیکن شاہ جہان نے اپنے دور حکومت میں الہ آباد کے نام سے موسوم کیا،

یہ صاحب خلاصۃ التواریخ کی روایت ہے، لیکن ابوالفضل نے آئین اکبری میں

۱؎ آئین اکبری جلد دوم ص ۱۵۲ ۲؎ خلاصۃ التواریخ ذکر لاہور،

شہر کے آباد کرنے کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف اس قدر لکھا ہے کہ اس کا قدیم نام پیاگ تھا، اکبر نے اس کو بدل کر الہ آباد نام رکھا، ایک قلعہ تعمیر کروایا، اور عمدہ عمارتیں بنوائیں، اور اس دور میں خربزہ اور انگور کی کاشت و پیداوار میں ترقی ہوئی[1]

آگرہ اکبر ۹۶۳ھ | قدیم زمانے میں آگرہ پرگنہ بیانہ کا ایک گاؤں تھا، سکندر لودی نے اپنے عہد حکومت میں اس کو اپنا پایۂ تخت بنا کر ایک عمدہ شہر آباد کیا، جو بادل گڑھ کے نام سے مشہور ہوا، اس کے بعد بابر نے اس کی آبادی کو ترقی دی، اور ایران اور کابل کے طرز پر اس کو آباد کرنا چاہا، چنانچہ تزک میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں بہت بڑا عیب یہ ہے کہ یہاں آب رواں نہیں، مجھکو یہاں کی گرمی، تند ہوا، اور گرد سے بڑی نفرت ہے، اور صرف حمام ان تینوں سے نجات دلا سکتا ہے، اگرچہ ان حیثیتوں سے آگرہ میں اس کو کوئی جگہ پسند نہ آئی، تاہم چونکہ آگرہ کے آس پاس میں بھی اس قسم کی کوئی جگہ نہ تھی، اس لئے مجبوراً آگرہ ہی میں اس نے حمام بنوایا، باغات لگوائے، اور اس طرح آگرہ کا گوشہ گوشہ چمن زار بن گیا، چنانچہ تزک میں لکھتا ہے،

"در ہر گوشہ چمنہائے معقول در ہر چمن گل نسترن مرتب و مکمل شد"

دریائے جمنا کے کنارے امرائے شاہی نے بھی جدید طرز کی عمارتیں بنوائیں، جن سے اہل ہند بالکل ناآشنا تھے، اس لئے جس حصے میں یہ عمارتیں تعمیر ہوئی تھیں اسکو کابل کہنے لگے[2]

بابر کے بعد اکبر نے اس کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اور اس وقت سے اس کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا، اور قلعہ اکبر آباد کی تعمیر سے اس کی مرکزی حیثیت اور زیادہ ہو گئی، ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ "آگرہ ایک بڑا شہر ہے، پانچ

---

[1] آئین اکبری جلد دوم ص ۱۷۱

کوس تک دریائے جمنا اس کے درمیان مین بہتا ہے، اور دریا کے دونون کنارے عمدہ عمارتین بنی ہوئی ہیں، اور باغ لگے ہوئے ہیں، بادشاہ نے سنگ سرخ کا ایک بے نظیر قلعہ بنوایا ہے، اور پانچسو سے زیادہ پختہ محل بنگال اور گجرات کے طرز کے بنے ہوئے ہیں، نقاشانِ نادرہ کار اور مصورانِ نظرفریب نے ان عمارات میں اپنے کارنامے دکھائے ہیں، اور باختری دروازے پر پتھر کے دو ہاتھی مع فیلبانون کے نہایت عمدہ تراشے گئے ہیں، قدیم زمانہ میں وہ بیانہ کا ایک گانون تھا سکندر لودی نے اس کو پایۂ تخت بنایا، اور جہان پناہ نے اس کو ترقی دیکر ایک بے مثل شہر بنا دیا،[1]

جہانگیر تزک میں لکھتا ہے کہ "لودی پٹھانون کی حکومت سے پہلے آگرہ ایک بڑا آباد مقام تھا، اور یہان ایک قلعہ تھا جسکا ذکر مسعود سعد سلمان نے ایک قصیدے میں کیا ہے، جب سکندر لودی گوالیار کے فتح کرنے کے لیے دلی سے آگرہ میں آیا تو تو وہیں قیام کر لیا، اور اس وقت سے آگرہ کی آبادی میں ترقی ہونے لگی، اور وہ شاہان دہلی کا پایۂ تخت ہو گیا، اس کے بعد جب خداوند تعالیٰ نے سلسلۂ تیموریہ کو سلطنت عطا کی تو حضرت فردوس مکانی بابر شاہ نے ابراہیم لودی اور رانا سانگا کے شکست دینے کے بعد جمنا کے مشرقی جانب ایک جگہ کا انتخاب کیا، اور یہان ایک باغ لگوایا جس کا نام گل افشان رکھا، اس میں سنگ سرخ کی ایک مختصر سی عمارت اور باغ کے ایک طرف ایک مسجد بھی بنوائی، ایک اور عظیم الشان عمارت بھی بنوانا چاہتے تھے، لیکن عمر نے وفا نہیں کی، آگرہ اور اس کے اطراف میں خربزہ، آم اور دوسرے میوے خوب ہوتے ہیں، حضرت عرش آشیانی (اکبر) کے زمانے میں ولایت کے

---

[1] آئین اکبری جلد دوم ص ۱۸۴

اکثر میوے جو ہندوستان میں نہیں ہوتے تھے آئے، ایک میوہ جسکا نام اناس ہے، اور جو فرنگی بندروں میں ہوتا ہے، آگرہ کے باغ گل افشان میں بہ کثرت پیدا ہوتا ہے، اس شہر کی آبادی دریائے جمنا کے دونوں کناروں پر واقع ہے، مغربی جانب جس میں آبادی زیادہ ہے، اسکا دور سات کوس، طول دو کوس اور عرض ایک کوس کا ہے، اور مشرقی جانب کی آبادی کا دور ڈھائی کوس، طول ایک کوس اور عرض آدھ کوس کا ہے، عمارتوں کی اسقدر کثرت ہے کہ عراق، خراسان اور ماوراء النہر جیسے چند شہر آباد ہو سکتے ہیں، اکثر لوگوں نے سہ منزلہ اور چہار منزلہ عمارتیں بنوائی ہیں، اور آدمیوں کی اسقدر بھیڑ بھاڑ ہے کہ کوچہ و بازار میں بمشکل گذر سکتے ہیں[۱]،

اکبر اور جہانگیر کے زمانے تک اس شہر کا نام آگرہ ہی رہا، لیکن جب شاہجہان تخت نشین ہوا، اس نے اس کا نام اکبر آباد رکھا، اور اس وقت سے یہی نام رواج پا گیا، چنانچہ ملا عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں لکھتا ہے کہ "دریائے جمنا کے کنارے یہ شہر جو زمین کی طرح فراخ اور آسمان کی طرح وسیع ہے، آباد ہے، اور انواع و اقسام کے نفائس اور ہر ملک کے گوناگوں نوادر اور الوان نعمت کی موجودگی کیوجہ سے بہشت برین کی یادگار ہے، رذیل و شریف سب کیلئے زندگی کے ضروری ساز و سامان یہاں موجود ہیں، اور ہزاروں کاریگر اور صنعت پیشہ یہاں فارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں، حضرت صاحب قران ثانی کے جلوس کے بعد اس کے عز و شرف میں اور بھی اضافہ ہو گیا، فضلا اور اہل کمال نے اس کو اپنی امیدگاہ بنا لیا، اب تک وہ اپنے قدیم نام سے موسوم تھا، شہنشاہ اکبر نے اپنے طویل زمانۂ حکومت میں

---

[۱] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۳ و ۴،

اگرچہ اکثر چیزون کے جدید نام رکھے، لیکن اس شہر کو باوجودیکہ اس کا قدیم نام لفظی و معنوی حسن سے خالی تھا، اکبر آباد کے نام سے موسوم کیا، لیکن حضرت صاحب قران ثانی نے جلوس کے دن اس کا نام اکبر آباد رکھا، اور اب وہ اسی نام سے مشہور ہے،

اگرچہ زمانۂ قدیم میں دلی دارالسلطنت تھا، لیکن اکبر آباد چونکہ ممالک محروسہ کے وسط میں واقع تھا، اور دریاے جمنا اس کے درمیان میں بہتا تھا، اس لئے شہنشاہ اکبر نے اس کو دارالسلطنت بنالیا،

خلفاے عباسیہ کا دارالسلطنت بغداد تقریبًا دو فرسخ یعنی چھ کوس کے دور میں آباد ہے، لیکن آگرہ کا دور دریاے جمنا کے دونون کنارے دس کوس بادشاہی کا ہے، جو ولایت کے پانچ فرسخ اور ہندوستان کے پندرہ کوس رسمی کے برابر ہے، اس لحاظ سے وہ بغداد پر بہت زیادہ فوقیت رکھتا ہے، قلعہ، دولت خانہ، شاہزادون اور امرار کی حویلیان، آبادی کے سامنے یعنی دریاے جمنا کے مغربی جانب واقع ہیں، اس طرف کی آبادی کا دور آٹھ کوس، طول ڈہائی کوس، اور عرض ایک کوس کا ہے، ان عمارتون میں اکثر ایک لاکھ سے لیکر پانچ لاکھ روپیہ تک کے صرف سے تعمیر ہوئی ہیں، اس سے کم خرچ عمارتون کا تو کوئی شمار ہی نہین، دریاے جمنا کے مشرقی جانب امرار کی سکونت کے مکانات کم ہیں، البتہ باغ نہایت کثرت سے ہیں، جن کے درمیان مین دلکش عمارتین بنی ہوئی ہیں، آبادی کے اس حصے کا دور دو کوس، طول ایک کوس اور عرض نصف کوس کا ہے[1]،

عالمگیر کے زمانے میں اگرچہ اس کی آبادی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا،

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۱۵۵ تا ص ۱۵۸ ملخصًا،

تاہم اُس کی قدیم عظمت باقی رہی، چنانچہ اس دور کا ایک مورخ آگرہ کی قدیم تاریخ کے ذکر کے بعد لکھتا ہے کہ دریائے جمنا شہر کے درمیان مین چار کوس تک بہتا ہے، اور اس کے دونون طرف عمدہ عمارتین بنی ہوئی ہیں، ہر قوم اور ہر ملک کے آدمی اس میں آباد ہیں، اور تمام دنیا کے تجارتی مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے، طرح طرح کے میوے بالخصوص ایرانی اور تورانی خربزے، رنگ برنگ کے پھول یہان پیدا ہوتے ہیں، اور یہان کا پان نہایت عمدہ ہوتا ہے، اگرچہ ہر قسم کے کارگیر اور صناع یہان موجود ہیں، لیکن کارچوبی کا کام نہایت عمدہ ہوتا ہے، اور دوسرے نادر کپڑے بھی تیار ہوتے ہیں، اور دور دور سے تاجر آکر ان کو لے جاتے ہیں[1]۔

اس کے بعد سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ آگرہ پر بھی زوال آیا، اور اب چند مشہور عمارتون کے سوا بقیہ عمارتون کے صرف کھنڈر ہی باقی رہ گئے ہیں، اور وہ بھی بہت کم،

یادگار رونقِ محفل تھی پروانوں کی خاک
تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تونے اے بادِ صبا

فتحپور سیکری (اکبر ۹۷۳ھ) سیکری آگرہ سے ۱۲ کوس کے فاصلے پر ایک گاؤن کا نام ہے، اسی گانون کے متصل ایک پہاڑ پر ایک بزرگ شیخ سلیم رہتے تھے جن کے ساتھ ان اطراف کے لوگ نہایت عقیدت رکھتے تھے، چونکہ ۲۸ سال کے سن تک اکبر کی کوئی اولاد نرینہ زندہ نہیں رہتی تھی، اس لئے وہ لڑکے کے زندہ رہنے کے لئے، درویشون اور گوشہ نشینوں سے روحانی امداد کا طالب رہتا تھا، اور اسی غرض سے اس نے یہ منت مانی تھی کہ اگر خدا اس کو لڑکا دیگا تو آگرہ سے اجمیر تک خواجہ معین الدین چشتی

[1] خلاصۃ التواریخ،

کے روضے کی زیارت کے لئے پاپیادہ جائے گا، اسی سلسلے میں اس نے شیخ سلیم سے بھی نیازمندانہ تعلقات پیدا کئے، اور ایک موقع پر ان سے دریافت کیا کہ میرے کتنے لڑکے ہونگے؟ انھوں نے کہا کہ "تین" اکبر نے کہا کہ "میں پہلے لڑکے کو آپ کی تربیت میں دونگا، اور آپ کے لطف وشفقت کو اس کا حامی و حافظ بناؤنگا" شیخ سلیم نے بھی اس کو قبول کر لیا، اور فرمایا کہ "مبارک ہو ہیں بھی اس کو اپنا ہمنام بناؤنگا" جب جہانگیر کی ولادت کا زمانہ قریب آیا تو اکبر نے اس کی ماں کو شیخ سلیم کے مکان پر بھیجدیا تاکہ وہیں ولادت ہو، چنانچہ جب جہانگیر پیدا ہوا، تو اس کا نام شیخ سلیم کے نام پر سلیم رکھا، اکبر نے اس تقریب کی وجہ سے اس موضع کو مبارک خیال کر کے اپنا پائے تخت بنایا، اور چودہ پندرہ سال میں پہاڑون اور جنگلون سے صاف کر کے اسکو ایک عظیم الشان شہر بنا دیا، جو بہت سے باغون اور عمارتون پر مشتمل تھا، ایک مدت تک اس کا یہی نام رہا، لیکن فتح گجرات کے بعد فتح پور کے نام سے موسوم ہوا[1]، تاہم سیکری کا لفظ اب بھی اسکا ایک لازمی جزو ہے، ابوالفضل اس شہر کی تعمیرات کے متعلق آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ بادشاہ کے آنے سے سیکری دنیا کا منتخب شہر ہوگیا، پتھر کا ایک قلعہ تعمیر ہوا جس کے دروازے پر پتھر کے دو ہاتھی نصب تھے، بلند عمارتین تعمیر ہوئیں، اگرچہ دولت خانہ شاہی اور دوسرے امرا کی عمارتیں پہاڑ کے اوپر ہیں، لیکن میدان بھی عمارتون اور باغون سے بھرے ہوئے ہیں، شاہی حکم سے پہاڑ کے اوپر ایک مسجد، ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ تعمیر کی گئی، شہر کے متصل ۱۲ کوس کا ایک عظیم الشان تالاب ہے، اور اس کے کنارے بادشاہ نے ایک سائبان، ایک منار،

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۳

اور ایک چوگان گاہ بنوایا ہے، اور ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا یہین دیکھتے ہیں، ان دونوں شہرون (آگرہ و فتحپور) مین بادشاہ کی توجہ سے ادنی اور باریک کپڑے بنے جاتے ہین اور بہت سے کاریگرون کو فروغ حاصل ہے[1]،

فتحپور کی سب سے مشہور عمارت شیخ سلیم کا روضہ اور جامع مسجد ہے جن کی نسبت جہانگیر نے لکھا ہے.

یکے از اعاظم آثار کہ در عہد دولت و زمان حضرت عرش آشیانی (اکبر) بظہور آمدہ این مسجد و روضہ است، بسے اغراق عمارتے است نہایت عالی تمکین کہ مثل این مسجد در ہیچ بلادے نیست عمارتش ہمہ از سنگ در کمال صفا اساس نہادہ، پنج لک روپیہ از خزانہ عامرہ صرف شدہ تا باتمام رسیدہ[2]،

اشتی براعہد اکبری ۹۶۳ھ | محمد خان نیازی امرائے اکبری و جہانگیری میں ایک مشہور علم دوست اور درویش صفت امیر تھے، پرگنہ اشتی برار ان کی جاگیر میں تھا، اور چونکہ وہ دکن میں رہ چکے تھے، اس لئے اس پرگنہ کو انھون نے اپنا وطن بنا لیا تھا، اس کی آبادی میں اس قدر اضافہ کر دیا تھا، کہ وہ ایک بڑا قصبہ ہو گیا تھا، مرنے کے بعد وہیں مدفون ہوئے، اور ان کے لڑکے احمد خان نے وہان ایک مقبرہ، مسجد اور باغ بنوایا،

صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ یہ قصبہ مدتون زیارت گاہ خلائق رہا، لیکن اب وہ بلکہ پورا پرگنہ بالکل ویران ہو گیا ہے، اور سو گھرون میں سے صرف ایک گھر میں چراغ جلتا ہے، اور دس گانوون میں سے صرف ایک گاؤن سے مالگذاری وصول ہوتی ہے[3]

---

[1] آئین اکبری ج ۲ ص ۸۴ [2] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۶۴، [3] مآثر الامرا حصہ سوم ص ۲۷۶،

حیدرآباد (سلطان محمد قلی قطب شاہ ۹۸۹ھ) چونکہ گولکنڈہ کی آب و ہوا اچھی نہ تھی، اور لوگ آب و ہوا کی خرابی سے اس کو عام طور پر ناپسند کرتے تھے، اس لیے اس شہر سے چار کوس کے فاصلے پر سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۹ھ) نے ایک عمدہ مقام کا انتخاب کیا اور اس جگہ ایک شہر آباد کر کے اپنا دار السلطنت بنایا، اور اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر اس کا نام بھاگ نگر رکھا، بعد کو اس نام سے ندامت ہوئی، اور اس کا نام حیدرآباد رکھا،

فرشتہ لکھتا ہے کہ اس شہر کا دور پانچ کوس کا ہے، اور بازار ہندوستان کے اور شہروں کے برخلاف نہایت موزوں طریقے سے آباد کئے گئے ہیں، آب و ہوا نہایت اچھی ہے اور مسافروں کو موافق آتی ہے، اکثر بازاروں کے دونوں طرف آب رواں کی نہریں جاری ہیں، اور نہروں کے کنارے سایہ دار درخت نصب کئے گئے ہیں، دوکانیں پتھر اور گچ کی بنائی گئی ہیں، اور شاہی عمارتیں ایسی عمدہ ہیں، کہ اور ملکوں میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی[1]،

بہادرپورہ (بہادر خان ۱۰۰۵ھ) بہادر خان اپنے باپ راجہ علی خان کی شہادت کے بعد ۱۰۰۵ھ میں برہانپور میں تخت سلطنت پر بیٹھا، اور برہانپور کے متصل دریائے تپتی کے کنارے بہادرپورہ کے نام سے ایک نہایت عمدہ شہر آباد کیا، صاحبِ مآثر رحیمی نے لکھا ہے کہ یہ شہر اب تک آباد ہے[2]،

شہر نورس پور (ابراہیم عادل شاہ ۱۰۰۸ھ) ابراہیم عادل شاہ نے ۱۰۰۸ھ میں بیجاپور سے ایک کوس کے فاصلے پر نواب شاہ نواز خان کے اہتمام میں اس شہر کی بنیاد ڈالی اور نواب ممدوح نے دور دور سے نہایت ہوشیار، انجنیر، معمار اور سنگتراش بلوا کر محلوں، پوروں،

---

[1] فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۸۳ [2] مآثر رحیمی جلد دوم صفحہ ۴۶۹،

راستوں، بازاروں، عمارتوں اور دوکانوں وغیرہ کے نقشے مرتب کروائے، اور انہی نقشوں کے مطابق تعمیر کا کام شروع ہوا، اور تقریباً آٹھ ہزار نوکر اور مزدور وغیرہ تعمیر کے کام میں لگائے گئے، یہ عملہ تو صرف سرکاری عمارات کے کام میں مشغول رہتا تھا، جو لوگ اعیان و ارکان سلطنت، وزراء، امراء، سپاہیوں، سوداگروں اور دوسرے دولت مند لوگوں کی عمارتوں کو تعمیر کرتے تھے، ان کی تعداد غیر محدود تھی، خاص خاص ملازمین کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے خزانۂ عامرہ سے روپیہ عطا ہوا تھا، تعمیر کے کام میں باہم مسابقت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، اس بنا پر ہر شخص نے حسب مقدور عمارتوں اور باغوں کی تیاری میں نہایت تکلف سے کام لیا، اور نواب شاہ نواز خان کی مستعدی اور سرگرمی سے تھوڑے ہی دنوں میں یہ عظیم الشان کام تکمیل کے درجہ کو پہونچ گیا،

خاص بادشاہ یعنی ابراہیم عادل شاہ کے لئے ایک نہایت عظیم الشان محل تعمیر کیا گیا جس کے طلائی اور لاجوردی سقف و ستون اور منقش در و دیوار ارژنگ مانی کو مات کرتے تھے، اس کے چاروں طرف چمن بندی کی گئی تھی، اور اس میں ہر قسم کے پھول اور پھل نہیا کئے گئے تھے،

محل کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جس میں نوکروں، خدمتگاروں اور سپاہیوں وغیرہ کے رہنے کے لئے مکانات بنوائے گئے تھے، محل کے عقب میں بیگمات کے محلات تھے، جو نہایت پر تکلف اور آراستہ تھے، دربار کے سامنے سے ایک بازار کا ہموار راستہ بیجاپور تک چلا گیا تھا، اور اس کے دونوں طرف دوکانیں بنی ہوئی تھیں، جن کے اوپر بالا خانے اور کمرے تھے، بیچ میں ایک اور چھوٹا سا وسیع بازار تھا جس کو مانک چوک کہتے تھے، اس کے چاروں طرف راستے تھے

جو آبادی کے اخیر حصے تک چلے گئے تھے، اور انکے دونون طرف عمدہ دوکانین بنی ہوئی تھین، بازار کے عقب میں دونون طرف، امراء ارکان اور تاجرون اور دولت مند لوگون نے عمارتین، حویلیان، دیوان خانے حوض اور باغ بنوائے تھے،

شاہ نواز خان نے خاص اپنے لئے ایک نہایت عمدہ محل بنوایا تھا، اور اس کے چارون طرف باغ لگوائے تھے،

اس کا نام نورس پور اس لئے رکھا گیا کہ جس دن اس شہر کا سنگ بنیاد رکھا گیا، ایک دیہاتی نے ابراہیم عادل شاہ کے سامنے تحفۃً شراب کی ایک بوتل پیش کی، اس نے یہ شراب استعمال کی تو ایک عجیب قسم کا سرور حاصل ہوا، جو اب تک اور شرابون کے استعمال سے حاصل نہیں ہوا تھا، اسی سرور کی حالت میں اس نے کہا،

مارا کیفے نو رسیدہ

اور اُسی وقت سے بطور تفاول کے اس شہر کا نام نورس پور رکھدیا، اور یہ لفظ اس کو اسقدر پسند آیا کہ تقریباً اس کے عہد کی ہر چیز کا جزو ہو گیا، مثلاً سکۂ نورس، علم نورس، نشان نورس، فلس نورس، محل نورس اور عید نورس وغیرہ[۱]،

فتح آباد جاگیر ع۱۰۱۵ھ جہانگیر کے عہد حکومت میں جب شہزادہ خسرو نے بغاوت کی اور شیخ فرید بخاری نے اس کو پرگنہ بھیروال میں شکست دی تو اس فتح کے صلے میں جہانگیر نے ان کو مرتضیٰ خانی کا خطاب دیا، اور جس مقام پر انھون نے فتح حاصل کی تھی، ان کی درخواست پر ایک شہر آباد کر کے اس کا فتح آباد رکھا، اور اس پرگنہ کو ان کی جاگیر میں دیدیا[۲]،

---

۱ بساتین السلاطین ص ۲۴۳ تا ص ۲۵۰ ۲ خلاصۃ التواریخ ذکر جہانگیر،

یہ صاحب خلاصۃ التواریخ کی روایت ہے لیکن خافی خان نے لکھا ہے کہ جہانگیر نے اس مقام پر جو قصبہ آباد کرایا تھا، اس کا نام فرید آباد رکھا تھا[1]۔

مراد آباد عہد شاہجہان ۱۰۳۶ھ | اس شہر کو شاہجہان کے زمانے میں رستم خان نے اپنے بیٹے مراد بخش کے نام پر آباد کیا[2]،

مخلص پور | شہر سرمور کے پاس جہاں دریائے جمنا پہاڑ سے نکلکر مسطح زمین پر گرتا ہے، شاہجہان نے لب دریا دولت خانہ تعمیر کروایا، اور دوسرے امراء و اعیان نے بھی حسب حیثیت عمارتیں تعمیر کروائیں، رفتہ رفتہ ایک آبادی قائم ہو گئی، جس کا نام مخلص پور پڑا، شاہجہان اکثر اوقات اس جگہ سیر و تفریح کے لئے آتا تھا، اور مسرت اندوز ہوتا تھا،

شاہ نہر یہیں سے نکال کر شاہجہان آباد میں لے گئے ہیں[3]،

وزیر آباد عہد شاہجہان ۱۰۳۶ھ | وزیر خان حکیم علیم الدین امرائے شاہجہانی میں ایک مشہور امیر تھے، تعمیرات کا نہایت شوق تھا، لاہور میں حمام، بازار اور متعدد حویلیاں بنوائی تھیں، بالخصوص لاہور میں ان کی جامع مسجد نہایت مشہور ہے، اور اب تک موجود ہے، قصبہ چنیوٹ کو جو ان کا جنم بھوم تھا، گویا نئے سرے سے آباد کیا، شہر کے گرد ایک پختہ فصیل قائم کی، پختہ عمارتیں بنوائیں، دوکانیں مسجدیں، مدرسہ، شفاخانہ، کنوئیں، اور تالاب بنوائے۔ اور ان سب کو اہل وطن پر وقف کر دیا،

لاہور کے پاس قصبہ وزیر آباد انہی کا آباد کیا ہوا ہے[4]،

---

[1] خافی خان جلد اول ص ۲۵۴، [2] معجم الامکنہ ص۔ [3] خلاصۃ التواریخ ذکر صوبہ شاہجہان آباد، [4] مآثر الامراء حصہ سوم صفحہ ۹۳۵-۹۳۶

دلی یا شاہجہان آباد | قدیم زمانے مین ہندوستان کے راجاؤن کا پایہ تخت ہستناپور تھا، جو گنگا کے کنارے دلی سے تخمیناً سو میل دور ہے، لیکن جب پانڈوون اور کورووں میں جنگ ہوئی تو پانڈوون نے ہستناپور کو چھوڑ کر اندرپت کو اپنا دارالسلطنت بنایا، اور صاحب مآثر الامراء کے نزدیک دلی کا قدیم نام یہی ہے[1]، لیکن اب اس شہر کا نام و نشان باقی نہین رہا، البتہ شاہجہان آباد کے جنوب کی طرف دلی دروازے کے باہر جو زمین ہے، وہ اندرپت کی زمین کہلاتی ہے، اس کے بعد تنوریون کے خاندان میں سے ایک راجہ نے اندرپت کے قریب ایک نیا شہر آباد کیا، چونکہ وہان کی زمین نرم تھی، اور ہندی میں دہلی نرم زمین کو کہتے ہیں، اس لئے اندرپت کے بجائے وہ شہر دہلی کے نام سے مشہور ہوا، لیکن صحیح یہ ہے کہ قنوج کے راجہ دہلو نے اس شہر کو اپنے نام پر آباد کیا تھا، اور اسکا قدیم نام بھی دہلو تھا، چنانچہ امیر خسرو نے ایک شعر میں یہی نام لیا ہے، بعد کو یہی نام دہلی ہو گیا،

اس کے بعد جب چوہانون کا دور حکومت شروع ہوا تو اس خاندان کے ایک راجہ رائے پتھورا نے اپنے نام پر ایک قلعہ اور ایک شہر آباد کیا، اور وہ ایک مدت تک مسلمان بادشاہون کا بھی دارالسلطنت رہا، چنانچہ سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان شمس الدین التمش کا صدر مقام بھی قلعہ رائے پتھورا تھا، اور سلطان قطب الدین ایبک نے اسی قلعہ میں ایک محل بنوایا تھا، جسکا نام قصر سفید تھا،

اس کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن نے کوشک لال کے پاس جس کو اس نے اپنے بادشاہ ہونے سے پہلے تعمیر کروایا، ایک قلعہ بنوایا، جو پہلے معلوم نہیں کس مناسبت سے مرزغن کے نام سے مشہور ہوا، اور اب غیاث پور کے

---

[1] مآثر الامراء جلد سوم ص ۴۶۷،

نام سے مشہور رہے،

اس کے بعد سلطان معز الدین کیقباد نے دریائے جمنا کے کنارے ایک شہر آباد کیا جس کے نام کیلو کھڑی رکھا جو ایک گانون کا نام تھا، سلطان جلال الدین فیروز خلجی نے اسی شہر کو اپنا پایۂ تخت بنا کر اس کی ناتمام عمارتون کی تکمیل کی اور ایک بڑا محل بنوایا جس کا نام بھی کوشک لال تھا، اور اب یہ شہر نیا شہر کے نام سے مشہور ہوا،

... اس کے بعد سلطان علاء الدین خلجی نے ایک قلعہ جہان پہلے ایک گانون سیری کے نام سے آباد تھا بنوایا جو پہلے اس گانون کی نسبت سے قلعہ سیری کے نام سے مشہور ہوا، اور بعد میں اس کو شک سیری بھی کہنے لگے، علاء الدین خلجی کا پایۂ تخت یہی مقام تھا، اور اسی کو دہلی علائی کہتے ہیں،

اس کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق نے ایک شہر تغلق آباد کے نام سے آباد کیا، پھر اس کے لڑکے سلطان محمد فخر الدین جونا نے ایک نیا شہر آباد کیا، چونکہ اُس نے اپنا لقب سلطان محمد عادل تغلق شاہ رکھا تھا، اس لئے یہ شہر محمد آباد اور عادل آباد کے نام سے مشہور ہوا، اس میں جو قلعہ تعمیر کیا تھا چونکہ اس میں سنگ مرمر کے ایک ہزار ستون لگوائے تھے، اس لئے اس کو ہزار ستون بھی کہتے تھے، اس کے بعد فیروز شاہ نے فیروز آباد کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا، اور فیروز آباد سے تین کوس کے فاصلے پر ایک محل تیار کروایا جس کا نام جہان نما تھا، پھر جب خضر خان رایات اعلیٰ بادشاہ ہوا تو اس نے ایک شہر خضر آباد کے نام سے آباد کیا، اور اس کے بیٹے مبارک شاہ نے اپنے نام پر ایک دوسرا شہر مبارک آباد کے نام سے آباد کیا،

اس کے بعد ہمایون کا دور سلطنت شروع ہوا، تو اس نے نئے سرے سے

قلعہ اندرپت کی ترمیم وتعمیر کرواکے اس کا نام دین پناہ رکھا اور اس کو اپنا پائے تخت بنایا، پھر شیر شاہ نے دہلی علائی کو چھوڑ کر اندرپت کے پاس ایک نیا شہر آباد کیا لیکن غالبًا یہ کوئی نیا شہر نہ تھا بلکہ ہمایوں نے جو شہر آباد کرنا شروع کیا تھا، وہ نامکمل رہ گیا تھا، شیر شاہ نے اسکی تکمیل کی[1] غرض اس ردوبدل سے دلی مختلف شہروں کے مجموعے کا نام تھا، جس کا ہر جزو الگ الگ نام سے بھی موسوم تھا، اور بعض اوقات اس پورے مجموعے کو بھی دلی کہتے تھے، چنانچہ قلقشندی صبح الاعشیٰ میں لکھتا ہے کہ دلی مختلف شہروں کے مجموعے کا نام ہے، جن میں ہر شہر الگ الگ نام سے موسوم ہے، اور دلی بھی اسی مجموعے کا ایک جزو ہے، شیخ ابوبکر بن خلال کا بیان ہے کہ اسوقت جس شہر کو دہلی کہتے ہیں، وہ اکیس شہروں کا مجموعہ ہے، شیخ مبارک کہتے ہیں کہ دلی بہ میل کے دور میں آباد ہے، اس کی عمارتیں اینٹ اور پتھر سے بنائی گئی ہیں، اور چھتوں میں لکڑیاں لگی ہوئی ہیں، زمین سنگ مرمر کے قسم کا سفید پتھر بچھایا گیا ہے، مکانات زیادہ سے زیادہ دو منزلہ لیکن زیادہ تر یک منزلہ ہیں، مکانات میں بادشاہ کے سوا کسی اور کو سنگ مرمر کے بچھانے کا حق حاصل نہیں، یہاں ایک ہزار مدرسے قائم ہیں، جن میں صرف ایک مدرسہ شافعیوں کا اور بقیہ مدارس حنفیوں کے ہیں، اسی طرح ستر شفاخانے ہیں، دو ہزار خانقاہیں اور بہت سی زیارت گاہیں ہیں، بازار نہایت کشادہ اور وسیع ہیں، اور بہ کثرت حمام موجود ہیں،

دلی تمام ہندوستان کا دارالسلطنت اور بادشاہ کا صدر مقام ہے، ایک وسیع سلسلۂ محلات قائم ہے جن میں سلطان، حرم سلطانی اور خدم وحشم کے رہنے کے لئے الگ الگ محل ہیں، خواتین وامراء بادشاہ کے ساتھ نہیں رہ سکتے صرف

---

[1] خلاصۃ التواریخ ذکر شاہ جہان آباد و آثار الصنادید

کام کے وقت محل میں آتے ہیں، پھر اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں، دلی کے تین طرف یعنی مشرق، جنوب، اور شمال میں باغ لگے ہوئے ہیں۔ صرف مغربی جانب ایک پہاڑی کی وجہ سے خالی ہے[1]،

یہ تمام تعمیرات شاہ جہانی دور حکومت سے پہلے ہو چکے تھے۔ اس کے بعد شاہجہان کا دور حکومت آیا تو اس نے دلی کو نئے سرے سے آباد کیا، اور اس وقت سے دلی کا دوسرا نام شاہجہان آباد ہو گیا، خافی خان نے لکھا ہے کہ ہر محلہ کسی نہ کسی ایرانی امیر کے نام پر آباد کیا گیا تھا، اور ہر محلے میں کسی نہ کسی ایرانی امیر نے اپنی حویلی ضرور بنوائی تھی[2]، دلی میں شاہجہان نے خود جو عمارتیں تعمیر کروائیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) قلعہ معلی اور اسکی متعلقہ عمارتیں قلعہ کے دائیں بائیں، امرا، اور شاہزادوں نے جو عالی شان عمارتیں دریا کے کنارے تعمیر کروائی تھیں۔ ان کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا۔

(۲) شہر کی فصیل جو چار لاکھ روپیہ میں تیار ہوئی،

(۳) جامع مسجد جس پر دس لاکھ روپیہ صرف ہوا،

(۴) قلعہ تک ایک نہر جاری کی، اس نہر کو سب سے پہلے سلطان فیروز خلجی دریائے جمنا سے نکال کر قصر سفیدون تک جو اس کا شکار گاہ تھا، لایا تھا، اس کے انتقال کے بعد وہ پٹ گئی تو اکبر کے زمانے میں شہاب الدین احمد خان نے اس کی مرمت کروائی اور اب وہ شہاب نہر کے نام سے مشہور ہوئی، شہاب الدین احمد خان کی وفات کے بعد پھر وہ پٹ گئی، تو شاہجہان نے اس کی مرمت کروائی، اور قصر سفیدون سے قلعہ تک ۲۰ کوس کی ایک اور جدید نہر کھدوا کر اس سے ملائی۔

---

[1] صبح الاعشیٰ جلد ۵ ص ۷۹ [2] خافی خان جلد دوم ص ۳۲۷،

اس کے بعد اور امراء و خواتین، عمارتیں اور مسجدیں بنواتے رہے، اور ظفر خان المخاطب
بہ روشن الدولہ نے ایک چوک بنوایا، جو چاندی چوک کے نام سے اب تک مشہور ہے[1]،

ابراہیم آباد عہد شاہجہانی ۱۰۳۶ھ | دریائے چناب کے کنارے سودہرہ ایک بڑا قصبہ تھا، اس کے
متصل شاہجہان کے زمانے میں امیر الامراء علی مردان خان نے اپنے لڑکے ابراہیم کے نام
پر ایک شہر ابراہیم آباد کے نام سے آباد کیا، اور شالامار کے طرز کا ایک عمدہ باغ بنوایا،
اور بہت سی شاندار عمارتیں تعمیر کروائیں، اور دریائے توہی سے ایک نہر نکلوا کر باغ
تک جاری کیا، عمارت، باغ اور نہر پر چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا اور سودھرہ کے دیہات
میں سے ایک گاؤں باغ اور نہر کی مرمت کے لیے سرکار شاہی سے ملا[2]

اشرف آباد عہد شاہجہانی ۱۰۳۶ھ | معتمد خان امرائے جہانگیری و شاہجہانی میں ایک مشہور امیر تھے،
ان کے بھائی محمد اشرف نے لکھنؤ کی حولداری کے زمانے وہاں بہت سی شاندار عمارتیں
بنوائی تھیں، اور ایک پورہ اشرف آباد کے نام سے آباد کیا تھا، جس میں ایک باغ بنوایا تھا،
جو عام سیرگاہ تھا، "بوستان دوستان" اس کی تاریخ ہے[3]،

اورنگ آباد عالمگیر (عہد شاہجہانی ۱۰۳۶ھ) | دکن میں دولت آباد کو جس کا قدیم نام دھارا گیر اور دیو گیر تھا،
سلطان محمد تغلق نے آباد کیا تھا، لیکن وہ چند روز کے بعد ویران ہو گیا، اور بعد کو بھی
کسی بادشاہ نے اس کے آباد کرنے کا قصد نہیں کیا، بلکہ سلطان علاء الدین بہمنی نے
اس کے بجائے احسن آباد کے نام سے گلبرگہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اور شہر دولت آباد
میں قصبہ کھڑکی کے سوا آبادی کا نام و نشان باقی نہ رہا، لیکن شاہجہان کے عہد حکومت
میں جب اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا، تو اس نے زین العابدین خوانی

---

[1] مآثر الامراء حصہ سوم ص ۶۷۳ [2] ص ۴۴، ۴۴ خلاصۃ التواریخ ذکر لاہور، [3] مآثر الامراء حصہ سوم ص ۴۴۳

اہتمام میں قلعہ دولت آباد سے سات کوس کے فاصلے پر ایک عظیم الشان شہر اورنگ آباد کے نام سے آباد کیا، جس کی نسبت خافی خان لکھتا ہے:

"الحق درین عصر از طرف و فور آب و اعتدال ہوا و رنگینی رستہ و بازار و نیز از اقسام میوہ و فواکہ شہر مثل او دیگر در دکھن نیست"[1]

عظیم آباد عہد عالمگیر ۱۱۰۶ھ | شہزادہ عظیم الشان شاہ عالم بہادر شاہ کا لڑکا اور عالمگیر کا پوتا تھا اور عالمگیر نے اس کو بہار و بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا تھا، اس کا دار السلطنت بردوان تھا، اور یہاں اس نے ایک جامع مسجد اور بہت سی عمارتیں بنوائی تھیں، ہوگلی میں شاہ گنج عرف عظیم گنج اسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ لیکن اس کے نام کو جس چیز نے آج تک زندہ رکھا ہے، وہ صوبہ بہار کا مشہور شہر عظیم آباد ہے جس کو اس نے اپنے نام پر آباد کیا ہے،

اس شہر کے آباد کرنے کی تقریب یہ ہوئی کہ عالمگیر نے شاہزادے کی بعض بے عنوانیوں سے ناراض ہو کر اس کو صوبہ بنگال کے چھوڑنے اور صوبہ بہار میں قیام کرنے کا حکم دیا، اور وہ بنگال سے براہ راست مونگیر میں آیا، شاہ شجاع نے یہاں سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی جو پر تکلف عمارتیں تعمیر کروائی تھیں، وہ اگرچہ اس کے قیام کے لئے کافی تھیں، تاہم چونکہ وہ بے مرمت تھیں، اور ان کے مرمت کرنے کے لئے صرف کثیر کی ضرورت تھی، اس لئے اس نے وہاں قیام کرنا پسند نہیں کیا، بلکہ پٹنہ کی آب و ہوا اس کو پسند آئی اور وہیں قیام پذیر ہو گیا، اور یہیں عالمگیر کے حکم کے بموجب اپنے نام پر شہر عظیم آباد کو آباد کیا، اور اس میں ایک قلعہ اور شہر پناہ

---

[1] خافی خان حصہ اوّل صفحہ ۴۸۹، [2] ریاض السلاطین ص ۲۴۲،

بنوایا،[1]

محمود پورہ عہد عالمگیری ۱۰۶۳ھ | امرائے عالمگیری مین وزیر خان محمد طاہر خراسانی نے اورنگ آبادمین ایک باغ بنوایا، اور شہر کے باہر ان کے بھائی مرزا محمود نے تالاب خرد اور اسلام خان مشہدی کے روضہ کے درمیان ایک گانون محمود پورہ کے نام سے آباد کیا، ان کے بیٹے تقی خان نے اس مین تالاب کے کنارے ایک عالی شان حویلی بنوائی، جس میں بعض شہزادون نے قیام کیا تھا، ان کے بیٹے مرزا عبدالرحیم اس حویلی میں مدتون عیش وعشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے. صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ اب اگرچہ اس خاندان کا کوئی شخص باقی نہیں رہ گیا ہے، لیکن یہ حویلی اب تک قائم ہے،[2]

بھکر | اسلامی شہر ہے، سید محمد بن شجاع کی یہان صبح کے تڑکے آئے چونکہ عربی زبان میں صبح کے تڑکے کو بکرہ کہتے ہیں، اس لئے انھون نے کہا، جعل اللہ بکرتی فی البقعۃ المبارکۃ خدانے میری صبح ایک مبارک جگہ کی' اسوقت سے اس کا نام بکر پڑ گیا، اور بعد کو یہی لفظ بھکر ہو گیا،[3]

اس کو منصورہ بھی کہتے ہیں،

سامانہ | کسی خاص بانی کا نام معلوم نہیں، لیکن یہ شہر مسلمانون کا آباد کیا ہوا ہے،[4]

پورے | ہندوستان مین جو گانون آباد ہیں، ان میں بہت سے گانون کے آخر میں "پور"، کا لفظ لگا ہوا ہے، جو پورہ کا مخفف ہے، اور یہ پورے زیادہ تر مسلمان سلاطین

---

[1] ریاض السلاطین صفحہ ۲۵۰، [2] مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۹۳۹، [3] معجم الامکنہ صفحہ ۱۳

[4] معجم الامکنہ صفحہ ۳۰

و امراء کے آباد کئے ہوئے ہیں. صاحب مرأۃ احمدی نے لکھا ہے کہ ابتدا میں جب احمد آباد آباد کیا گیا، تو چونکہ اس وقت آبادی زیادہ نہ تھی، اس لئے گجرات کے ہر ایک امیر اور شاہزادے نے ایک حصار کے اندر اپنے رہنے کے لئے ایک جگہ متعین کرلی، اور یہی جگہ ان کے نام کی نسبت کے ساتھ پورہ کے نام سے مشہور ہوگئی، مثلاً تاج پورا اور جمال پور وغیرہ، لیکن جب شہر پوری طور پر آباد ہو گیا تو شہر کے باہر آبادی شروع ہوئی اور نہایت کثرت سے پورے آباد ہو گئے، جن کی تعداد ۳۶۰ بلکہ ایک روایت کے مطابق ۳۸۰ تھی، اور یہ تمام پورے گجراتی امراء نے اپنے نام پر آباد کئے تھے، اور انہی میں خدم وحشم کے ساتھ سکونت رکھتے تھے،

یہ پورے درحقیقت چھوٹے شہر تھے جن میں تمدن کے تمام ضروری ساز وسامان موجود تھے، چنانچہ صاحب مرأۃ احمدی نے پورہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے،

"پورہ عبارت از جملہ بزرگے است مشتمل بر عمارات عالی و مزارہائے

مملو از نفائس و فواکہ کہ ہر کدام درحقیقت شہریست عظیم"[1]

ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے کہ ہر پورہ کثرت آبادی کے لحاظ سے گویا ایک شہر تھا، تذکرۃ الملوک کے مؤلف نے لکھا ہے کہ عثمان پور میں کم از کم کاریگروں کی بارہ ہزار دوکانیں تھیں، اور فتنہ وفساد کے ظہور سے پہلے تمام پورے تاجروں، کاریگروں اور اہلکاروں سے بھرے ہوئے تھے، اور نہایت پرتکلف اور شاندار عمارتیں ان میں موجود تھیں، بعد کو اگرچہ یہ پورے ویران ہو گئے، اور اکبر کی فتح کے بعد ان کی آبادی میں کافی تغیر وتبدل ہو گیا، تاہم بعض کے نام اب بھی باقی رہ گئے،[2] اور بعض نئے پورے آباد ہوئے،

---

[1] مرات احمدی جلد اول صفحہ ۱۱۸، [2] مرات احمدی جلد دوم ص ۷

چنانچہ ان کے نام حسب ذیل ہیں،

قاضی پور | شاہ پور ایک قدیم آبادی تھی، عالمگیر کے زمانے میں قاضی القضاۃ خواجہ عبداللہ نے اس کو نئے سرے سے اپنے نام پر آباد کیا،

حاجی پور | حاجی بہار الدین المخاطب بعضد الملک نے جو سلطان محمود بیگڑہ کے امراء میں تھے، اس کو آباد کیا، اور اس میں ایک مسجد بنوائی،

دریاپور | اس کو سلطان محمود بیگڑہ کے امراء میں دریا خان نے آباد کیا،

پناہ پور | بہادر خان ناظم صوبہ نے جسکا نام محمد پناہ تھا، عالمگیر کے زمانے میں اس کو اپنے نام سے آباد کیا،

جہانگیر پور | جہانگیر کے نام پر آباد کیا گیا،

ہیبت پور | سلاطین گجرات کے امراء میں اس کو ہیبت خان نے آباد کیا،

بی بی پور | سلاطین گجرات کے عہد میں بی بی ماں نے جو خاندان چشتیہ سے تعلق رکھتی تھیں، اپنی سکونت کے لئے اس کو آباد کیا تھا، اور انکا مزار مسجد و خانقاہ کے ساتھ اس میں موجود تھا،

نور اللہ پور | اس کو شیخ نور محمد نے جنکا خطاب امانت خان تھا، فرخ سیر کے زمانہ میں آباد کیا،

سارنگ پور | امرائے محمودی میں ملک سارنگ کا آباد کیا ہوا تھا،

افضل پور | سلطان محمود ثانی کے امراء میں افضل خان نے اس کو آباد کیا،

طوغان پور | طوغان نے جو امرائے محمودی میں تھا، اس کو آباد کیا،

منجھن پور | شاہ عالم قدس سرہ کے نواسے سید مسعود نے اس کو اپنے نانا کے نام پر

آباد کیا،

بابی پورہ	اس کو صفدر خان بابی نے آباد کیا،
نواپورہ، گنج پورہ، سلطان پور	سید عبدالرحیم رفاعی نے آباد کیا،
معصوم پور	معصوم قلی عرف شجاعت خان نے اس کو نئے سرے سے آباد کیا،
مراد گنج	شاہزادہ مراد بخش کے زمانۂ نظامت میں آباد ہوا،
وہاب گنج	عالمگیر کے زمانے میں قاضی القضاۃ عبدالوہاب نے اپنے نام سے آباد کیا،
سید پور	سلطان احمد کے امرا میں سید عطاء اللہ نے آباد کیا،
چنگیز پور	سلطان محمود ثانی کے غلام چنگیز خان نے آباد کیا،
بہادر گنج	سلطان بہادر گجراتی نے آباد کیا،
اکرم پور	اکرم الدین خان صدر صوبہ نے بہادر شاہ کے زمانے میں آباد کیا،
مفاخر پور	اسی زمانے میں اکرم الدین خان کے بھائی ابو المفاخر خان نے آباد کیا،
علیم پور	خداوند خان ملک علیم نے جو سلطان احمد کے امرا میں تھا، اس میں ایک مسجد بنوائی، اور اس کا مقبرہ بھی یہیں ہے،
فرح پور	اس کو قاضی پور بھی کہتے ہیں، ابو الفرح خان قاضی شہر نے عالمگیر کے زمانے میں آباد کیا، اور ایک مکان اور پُرتکلف مسجد بنوائی، اور یہیں قیام اختیار کیا،
نور گنج	جس زمانے میں جہانگیر گجرات میں مصروف سیر وشکار تھا، نورجہان بیگم کے نام پر آباد ہوا،
زور آور پور	جو انمرد خان بابی نے نئی عیدگاہ کے نزدیک اپنے چھوٹے لڑکے کے نام پر آباد کیا،
رسول آباد	حضرت شاہ عالم قدس سرہٗ نے آباد کیا تھا، اور یہیں سکونت رکھتے تھے، اور آپ کا مزار بھی یہیں ہے،

پورہ رضوی خان | عالمگیر کے زمانے میں رضوی خان صدر صوبہ نے آباد کیا،

عیش پور | رسول آباد اور موضع ٹبوہ کے درمیان ملک عیش المخاطب بہ نظام الملک نے جو امرائے محمودی میں تھا، اپنے نام پر آباد کیا تھا، اور ایک مسجد، تالاب، باغ اور اپنا مقبرہ اس میں بنوایا تھا، اور اس کے گرد ایک پختہ فصیل قائم کی تھی،

خودن پورہ | امرائے سلاطین گجراتیہ میں ملک خودن نے آباد کیا، چونکہ یہاں زیادہ تر حضرت شاہ عالم کے خادم اور مرید رہتے تھے، اس لئے حضرت ممدوح نے اس کا نام خویدم پورہ رکھ دیا،

قطب پور | غالباً حضرت قطب عالم قدس سرہٗ کے زمانۂ قیام میں انہی کے نام سے آباد ہوا،

قاسم پور | عالمگیر کے زمانے میں میر قاسم نے آباد کیا،

راجو پور | حضرت شاہ عالم کے نواسوں نے آباد کیا،

خانپور | سید حسن خان نے عالمگیر کے زمانے میں آباد کیا،

عثمان پور | حضرت قطب عالم قدس سرہٗ کے خلفاء میں سید عثمان نے آباد کیا،

نورنگ پور | عالمگیر کے زمانے میں نورنگ نے آباد کیا،

صلابت پور | صلابت خان نے آباد کیا،

شادمان پور | اکبر کے زمانے میں اعظم خان کے لڑکے شادمان نے آباد کیا،

تیغ پور | سلطان محمود بیگڑہ کے پیر شیخ رحمت اللہ نے آباد کیا،

سلطان پور | کمال الدین جوانمرد خان نے اس کو اپنے لڑکے کے نام پر آباد کیا،[1]

---

[1] مرات احمدی جلد دوم ص ۷ تا ۱۱،

باغات

از مولانا عبد السلام ندوی

زمین کی پیداوار میں درخت، پھول، پھل، اور میوے نہایت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، اور اس تمدنی ترقی کے سلسلے میں ہم کو فیروز شاہ کا نام نہایت نمایاں نظر آتا ہے، شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ کو باغات کے لگانے کا نہایت ذوق تھا، جن میں مختلف قسم کے انگور پیدا ہوتے تھے، اور ایک پیسہ سیر کے حساب سے فروخت ہوتے تھے،[۱]

فیروز شاہ نے شہر حصار فیروزہ کو آباد کیا تو نہایت کثرت سے درخت اور باغات لگوائے جن میں ہر قسم کے پھول اور پھل ہوتے تھے، شمس سراج عفیف نے بعض پھلوں کے یہ نام بتائے ہیں، سداپھل، جھجری، نارنگ، سکندرا ول، ان کے علاوہ ہر قسم کے پھول، گنے اور پونڈے تیار ہوتے تھے، جن میں نہایت لطافت پائی جاتی تھی،[۲]

فیروز شاہ کے بعد سلطان محمود بیگڑہ نے گجرات میں نہایت کثرت سے پھلدار درخت مثلاً آم، انار، کھرنی، جامن، گولر، بیل اور مہوے لگوائے،[۳] اور اس کے زمانے میں بعض امرار نے انجیر اور بانس کا درخت بیجانگر اور دکن سے منگوا کر گجرات میں لگوایا،[۴]

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف صفحہ ۲۹۵، ۲۹۶ [۲] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف صفحہ ۱۲۸ [۳] مرأت سکندری ص ۸۰، [۴] مرات سکندری ص ۱۳۳

اس کے بعد تیموریوں کا دور شروع ہوا تو انھوں نے پھلوں، پھولوں اور باغوں کی ترقی میں اور بھی زیادہ لطافت و نفاست سے کام لیا، اور اکبر کے زمانے میں اس میں خاص طور پر ترقی ہوئی، مثلاً میووں میں شیرینی اور لطافت پیوند لگانے سے زیادہ ہو جاتی ہے، لیکن اکبری دور سے پہلے ہندوستان میں پیوند لگانے کا بالکل رواج نہ تھا، سب سے پہلے اکبر کے زمانے میں محمد قلی افشار نے جو کشمیر میں داروغۂ باغات تھا، کابل سے شاہ آلو منگا کر پیوند لگایا، اور پھر عام رواج ہو گیا، لیکن اکبر کے زمانے تک آم کی قلم نہیں لگ سکتی تھی، چنانچہ خافی خان لکھتا ہے،

"محمد قلی افشار داروغۂ باغات کشمیر در عہد عرش آشیانی اول نہال شاہ آلو از کابل طلبیدہ پیوند نمودہ آب و ہوائے آنجا موافق آمد از ان ایام رواج یافت و سال بسال در ہمہ بلاد ہندوستان ازین پیوند میوہائے شاداب و شیرین بالیدہ گردید الا درخت انبہ را پیوند نتوانستند نمود"[۱]

جہانگیر تزک میں لکھتا ہے،

"پیش از عہد دولت حضرت عرش آشیانی شاہ آلو مطلقاً نبود محمد قلی افشار از کابل آوردہ پیوند نمود تا حال دہ پانزدہ درخت بیار آمدہ زرد آلو پیوندی نیز درخت چند معدود بود و مشارالیہ پیوند را درین ملک شائع ساخت"[۲]

شاہ آلو کے علاوہ اکبر کے زمانے میں اور بھی بہت سے میوے ولایت سے ہندوستان

---

[۱] خافی خان حصہ اول ص ۲۰۳ [۲] تزک جہانگیری ص ۳۰۴،

میں آئے، اناناس بھی اسی زمانے میں یورپ سے آیا، چنانچہ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے،

"در ایام دولت حضرت عرش آشیانی اکثر میوہ ہائے ولایت کہ در ہند نبود بہم رسید اقسام انگور را از صاحبی وحبشی وکشمشی در شہر ہائے مقرر شائع گشت ... از جملہ میوہ ہا میوہ ایست کہ آن را اناناس مے نامند در بنادر فرنگ مے شود در غایت خوشبوئی وراست مزگی است در باغ گل افشان آگرہ ہر سال چندین ہزار بر مے آید[1]"

ابوالفضل آئین اکبری میں دلی کے ذکر میں لکھتا ہے،

بر نے جا کشت وکار سہ فصلہ شود، میوہ ایرانی وتورانی وہندی وگوناگون گلہائے فراوان[2]

پستہ آجکل ہندوستان میں پیدا نہیں ہوتا لیکن اکبر کے زمانے میں پستہ کا درخت لگایا گیا، اور بار آور ہوا، اس کے علاوہ جو پھل اور میوے پیدا ہوتے تھے، ان کی زراعت وتجارت میں ترقی ہوئی چنانچہ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے،

ازین رو کارندگان ایران توران خانہ دار آمدند و کشت کار آں را روز بازار شد وخربزہ وانگور فراوانی پذیرفت و گزیدگی یافت وہندوانہ ترنبہ وشفتالو وبادام وپستہ وانار وخیر آن پیدائی گرفت از ان باز کہ کابل وقندھار وکشمیر برقلمرو فزود آمدہ بار در بار آمد[3]

اکبر کا دور سے پہلے گجرات میں خربزے نہیں ہوتے تھے، سب سے پہلے عبدالرحیم

---

[1] تزک جہانگیری ص ۴، [2] آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۱۳۴، [3] آئین اکبری جلد اول ص ۳۴،

خانخانان نے آدمی بھجکر عراق اور خراسان سے تخم منگوائے اور گجرات کے ایک گانون بلگوارہ
مین جس کی آب وہوا مناسب تھی، اس کی کاشت کرائی، پہلے سال نہایت عمدہ خربزے پیدا
ہوئے، اور دو سال مین اس قدر ترقی ہوئی کہ عراق وخراسان کے لوگ بھی اس قدر ترقی
نہیں کرسکتے تھے[1]

آم اگرچہ بنگال، گجرات، مالوہ، خاندیس اور دکن مین بہ کثرت ہوتا تھا، لیکن پنجاب مین کم
پیدا ہوتا تھا، جب اکبر نے لاہور کو تخت گاہ بنایا، تو اس کی پیداوار مین کسی قدر اضافہ ہوا[2]،
خوشبودار اور باغون کی زیب وزینت کے درخت ہندوستان مین نہیں ہوتے تھے،
اکبر کے زمانے مین صندل، سرو، صنوبر اور چنار کے درخت نہایت کثرت سے باغون
مین لگائے گئے، چنانچہ ابوالفضل آئین اکبری مین صندل کی نسبت لکھتا ہے،

صندل بہندی چندن گویند درختے است درچمن درین دولت
جاوید آوردند وسرسبز شد[3]

جہانگیر تزک مین لکھتا ہے،

دار درختان سرو وصنوبر وچنار وسفیدار وبید مولہ کہ ہرگز در
ہندوستان خیال نکردہ بودند بہم رسیدہ وبسیار شدہ ودرخت صندل
کہ خاصہ جزائر بود درباغات نشو ونما یافتہ[4]،

پھول ہندوستان مین یون بھی نہایت کثرت سے ہوتے تھے، لیکن تیموریون
کی خوش مذاقی نے اس پر قناعت نہیں کی، بلکہ یورپ اور ایران کے پھول منگوا کر ہندوستان

---

[1] مآثر رحیمی جلد دوم صفحہ ۶۰۳ [2] آئین اکبری جلد اوّل صفحہ ۹۴ [3] ایضاً ص ۶۱
[4] تزک جہانگیری ص ۴

کو ایران کا چمن زار بنا دیا، چنانچہ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے،

کیوڑہ بیل پنجہ برگہ و گل زعفران ماند درین دولت جاوید طراز از فرنگ آوردند[۱]

وگلہائے ایرانی و تورانی از گل سرخ و بنفشہ و یاسمن کبود و سوسن و ریحان و رعناد زیبا و شقائق و تاج خروسی و قلغہ و نافرمان و خطمی و جز آن بسیار شود[۲]،

اس کے بعد جہانگیر کا دور حکومت آیا، اور اس نے کشمیر میں پیوند کے ذریعے سے میوہ دار درختون کی خاص طور پر اصلاح و تربیت کی[۳]، ایک موقع پر خود تزک مین لکھتا ہے کہ کشمیر کے شاہ آلو باغچہ نور افزا سے ڈیڑھ ہزار اور تمام درختون سے پانسو توڑے گئے ہیں نے متصدیان کشمیر کو تاکید کی کہ شاہ آلو کے درخت اکثر باغون مین پیوند کرین اور اس کو ترقی دین،

جہانگیر کے دور حکومت کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ اس کے زمانے میں میوون اور پھلون کی تجارت میں بے انتہا ترقی ہوئی اور بیرونی ممالک سے اسقدر اور اتنے قسم کے میوے ہندوستان مین آئے، جو اکبر کے زمانے میں بھی نہیں آئے تھے، چنانچہ تزک مین اس نے ان میوون کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے اور بعض موقعون پر حسرت ظاہر کی ہے، کہ میرے والد کے زمانے میں یہ میوے ہندوستان میں نہیں آئے، حالانکہ وہ میوون کا نہایت ذوق رکھتے تھے، ایک موقع پر لکھتا ہے،

ماہ دی کے آغاز میں ولایت سے سوداگر آئے اور یزد کے انار اور کاریز کے خربزے جو خراسان کے خربزون میں سب سے بہتر ہوتے ہیں لائے، ہر اگرچہ

---

[۱] آئین اکبری جلد اول صفحہ ۶۳ [۲] آئین اکبری جلد اول ص ۶۵، [۳] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۵
[۴] تزک جہانگیری ص ۳۱۳،

ہر سال بدخشان سے خربزے اور کابل سے انار آتے ہیں، لیکن یہ خربزے اور انار یزد کے انار اور کاریز کے خربزے سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے، چونکہ میرے والد بزرگوار کو میووں کا نہایت ذوق تھا، اس لئے نہایت افسوس ہوا کہ کاش یہ میوے ان کے زمانے میں ولایت سے ہندوستان میں آتے تا کہ وہ ان سے محظوظ ہوتے۔[1]

دوسرے موقع پر لکھتا ہے،

اس منزل میں کاریز سے جو ہرات کے اطراف میں واقع ہے، بہت سی خربزے لائے، خان عالم نے بھی پچاس اونٹ بھیجے تھے، خلاصہ یہ کہ اس کثرت سے گذشتہ سالوں میں نہیں لائے تھے، ایک خوان میں حسب ذیل میوے لائے، کاریز کابل اور بدخشان کے خربزے، سمرقند اور بدخشان کے انگور، سمرقند، کشمیر، کابل اور جلال آباد کے سیب، انناس جو یورپ کے بندرگاہوں کا میوہ ہے، آگرہ میں اس کا درخت لگایا گیا تھا جو ہر سال آگرہ کے باغات میں جو خالصہ شریفہ سے متعلق ہیں، ہزاروں پھل دیتا ہے، اور کولہ جو شباہت اور جسامت میں نارنگی سے چھوٹا ہوتا ہے، اور اس کی چاشنی مائل بہ شیرینی ہے، میرے والد بزرگوار کو میووں کا نہایت ذوق تھا، بالخصوص خربزہ، انار اور انگور کے ساتھ نہایت ذوق رکھتے تھے، چونکہ ان کے زمانے میں کاریز کے خربزے جو خربزہ کی اعلیٰ قسم ہے، اور یزد کے انار جو دنیا میں مشہور ہیں، اور سمرقند کے انگور ہندوستان میں نہیں لاتے تھے، اس لئے جب یہ میوے سامنے آتے ہیں، تو نہایت افسوس ہوتا ہے، کہ کاش یہ میوے اس زمانے

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۳۳،

میں آتے تاکہ وہ ان سے لذت اندوز ہوتے،[1]

جہانگیر کو درختوں اور پھلوں کی ترقی کے لحاظ سے اس بات کا خاص شوق تھا کہ جو پھل اور درخت غیر معمولی نظر آتے تھے، ان کی پیمایش اور وزن کرتا تھا، چنانچہ تزک میں اس قسم کے تجربہ و تحقیقات کا متعدد موقعوں پر ذکر کیا ہے، ایک موقع پر لکھتا ہے،

آج استالف سے ایک شفتالو لائے، اتنا بڑا شفتالو آج تک دیکھا نہیں گیا تھا، میں نے حکم دیا کہ وزن کریں، ساٹھ تولہ کا نکلا،[2]

دوسرے موقع پر لکھتا ہے،

فتحپور کے اطراف سے ایک تربوز لائے کہ اتنا بڑا تربوز اب تک دیکھا نہیں گیا تھا، میں نے حکم دیا کہ وزن کریں، ۳۳ سیر وزن نکلا،[3]

ایک جگہ لکھتا ہے،

دو کوس کے طے کر لینے کے بعد ایک پر فضا و لطیف جگہ سامنے آئی، ایک باغ میں تقریباً آم کے سو درخت نظر سے گذرے کہ آم کے اتنے بڑے اور اتنے شاداب درخت کم دیکھے گئے تھے، اسی باغ میں بڑ کا ایک درخت نظر سے گذرا جو نہایت درجہ کا بڑا تھا، میں نے حکم دیا کہ اس کے طول، عرض اور بلندی کی پیمایش کریں، چنانچہ اس کی بلندی سے شاخ تک ۴، گز اس کے تنہ کا دور ۴۴ گز اور اس کی چوڑائی ایک سو چھ گز نکلی،[4]

اس قسم کے اور بھی متعدد واقعات تزک جہانگیری میں مذکور ہیں،

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۷۳، ۱۷۴، [2] تزک جہانگیری صفحہ ۵، [3] تزک جہانگیری صفحہ ۵، [4] تزک جہانگیری صفحہ ۱۷۴،

شاہجہاں نے بھی اپنے دور حکومت میں کشمیر کے پھلوں کو پیوند وغیرہ کے ذریعہ سے بے انتہا ترقی دی، چنانچہ بادشاہ نامہ میں ہے،

وچون بجلوس میمنت مانوس خدیو عالم خداوندی آدم سریر آرائے جہانبانی حضرت صاحبقران ثانی جہانرا فروغ تازہ بہم رسید وجہانیان را فروغ بے اندازہ، این سرزمین کہ از جمیع متنزہات عالم امتیاز دارد ولمحات روح افزا و بساتین دلکشا نمودار بہشت برین گردید و اکثر اثمار آن بہ پیوند و دیگر اسباب نزہت در شیرینی و بالیدگی و سیرابی یاد از میوہائے نیک ولایت کابل میدہد[1]،

اسی زمانے میں جب کہ تیموری سلاطین ہندوستان کے پھولوں اور پھلوں میں یہ لطافت پیدا کر رہے تھے، مرتضیٰ نظام شاہ کے دور حکومت میں صلابت خان نے اپنی وکالت کے زمانے میں ہندوستان کے پائدار اور کارآمد درختوں کی پیداوار کو بے انتہا ترقی دی، چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے،

در میان مردم شہرت دارد کہ در عہد وکالت صلابت خان پنج لک درخت انبہ و املی کہ مدت ہائے ماند و باعث ذکر خیر شود در مملکت نظام شاہ متنزاد گردید و درختہائے دیگر را ازین قیاس مے توان کرد[2]،

اس سلسلے میں ان باغات کا ذکر بھی نہایت ضروری اور اہم ہے، جن میں یہ پھول پھل پیدا ہوتے تھے، اگرچہ ان باغات کی کوئی مکمل فہرست

---

[1] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۵۵،۵۶، [2] فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۴۳،

نہیں پیش کی جاسکتی کیونکہ ہمارے مورخین نے یا تو

(۱) صرف ان بادشاہوں کے حال میں انکا تذکرہ کیا ہے، جن کو باغات کے لگانے کا نہایت ذوق تھا،

(۲) یا خاص خاص مشہور اور قابل الذکر باغوں کا نام لیا ہے،

(۳) یا ضمنی تذکرے میں کسی باغ کا نام آگیا ہے،

لیکن یہ ظاہر ہے کہ فرمانروایان اسلام کے دور میں ہزاروں باغ ان کے علاوہ ہونگے، اور قریب قریب ہر سلطنت نے ان کی آبیاری میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہوگا، تاہم جن باغوں کا تذکرہ تاریخوں میں موجود ہے، ان سے معلوم ہوسکتا ہے کہ فرمانروایان اسلام کے دور میں باغوں کی کسقدر کثرت تھی، اور انھوں نے ان میں کسقدر لطافت اور رنگ و بو پیدا کیا تھا،

فیروزشاہ کا ذوق باغبانی تاریخ فیروزشاہی میں لکھا ہے کہ فیروزشاہ کو باغات کے لگانے کا نہایت شوق تھا، اور اطراف دہلی میں ایک ہزار سے زیادہ باغ لگوائے تھے، اور ہر باغ کے صحن چمن کو آراستہ و پیراستہ کیا تھا، اس کے علاوہ جب اس نے شہر حصار فیروزہ کو آباد کیا، تو نہایت کثرت سے درخت اور باغات لگوائے جن میں ہر قسم کے پھول پھل پیدا ہوتے تھے، اور باغات سے جو محصول ہوتا تھا، اس کی تعداد ایک لاکھ اسی ہزار تنکہ تھی[۱]، فیروزشاہ کے بعد سلطان محمود بیگڑہ نے گجرات میں نہایت کثرت سے پھلدار درخت لگائے،

باغ فردوس اور پانچ کوس لمبا اور ایک کوس چوڑا ایک باغ جس کا نام باغ فردوس

---

[۱] تاریخ فیروزشاہی شمس سراج عفیف ص ۲۹۵ و ۲۹۶ و ص ۱۲۸،

تھا، لگوایا، اور اس میں آم، کھرنی اور آنوے وغیرہ کے نو لاکھ درخت نصب کروائے[۱]

اس کے زمانے میں وزیر عماد الملک نے جو محتاجوں اور غریبوں کا بڑا ہمدرد تھا، احمد آباد میں ایک باغ لگوایا جس کا نام باغ شعبان تھا، مرات سکندری میں ہے،

وباغ شعبان کہ رشک باغ جنان است تربیت یافتہ زمان آل سلطان جہان است،

اس نے قحط کے زمانے میں یہ باغ لگوایا تھا، تاکہ اس میں محنت و مزدوری کرکے غریب لوگ اپنا پیٹ پال سکیں اور اس کے اکثر درخت خود اپنے ہاتھ سے لگائے تھے۔ اس سے سلطان محمود بیگڑہ کا مقصد محض ذاتی شوق کا پورا کرنا نہ تھا، بلکہ ایک اہم تمدنی خدمت کا انجام دینا یعنی زرعی پیداوار کو ترقی دینا تھا، اس لئے اس نے رعایا کو بھی اس کی ترغیب دی اور اس معاملے میں ان کے ساتھ اسقدر رعایتیں کیں، کہ اگر راستے میں یا کسی گھر کے دروازے پر دیکھتا کہ کسی غریب شخص نے کوئی درخت نصب کیا ہے، تو گھوڑے کو روک کر اس کو بلواتا اور نہایت لطف و مہربانی کے ساتھ پیش آتا، اور پوچھتا کہ اس درخت کو پانی کہاں سے دیتے ہو؟ اگر وہ کہتا کہ "پانی دور سے لانا پڑتا ہے، اور اس میں تکلیف ہوتی ہے"، تو اس کے قریب کنواں کھدوا دیتا اور مالی امداد دیتا اور کہتا کہ "متعدد درخت لگاؤ گے تو انعام ملے گا"، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا نے پہلے سے زیادہ باغ لگانے اور درخت نصب کرنے کی طرف توجہ کی[۲]

---

[۱] مرات احمدی جلد دوم صفحہ ۱۳،

[۲] ظفر الوالہ ص ۱۶ و مرات سکندری ص ۷۸،

محمود آباد کے باغات سلطان محمود نے ۹۰۱ھ میں جانپانیر کو فتح کیا اور اس کو اپنا دار السلطنت بنایا، تو اس تقریب سے ایک شہر آباد کیا جس کا نام محمد آباد تھا، یہ شہر مسجد، شہر پناہ اور سوداگروں اور تاجروں کی شاندار عمارتوں سے آباد ہو گیا، تو اس نے ۹۰۱ھ میں اطراف شہر کی رونق بڑھائی اور سواد شہر میں کثرت سے باغات لگوائے جن میں مختلف پھول اور پھل مثلاً آم، پونڈے، انجیر، انگور، انار، کیلہ، انبیرت پھل، سدا پھل، نارنگی، کھرنی، تار پھلی، ناریل، کٹہل، بڑھل، کمرک، پھالسہ، آملہ، گل لعل، سیوتی، چنبیلی، چنپا، بیلہ، موگرہ، جوہی، کرنی، کیوڑہ وغیرہ پیدا ہوتے تھے[1] اس فہرست میں زیادہ تر پھول اور پھل ہندوستانی ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ ایرانی اور تورانی پھولوں اور پھلوں کے لئے ہندوستان تیموریوں کے دور کا انتظار کر رہا تھا،

خراسانی صناع کا لگایا ہوا باغ اس طریقہ سے سلطان محمود کے زمانے میں اگرچہ باغوں کا عام رواج ہو گیا، تاہم ابتک ان کے بنانے میں لطافت و نفاست سے کام نہیں لیا گیا تھا، اور اہل گجرات اس سے بالکل ناواقف تھے، لیکن سلطان محمود کے اس ذوق کو دیکھ کر ایک خراسانی نے عرض کیا کہ "مجھکو باغوں اور عمارتوں کے بنانے میں خاص کمال حاصل ہے، اگر ایک جگہ متعین کر دی جائے، تو میں ایک نہایت عمدہ باغ بنا دوں"، بادشاہ نے اس کو خود جگہ کے انتخاب کا اختیار دیا اور تمام ضروری ساز و سامان مہیا کر دئے، اس نے ایک نہایت عمدہ باغ بنایا، جس میں ایک حوض، متعدد آبشار اور فوارے تھے، چونکہ اب تک گجرات میں اس قسم کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا، سلطان نہایت محظوظ ہوا، اور اس کو بہت کچھ انعام و اکرام دیا،

---

[1] مرات سکندری از ص ۱۰۷ تا ص ۱۹۰،

بیلو نجار کا لگایا ہوا باغ | اسی اثنا میں ایک گجراتی بڑھئی نے جسکا نام بیلو تھا، عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو میں بھی اس کے مقابل میں ایک باغ تیار کروں سلطان نے حکم دیا تو چند دنوں میں اس نے اس سے بھی بہتر باغ تیار کر دیا، سلطان اس کو دیکھ کر نہایت خوش ہوا، اور پوچھا کہ اہل گجرات کو تو یہ ہنر نہیں آتا تھا، تم نے کس سے سیکھا" اس نے کہا کہ جب اوستاد (یعنی خراسانی) نے باغ کی تعمیر کا کام شروع کیا تو اس کی صنعتی باریکیوں میں اسقدر اخفار سے کام لیا کہ اس فن کے جاننے والوں کو باغ کے گرد بھٹکنے تک نہیں دیا، لیکن میں نے مزدوروں کے زمرے میں شامل ہو کر کچھ تو دیکھکر اور کچھ قیاس سے کام لیکر یہ ہنر سکھ لیا، بادشاہ نہایت مسرور ہوا، اور اس کو انعام اور خلعت خاص سے سرفراز کیا،

بہرحال باغات کی کثرت کے ساتھ اس قسم کی تمدنی نفاستیں بھی گجرات میں سلطان محمود کے زمانے میں پیدا ہوئیں، چنانچہ مرأت سکندری میں ہے،

حاصل کلام آنکہ این ہمہ دقائق وصنائع وحکمتہائے عجائب کہ آلان در گجرات شائع است اکثر در زمان سلطان عالیشان سلطان محمود از ہنرمندان بلاد واقالیم ایجاد یافتند، گجرات نسخۂ جامع است مثل انسان کامل کہ از تکمیل آنحضرت گشتہ واہل گجرات اکتساب فہم سلیم وطبع مستقیم در ظرافت ونظافت در ایام سلطنت آن عالیشان نمودند،

ورنہ اس سے پہلے اہل گجرات کی سادہ لوحی کا یہ حال تھا کہ ایک فوجی شخص جو سلطان کے مقربین بارگاہ میں تھا، رخصت لیکر اپنے وطن میں گیا، واپسی کے وقت مونتھ کی بہت سی پھلیاں چن کر ایک پٹارہ میں بھریں اور اس کے اوپر سرخ کپڑا لپیٹ کر سلطان کی خدمت میں تحفۂ پیش کیں، سلطان نے کہا کیا ہے، بولا کہ مونتھ کی پھلیاں سرکاری

گھوڑوں کے لئے لایا ہوں، نہایت عمدہ ہیں، اور ان میں بڑے بڑے دانے ہیں، سلطان مسکرایا، وہ اس تلطف آمیز مسکراہٹ کو دیکھکر آگے بڑھا اور کہا کہ میرے گانوں میں ایک عورت ہے جس کے ہر سال ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے، اسسال وہ بیوہ ہوگئی ہے، اگر حکم ہو تو سلطان کی خدمت میں حاضر کروں تاکہ بہت سے شہزادے پیدا ہوں، سلطان اس پر ہنس پڑا[۱] اسکے بعد تیموریوں کا دور شروع ہوا اور انھوں نے باغوں میں اور بھی تمدنی نفاستیں اور زنگینیں پیدا کیں، چنانچہ آئین اکبری میں ہے،

بیشتر دو ریسانها در هم مے کشتند از ان باز که قدم فردوس مکانی (بابر) هندوستان را فروغ افزود، خیابان بندی و طرح آرائی پدید آمد و عمارتهای دلکشا و آبشارهای سامعه افروز دیده وران آفاق را به شگفت آورد[۲]،

اکبر کے زمانے میں آگرہ اور لاہور میں بہ کثرت باغ لگائے گئے، چنانچہ ابوالفضل نے ان شہروں کے حال میں ان کا اجمالی ذکر کیا ہے، مثلاً لاہور کے متعلق لکھتا ہے،

"چون چندگاه پایۂ تخت شد والا کاخها برافراخته آمد و دلکشا باغها شادانی دیگر بخشید"[۳]

امرائے اکبری اور انکے متعلقین نے متعدد باغ لگوائے، چنانچہ امرائے دربار اکبری میں ایک شخص شیخ عبدالرحیم لکھنوی تھے جنھوں نے ایک عورت کو گھر میں ڈال لیا تھا جب ان کا انتقال ہوا تو اس نے نہایت عمدہ مکانات بنوائے، اور باغ ہرا اور تالاب تیار کروایا، اسی باغ میں شیخ عبدالرحیم لکھنوی مدفون تھے، اس لئے وہ آس پاس کے دیہات کو لگان پر لیکر اس باغ کی رونق کو بڑھایا کرتی تھی،[۴]

۱؎ مرات سکندری صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱ ۲؎ آئین اکبری جلد اول صفحہ ۶۵ ۳؎ آئین اکبری جلد دوم ۱۵۷، ۴؎ مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۵۶۵

اسی زمانے میں مرزا خان خلف بیرم خان نے ایک لڑائی میں فتح حاصل کی تو اکبر نے اس کو خانخانان کا خطاب دیکر گجرات کا حاکم بنا دیا، اس نے عین میدان کارزار میں دریائے سابرمتی کے کنارے ایک سو بیس جریب کا ایک باغ لگوایا، اس کے گرد نہایت مضبوط پختہ چار دیواری قائم کی اور باغ کے مناسب حال دریا کے کنارے شاندار عمارتیں بنوائیں، جہانگیر نے اس باغ کی سیر کی ہے اور لکھا ہے،

وبے تکلف سیرگاہ خوشے است ممکن کہ دو لک روپیہ خرچ شدہ باشد مرا خود خیلے
در او فتاد توان گفت کہ در تمام گجرات مثل این باغ نباشد[1]

اکبر کی حرم محترم میں مریم زمانی کے حکم سے بھی ایک باغ اور باؤلی تیار ہوئی تھی[2]

اکبر ہی کے زمانے میں علی عادل شاہ نے شہر بیجاپور کے گرد فصیل کھنچوائی تو حصار شہر کے اندر بڑے بڑے تین باغ لگوائے، چونکہ ان میں ایک باغ چھوٹے چھوٹے بارہ باغوں کو ملا کر بنایا گیا تھا، اس لئے اس کا نام باغ دوازدہ امام رکھا گیا، بقیہ دو باغ، باغ علوی اور باغ علی کے نام سے موسوم ہوئے، بادشاہ کی تقلید میں امراء اور ارکان دولت نے بھی آرائش اور سیر کے لئے اپنے اپنے گھروں کے متصل باغات لگوائے، اور اطراف شہر میں بھی نہایت کثرت سے باغ لگوائے گئے جن میں ہر قسم کے گرم سیر اور سرد سیر میوے پیدا ہوتے تھے،[3]

اکبر کے بعد جہانگیر کا دور حکومت شروع ہوا تو اس نے متعدد باغ لگوائے، کشمیر میں ایک چشمہ تھا جس کا پانی نہایت صاف و شفاف تھا، جہانگیر نے اس کے گرد ایک باغچہ تیار کر دیا اور محل اور مکانات تعمیر کرا دیئے اور اس طریقہ سے خود اس کے الفاظ میں

جائے مرتب گشتہ کہ در دہ ہائے ربع مسکون مثل آن کم نشان دہند[4]

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۱۶ [2] تزک ص ۲۶۰ [3] بساتین السلاطین ص ۱۱۲ [4] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۹۶

باغ نکودر سلاطین تیموریہ کے یہان دستور تھا کہ سال میں ایک بار اپنا وزن کراتے تھے، اور اپنے ہموزن سونا چاندی خیرات کرتے تھے، ایک بار اسی رقم سے اکبر نے شیخ ابوالفضل کو ۲۰ ہزار روپیئے دئیے کہ سلطان پور اور نکودر کے درمیان جو دریا واقع ہے، اس پر پل باندھ کر ایک آبشار بنوا دیا جائے، ایک بار اس راستے سے جہانگیر کا گذر ہوا تو اس نے اس منظر کے حسن وجمال میں اور بھی اضافہ کیا، اور نکودر کے جاگیردار معز الملک کو اس پل کے پاس ایک عمارت اور باغیچہ بنانے کا حکم دیا کہ آنے جانے والون کے لئے موجب مسرت ہو،[1]

باغ نورمنزل ان چھوٹے چھوٹے باغچون کے علاوہ اس کے زمانے میں چند بڑے بڑے باغ بھی تیار ہوئے، چنانچہ ایک موقعہ پر تزک میں لکھتا ہے کہ "چونکہ باغ نورمنزل اور ان عمارتون کی تعریف جو حال میں تیار ہوئی ہیں، میرے سامنے بار بار کی گئی، اس لئے میں نے دوشنبہ کے روز روانہ ہوکر باغ بوستان سرا میں اقامت کی اس کے بعد سہ شنبہ کا دن اس باغ میں عیش وفراغت کے ساتھ گذار کر باغ نورمنزل میں آیا، یہ باغ الٰہی گز سے تین سو تیس جریب کا ہے، اور اس کے ارد گرد اینٹ اور چونے کی چوڑی اور بلند مضبوط چار دیواری قائم کی گئی ہے، باغ کے درمیان شاندار عمارتین، پُر تکلف نشیمن گاہ اور عمدہ حوض بنائے گئے ہیں، دروازے کے باہر ایک بڑا کنوان بنوایا گیا ہے کہ ۳۲ جوڑ بیل برابر اس سے پانی کھینچتے ہیں، اور باغ کے درمیان ایک شاہ جو نکالی گئی ہے جس کا پانی حوضون میں گرتا ہے، اس کے علاوہ اور چند کنوئیں ہیں کہ انکا پانی حوضون اور چمنون میں تقسیم ہوتا ہے، طرح طرح کے فوارون اور آبشارون سے اس باغ کو زینت دیگئی ہے، باغ کے عین وسط میں ایک تالاب ہے، جو بارش کے پانی سے بھرتا ہے، اگر کبھی سخت گرمی کے زمانے میں اس کا پانی کم ہوجاتا ہے، تو کنوئین کے پانی سے

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲۵،

بھرا جاتا ہے، تاکہ ہمیشہ لبریز رہے، تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ اب تک باغ پر صرف ہو چکا ہے، اور ابھی تک ناتمام ہے، اور خیابان بندی اور تختہ بندی میں بہت سا روپیہ صرف ہوگا، ممکن ہے کہ تمام مصارف کی تعداد دو لاکھ تک پہونچ جائے،

عہد جہانگیری کے باغات

جہانگیر کے زمانے میں اور بھی متعدد باغ موجود تھے، جنکا ذکر اس نے تزک میں کیا ہے، چنانچہ آگرہ کے ذکر میں ایک موقع پر لکھتا ہے کہ "اناس جو فرنگی بندروں میں ہوتا ہے، نہایت خوشبودار اور لذیذ میوہ ہے، اور آگرہ کے باغ گلفشاں میں ہر سال کئی ہزار کی تعداد میں پھلتا ہے"[1] صندل کے درخت نے جو مخصوص طور پر جزائر میں ہوتا تھا، باغوں میں نشو و نما پائی،[2] لیکن باغ گل افشاں کے سوا یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ باغ کس کے بنوائے ہوئے تھے سلسلۂ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکبری دور کی یادگار تھے، کیونکہ اس نے انکا ذکر ان میووں کے سلسلے میں کیا ہے جو دور اکبری میں ولایت سے آئے لیکن ممکن ہے کہ ان میں خود جہانگیر کے بنوائے ہوئے باغ بھی شامل ہوں، جہانگیر کے عہد حکومت میں بعض امرا نے بھی نہایت عمدہ اور وسیع باغ تیار کئے، چنانچہ کرانہ میں مقرب خان نے متعدد باغات بنوائے تھے، جن میں ایک باغ کی سیر جہانگیر نے کی ہے، اور تزک میں اسکا تفصیلی ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے کہ "جمعہ کے دن پرگنہ کرانہ میں نزول اجلال ہوا، یہ پرگنہ مقرب خان کا وطن ہے، اور اس کی آب و ہوا معتدل اور زمین عمدہ ہے، مقرب خان نے وہاں باغات لگوائے ہیں، اور عمارتیں بنوائی ہیں، چونکہ اس کے باغ کی تعریف بار بار سن چکا تھا، اس کے سیر کا شوق ہوا، اور سنیچر کے روز اہل حرم کے ساتھ اس کی سیر سے محظوظ ہوا، بلا مبالغہ نہایت عمدہ باغ ہے، اس کی پختہ چار دیواری اور خیابانوں کا رقبہ ایک سو چالیس بگہ ہے، باغ کے درمیان ایک حوض ہے، اور حوض

۱؎ تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۲۶۶ ۲؎ ایضاً ص ۴

کے درمیان ایک صفہ ماہتابی، ولایت میں جو میوہ دار درخت ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی گرم سیر اور سرد سیر درخت ایسا نہیں جو اس باغ میں نہ ہو، یہاں تک کہ پستہ کا درخت بھی، ایسے موزون قامت سرو نظر آئے جو اب تک نظر سے نہیں گذرے تھے، میرے حکم سے ان کو گنا گیا، تو ۳۰۰ درخت شمار میں آئے، حوض کے اطراف میں مناسب عمارتیں بنائی گئی ہیں، اور ابھی تک کام جاری ہے۔[۱] صاحب مآثر الامراء نے بھی اس باغ کا تذکرہ کیا ہے، اور اس کے آموں کی بڑی تعریف کی ہے، چنانچہ لکھتا ہے،

"و انبہ خواب ہر جا شنید از گجرات و دکن تخم آن آوردہ کاشت، چنانچہ تا حال در شاہ جہان آباد بخوبی انبۂ کیرانہ انبہ ہیچ جانمی رسد"[۲]

شالامار باغ لاہور | سلاطین تیموریہ میں اس حیثیت سے شاہجہانی عہد حکومت خاص طور پر امتیاز رکھتا ہے کہ اس کے زمانے میں عمارات کے ساتھ لاہور اور کشمیر میں نہایت عمدہ باغ تیار ہوئے، چنانچہ شاہجہان نے لاہور میں ایک نہر کھدوائی تو اس کے کنارے، اطراف شہر میں جو پست و بلند جگہیں تھیں، ایک باغ بنوایا، جس میں متعدد حوض، نہریں، آبشار اور فوارے تھے، اور یہ آٹھ لاکھ روپیہ کے صرف سے خلیل اللہ خان کے اہتمام میں تیار ہوا تھا، اس باغ کا نام شالامار باغ ہے، جو آج بھی موجود ہے، اور صاحب مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ

الحق بدین کیفیت و خصوصیت باغ در ہندوستان نیست

اگر فردوس بروے زمین است | ہمین است و ہمین است و ہمین است[۳]

کشمیر میں اس نے جو باغات تیار کرائے ان کے نام حسب ذیل ہیں،

فرح بخش | پہلے اس کا نام شالامار تھا، بعد کو فرح بخش نام رکھا گیا،

۸۰۶

[۱] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲۰۶ [۲] مآثر الامراء جلد سوم صفحہ ۳۸۱، [۳] مآثر الامراء جلد دوم ص

فیض بخش | باغ فرح بخش کے عقب میں بنایا گیا تھا، اور اس میں ایک شاہ نہر، بکثرت فوارے اور متعدد عمارتیں تھیں،

نور افزا | اس میں نہایت کثرت سے پھل پیدا ہوتے تھے، بادشاہ نامہ میں لکھا ہے کہ جہانگیر کے عہد حکومت میں کشمیر میں شاہ آلو کے درخت کم پیدا ہوتے تھے، لیکن شاہجہان کے زمانے میں بہ کثرت پیدا ہونے لگے،

بحر آرا | جھروکہ درشن کے مقابل میں واقع ہے،

کشمیر میں یہ تمام باغ تو خود شاہجہان نے تیار کرائے تھے، لیکن متعدد باغ اور بھی تھے، جن کو اگرچہ خود شاہجہان نے تیار نہیں کرایا تھا، لیکن وہ اس سے متعلق تھے، چنانچہ ان کے نام یہ ہیں:۔

نور افشان | اس کو جہانگیر کے زمانے میں نورجہان نے بہٹ کے کنارے بنوایا تھا،

باغ صفا | صفاپور کے تالاب کے کنارے تیار ہوا تھا، ایک اور باغ تھا جس کو جو اہر خان خواجہ سرا نے جہانگیر کے عہد میں ڈل کے درمیان بنوایا تھا،

باغ شاہ آباد | محمد قلی ترکمان نے اپنے عہد حکومت میں بنوایا تھا، زمانۂ شاہزادگی میں شاہجہان کے باغات خاصہ میں داخل ہوا، اور بعد کو دارا شکوہ کو دیا گیا،

باغ مراد | ڈل کے درمیان واقع تھا، اور شاہزادہ مراد بخش کو مرحمت ہوا تھا،

باغ نشاط | یمین الدولہ نے ڈل کے جنوب رخ بنوایا تھا،

باغ نسیم و باغ افضل آباد | پہلا باغ اعظم خان نے اور دوسرا علامی افضل خان نے ڈل کے شمال رخ بنوایا تھا، یہ دونوں باغ پہلو بہ پہلو واقع تھے، اور دونوں میں نہایت کثرت سے پھول اور عمدہ میوے تیار ہوتے تھے، انہی کے متصل سیف خان کا بھی ایک نہایت سرسبز اور

شاداب باغ تھا،

باغ ظفرخان تالاب جدی بل (زنڈی بل) کے کنارے تیار کیا گیا تھا چونکہ طول شہر میں واقع تھا، اس لیے شاہ جہان نے اس کا نام باغ طولانی رکھا،

باغ الھی میرزا یوسف خان نے اپنے عہد حکومت میں بنوایا تھا، اس میں ایک نہر جاری تھی، اور وسط باغ میں ایک چبوترہ اور ایک حوض تھا، شاہجہان کے حکم سے نہر کے کنارے ایک چبوترہ بھی بنوایا گیا،

باغ فیروزخان دریاے بہٹ کے کنارے واقع تھا،

باغ خدمت خان جزیرہ ڈل میں واقع تھا،

ان باغون کے علاوہ اور بھی بہت سے باغ تھے جن کو امراے شاہ جہانی نے کشمیر میں تیار کرایا تھا، چنانچہ بادشاہ نامہ میں ہے،

سخن کوتاہ بسیارے از منتسبان این درگاہ آسمان جاہ از امرار و خدمتگار در ین سرزمین نشاط انگیں درخور مرتبہ و استعداد باغہا ساختہ اند[۱]"

شاہ جہان کے عہد حکومت میں کشمیر کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی متعدد امرار نے باغات لگوائے جن کا اجمالی ذکر ان کے حالات میں آتا ہے، چنانچہ صاحب مآثر الامرار احمد خان نیازی کے حال میں لکھتے ہیں،

"چون پدرش آشتی برار را وطن قرار دادہ مدفن خود ساخت مشار الیہ در آبادی قصبہ کوشیدہ طرح باغے انداخت[۲]"

---

[۱] ان باغون کے تفصیلی حالات بادشاہ نامہ حصہ اول صفحہ ۲۴ تا صفحہ ۲۹ میں مذکور ہیں،

[۲] مآثر الامراء جلد اول ص ۱۰۸

ملک عنبر کے متعلق لکھتے ہیں،

موضع کھرکی پنج کروہی دولت آباد را (کہ الحال بہ خجستہ بنیاد اورنگ آباد موسوم است) باحداث تالاب وطرح باغ وعمارات عالیہ معمورۂ عظیم ساخت [1]،

امرائے شاہجہانی مین ایک شخص الہ وردی خان تھا جس نے دلی میں ایک سرائے اور باغ بنوایا تھا [2]،

اس کے بعد عالمگیر کا دور حکومت شروع ہوا، تو غالبًا اس طرف کم توجہ کی گئی، اس لیے تاریخون میں عالمگیر اور امرائے عالمگیر کے بنائے ہوئے باغون کا پتہ نہیں چلتا البتہ کشمیر کے بعض چشمے اس کے شہزادون سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کے گرد باغ اور عمارتین تھین، مثلاً چشمہ سار آصف آباد شہزادہ محمد معظم شاہ کی تیولداری میں تھا، اور اس چشمہ کی نسبت عالمگیر نامہ میں لکھا ہے،

مشتمل است بر عمارات عالی دلنشین و حیاض وریاض فیض آئین،

باغ زیب النساء | ایک اور چشمہ جسکا نام اچول تھا، زیب النساء کی جاگیر میں تھا، اس میں بھی ایک باغ تھا، چنانچہ عالمگیر نامہ میں ہے،

باغ خوش وبستان سرائے دلکش دارد [3]

علامہ شبلی مرحوم نے زیب النساء کے حال میں لکھا ہے کہ یہ باغ زیب النساء نے تیار کرایا تھا لیکن جو عبارت ہم نے نقل کی ہے، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا، ممکن ہے کہ یہ باغ زیب النساء ہی نے تیار کرایا ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دوسرے تیموری سلاطین کے عہد میں بنا ہو، لیکن بہرحال یہ سلسلہ منقطع نہین ہوا، اور عالمگیر کے بعد دوسرے بادشاہون کے زمانے میں بھی عمدہ عمدہ باغ لگوائے گئے، مثلاً محمد شاہ بادشاہ کے امراء میں امین الدین خان سنبھلی

---

[1] مآثر الامراء جلد سوم ص ۹ [2] مآثر الامراء جلد اول ص ۲۱۵ [3] عالمگیر نامہ ص ۸۳۶

نے اپنے وطن سنبھل میں ایک نہایت عمدہ باغ لگوایا[1]، عالمگیر ثانی کے زمانے میں ایک نومسلم صوبہ دار سکھجیون نے کشمیر کے تمام بزرگون کے مزارات اور باغات کی ترمیم واصلاح کرائی[2]، شجاع الدولہ نے جو صوبہ اوڑیسہ کا ناظم تھا، دریاے بھاگرتھی کے کنارے دداپاڑہ میں ایک ایسا عمدہ باغ لگوایا جس کی نسبت مشہور تھا کہ پریان اس کے گلگشت و تماشا کے لئے اترتی ہیں، اور تالابون میں غسل کرتی ہیں[3]، ایک اور امیر نے بگندھیلی کے قریب ایک مرغزار خریدا اور اس میں ایک باغ بنوایا، اور اس سے الگ مستقل ایک باغ میں ناریل کے درخت لگوائے، اگرچہ زمانے کی ناسامدت سے وہ اسکی خواہش کے مطابق تیار نہ ہو سکا تاہم صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے،

"آلان دنور نارجیل سبز دران معمورہ از ہمان جاست[4]"

باغون کے لگانے کے محرکات واسباب

ان باغون کے لگانے کے مختلف محرک واسباب تھے،

(۱) زرعی پیداوار کی ترقی اور کسانون کی حوصلہ افزائی، اسی لئے سلطان محمود بیگڑہ اس معاملے میں رعایا کے ساتھ رعایتین کرتا تھا، اور سلاطین تیموریہ نے باغون کی مالگذاری معاف کر دی تھی، چنانچہ جہانگیر نے اس کے متعلق تزک میں یہ مشہور قصہ لکھا ہے کہ "ایک بار ایک بادشاہ گرمی کے زمانے میں ایک باغ کے دروازے پر گیا اور باغبان سے دریافت کیا کہ اس باغ میں انار ہے؟ اس نے جواب اثبات میں دیا، تو آب انار کا ایک پیالہ طلب کیا، باغبان کی لڑکی نہایت تمیزدار تھی، اس نے سلیقہ کے ساتھ پیالہ پیش کیا، اس کے بعد اس نے باغبان سے دریافت کیا کہ اس باغ سے تمھاری سالانہ آمدنی کیا ہوتی ہے،؟ اس نے کہا "تین سو دینار، پھر پوچھا کہ "سرکاری مالگذاری کیا دیتے ہو،؟" اس نے کہا کہ "ہمارا بادشاہ صرف زراعت سے عشر لیتا ہے، درختون کی پیداوار سے کچھ نہیں لیتا،" اس وقت بادشاہ

---

۱ مآثر الامرا جلد اول ص ۳۵۸ ۲ مآثر الامرا جلد دوم ص ۱۷، ۳ ریاض السلاطین ص ۲۹۲ ۴ مآثر الامرا جلد دوم ص ۸،

کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میرے ملک میں بہ کثرت باغ اور درخت ہیں، اگر باغ کی پیداوار سے بھی عشر لیا جائے تو بہت سا روپیہ ملے اور رعایا کو بھی بہت زیادہ نقصان نہ پہونچے، چنانچہ اس کے بعد باغوں پر بھی مالگذاری لگانے کا ارادہ کر لیا، پھر تھوڑا سا آب انار طلب کیا، لیکن اب کی لڑکی گئی تو دیر میں آئی، اس پر بادشاہ نے کہا کہ "پہلی بار تم جلد آئی تھیں اور آب انار زیادہ لائی تھیں، لیکن اب کی بار دیر میں آئیں، اور آب انار کم لائیں، لڑکی نے جواب دیا کہ "پہلی بار ایک انار سے پیالہ بھر گیا تھا، لیکن اب کی بار میں نے پانچ چھ انار نچوڑے، اور ویسا عرق نہ نکلا"، اس پر بادشاہ متعجب ہوا تو باغبان نے عرض کیا کہ "بادشاہ کی نیک نیتی سے پیداوار میں برکت ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آپ بادشاہ ہیں جس وقت آپ نے مجھ سے باغ کی پیداوار دریافت کی، آپ کی نیت بدل گئی، اس لئے میوہ کی برکت جاتی رہی"، بادشاہ پر اس کا اثر پڑا، اور پہلا خیال دل سے نکال دیا، پھر آب انار طلب کیا، تو لڑکی گئی اور نہایت مسرت کے ساتھ ایک لبریز پیالہ بادشاہ کے سامنے پیش کیا، بادشاہ نے باغبان کے فراست کی تعریف کی اور اصل واقعہ کو ظاہر کر دیا، اس قصہ کو لکھ کر جہانگیر لکھتا ہے،

ہرگاہ ہمگی ہمت و نیت سلاطین معدلت آئین مصروف و معطوف بر آسودگی خلق و رفاہیت رعایا باشد ظہور خیرات و محصول زراعت و باغات مستبعد نیست، وللہ الحمد کہ درین دولت ابد قرین بر سر درختے ہرگز محصول رسم نبودہ است و نیست و در تمام ممالک محروسہ یکدام دیگجہ باین صیغہ داخل خزانہ عامرہ و در اصل دیوان اعلی نمیشود بلکہ حکم است کہ ہر کس در زمین مزروعی باغ ساز و حاصل آن معاف باشد[1]،

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲۵۳، ۲۵۴،

(۲) سیر و تفریح اور آرایش و زیبایش، اسی لئے امراء و ارکان دولت اپنے مکانات کے گرد باغ لگواتے تھے، چنانچہ بساتین السلاطین میں ہے،

و امراء و ارکان دولت ہر کدام متصل نجانہائے خود بقصد سیر و آرایش باغہائے ساختند[۱]

اس قسم کے باغ غالبًا تمام امراء کے مکانات کا لازمی جزو ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ باغ و عمارت لازم و ملزوم ہوگئے تھے اس سے زیادہ ترقی یافتہ صورت یہ ہے کہ پبلک کی سیر و تفریح کا سامان بھی مہیا کیا جائے، اور سلاطین اسلام نے اس مقصد سے بھی باغات لگوائے تھے، چنانچہ جہانگیر نے ایک پل کے پاس ایک عمارت اور باغچہ بنانے کا حکم دیا تو اس کا مقصد یہ بتایا کہ

"آیندہ و روندہ از دیدن آن محظوظ شوند"

پبلک کی سیر و تفریح کے لئے تمام صوبوں میں اس قسم کے بڑے بڑے شاہی باغ بنے ہوئے تھے، اور جو لوگ پبلک کو ان کے سیر و تماشا سے محروم رکھتے تھے مستحق ملامت ہوتے تھے، چنانچہ خافی خان ایک موقع پر لکھتا ہے،

"دیگر بناے بدعت بدعاقبتی این گذاشت کہ سابق درواز ہائے باغہائے بادشاہی کہ محض براے تفرج و فیض خاص و عام موضوع است برروے عالم مفتوح بود، محرم خان فرمود کہ باغات صوبجات ہمیشہ مقفل نگاہ دارند مردم را از سیر و تماشا محروم ساخت مگر جمعے کہ چیزے بنگاہ بانہاے باغ بدہند تعلق نمایند در برروے آنہا کشادہ گردد،

نیکوان رفتند سنتہا بماند ظالمان رفتند و لعنتہا بماند[۲]

[۱] بساتین السلاطین صفحہ ۱۱۲۔ [۲] خافی خان حصہ دوم صفحہ ۴۰۶۔

(۳) دیہاتوں اور قصبوں کی رونق و آبادی، چنانچہ بعض دیہاتوں اور قصبوں کے متعلق ہم نے اوپر مآثر الامراء کی جو عبارت نقل کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن امراء نے ان دیہاتوں اور قصبوں میں باغات تیار کرائے تھے، ان سے انکا مقصد ان کی آبادی کی رونق اور وسعت میں اضافہ کرنا تھا لیکن چونکہ مسلمان امراء و سلاطین نے نہایت کثرت سے دیہات، قصبات بلکہ بڑے بڑے شہر آباد کئے تھے، اس لئے گو مورخین نے تصریح نہیں کی تاہم قیاس یہ ہے کہ ان میں بھی بڑے بڑے باغ تیار کئے گئے ہونگے،

(۴) سیر و شکار کے زمانے میں قیام و آسائش، سکندر لودی نے اسی غرض سے آگرہ سے دھولپور تک بہت سے باغ اور محل تیار کروائے تھے، چنانچہ خافی خان لکھتا ہے،

ودرین سال از آگرہ تا دھولپور فرمود تا جابجا ے قصر و عمارت و باغ بنا کنند کہ از شکار گاہ آمدہ در آنجا توقف و آسائش فرماید[۱]،

(۵) مقبروں کی زینت و رونق، غالباً اس قسم کے باغ تمام امراء و سلاطین، بلکہ بزرگان دین کے مقبروں کا جزو لازمی تھے، جہانگیر اکبر کے مقبرے کی نسبت لکھتا ہے،

"باغ در غایت صفا بر دور عمارت مقبرہ منورہ ترتیب یافت[۲]"

ابوالفضل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے پہلے ہی سے عمدہ مقامات کا انتخاب کر لیا جاتا تھا، اور باغات تیار کرلئے جاتے تھے، چنانچہ وہ دلی کے متعلق لکھتا ہے،

و بسازندگان براے خواب واپسین دل گزین جاہا و باغہا بر ساختہ اند[۳]،

ان مقاصد کے پیش نظر رکھ لینے کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ تاریخوں میں اگرچہ صرف چند مخصوص باغوں کا تذکرہ کیا گیا ہو لیکن ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں نے جو باغات تیار کرائے تھے، انکا شمار نہیں کیا جا سکتا،

---

[۱] خافی خان حصہ اوّل صفحہ ۳۲۱، [۲] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ۳، [۳] آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۱۳۴

ترقی حیوانات

از مولانا عبدالسلام ندوی

مختلف ممالک کے مختلف قسم کے عجیب و غریب جانورون کا جمع کرنا، اگرچہ ایک تفریحی مشغلہ ہے، تاہم یہ تمدنی ترقی کی ایک دلیل ہے، اور بعض اوقات اس سے بڑے بڑے تمدنی فوائد حاصل ہوتے ہیں، آج بھی یہ تمدنی مشغلہ نہایت وسیع پیمانے پر جاری ہے، اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہرون میں جانورون کے عظیم الشان عجائب خانے قائم ہیں، اور سلاطینِ اسلام نے بھی ہندوستان میں یہ تمدنی خدمت انجام دی ہے، اور مختلف قسم کے جانور اس کثرت سے جمع کئے تھے کہ جانورون کے زندہ عجائب خانے کی شکل قائم ہو گئی تھی،

سب سے پہلے اس قسم کے عجائب خانے کا پتہ سلطان غیاث الدین بلبن کے دورِ حکومت مین چلتا ہے، کیونکہ سلطان غیاث الدین بلبن کو شکار کا نہایت شوق تھا، اور اسی شوق کے سلسلے میں اس نے نہایت کثرت سے عجیب و غریب، خوشرنگ، خوبصورت، خوش الحان، اور شکاری جانور جمع کئے تھے، چنانچہ سیر المتاخرین میں ہے،

وسلطان را با جانوران رنگین زیبا و خوش خوانان نغمہ سرا و طیور شکاری و یوز و سیاہ گوش امثال ذلک رغبت بسیار بود، و ازین جنس حیوانات نادرہ بسے بہم رسانیدہ[۱]

---

[۱] سیر المتاخرین ص ۱۱۰،

فیروز شاہی عہد: سلطان فیروز شاہ تغلق کو بھی شکار کا نہایت شوق تھا، اور اس نے نہایت کثرت سے شکاری جانور جمع کئے تھے، ان کے علاوہ بعض عجیب غریب انسان اور جانور اور پرندبھی اس کے دربار میں بھیجے جاتے تھے۔ اور لوگ ان عجائبات کے تماشے سے محظوظ ہوتے تھے، چنانچہ لوگون نے اس کی خدمت میں ایک نہایت پست قد کا آدمی جس کو بونا کہتے ہیں پیش کیا اور وہ اس کے حکم سے دہلی اور فیروز آباد میں چند دنون تک رکھا گیا، اور لوگ اس کے تماشے سے محظوظ ہوئے،

اس کے برعکس دو آدمی سرزمین جابہار سے آئے جو اس قدر دراز قامت تھے کہ لمبے سے لمبے آدمی انکی کمر تک پہونچتے تھے، اور جب وہ چلتے تھے، تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک منارہ حرکت کر رہا ہے، بادشاہ کے حکم سے انھون نے بھی چند دنون تک شہر مین قیام کیا، اور لوگ ان کا تماشا دیکھتے رہے،

دو عورتیں بھی آئین جو گھنی داڑھی رکھتی تھین، اور ان کے شوہر بھی تھے۔

عجیب غریب جانورون میں ایک بکری، ایک کوا، ایک سفید طوطی، ایک مچھلی اور دو گائین، اس کی خدمت میں پیش کی گئین، جنکا تماشا لوگ دیکھتے رہے، بکری کے صرف تین پانون تھے یعنی آگے کے دونون دست، اور پیچھے کا ایک پانون، باقی دوسرے پانون کی جگہ گائے کے تھن کی شکل کا گوشت نظر آتا تھا، لیکن باوجود تین پانون کے وہ اچھی طرح چلتی پھرتی اور کھاتی پیتی تھی، چند دنون تک یہ بکری، دربار شاہی کے سامنے بندھی رہی، بلکہ فیروز آباد کے محل مین رکھی گئی تاکہ لوگ آکر قدرت الٰہی کا تماشا دیکھین،

کوے کا تمام بدن سیاہ تھا، لیکن اور کوون کے برخلاف اس کی چونچ اور اس کے پانون سرخ تھے، یہ کوا بھی چند دنون تک دربار شاہی کے سامنے رکھا گیا،

اس کے برعکس طوطی کا تمام بدن تو سفید تھا، صرف چونچ اور پاؤن سیاہ تھے، یہ طوطی بھی لوگون کے دیکھنے کے لیئے کوشک نزول مین رکھا گیا،

مچھلی کا صرف سر لایا گیا تھا جو ہاتھی کے سر کے برابر تھا، یہ سر بھی چند دنون دربار کے سامنے رکھا گیا،

دونون گایون مین سے ایک گائے کے پانچ پانون تھے، چار پانون تو معمولی تھے، بقیہ پانچوان پانون گردن سے نکلکر شانے تک لٹکتا تھا، لیکن بالکل بیکار تھا، دوسری گائے کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کے دونون آگے کے پانون کی کھرین گھوڑے کی طرح تھین، یعنی ان کے بیچ مین شگاف نہ تھا، بقیہ دونون پیچھے کے پانون کی کھرین معمولی گائے کی طرح تھین[1]،

عہد سلطان زین العابدین مسلمانون کی آمد سے پہلے ہندوستان کے بیرونی ممالک سے تعلقات بہت کم تھے، اس لئے ہندوستان مین غیر ملکون کے جانور نہین آتے تھے، اور یہان کے باشندون کو دنیا کے عجیب و غریب جانورون کی خصوصیات سے واقف ہونے کا موقع نہین ملتا تھا، لیکن سلاطین اسلام کے زمانے مین بیرونی دنیا سے وسیع پیمانے پر تعلقات پیدا ہوئے اور اس بنا پر مختلف ممالک کے جانور بھی ہندوستان مین آنا شروع ہوئے، چنانچہ سلطان زین العابدین کشمیری کی شہرت جب اقصائے عالم مین پھیلی تو اس کے معاصر بادشاہون کے دل مین اس کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا، اور خاقان سعید ابو سعید شاہ نے خراسان سے اس کی خدمت مین تیز رو عربی گھوڑے، اعلیٰ قسم کے خچر اور قوی ہیکل اونٹ ہدیۃً بھیجے، اور سلطان نے بھی اس کے صلے مین زعفران، کاغذ، مشک، عطر، گلاب، سرکہ، شال، بلورین پیالے،

[1] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف از صفحہ ۳۸۴ تا ۳۸۸

اور کشمیر کی دوسری نادر چیزین روانہ کین،

اس سلسلے مین تبت کے راجہ نے دو نادر اور خوبصورت پرند جنکو راج ہنس کہتے تھے، سلطان کی خدمت مین بھیجے، ان پرندون کی خاصیت یہ تھی، کہ پانی میں دودھ ملاکر انکے سامنے رکھدیا جاتا تھا اور وہ دودھ کے اجزار کو پی جاتے تھے، اور پانی کو چھوڑ دیتے تھے، اس سے پہلے ان پرندون کی یہ خاصیت صرف سنی جاتی تھی، لیکن سلطان کو بچشم خود دیکھ لینے سے اس کا یقین آگیا،[۱]

مالوہ کے حکمران کی دلچسپی | مالوہ کا بادشاہ سلطان غیاث الدین خلجی ایک عیش پسند بادشاہ تھا، اور شکار کا نہایت شوق رکھتا تھا، اس غرض سے اس نے جانورون کے بہ کثرت عجائب خانے جن کو آہو خانہ کہتے تھے، قائم کئے تھے، اور ان میں طرح طرح کے جانور اور طرح طرح کے پرند جمع کئے تھے، اور ان مین عورتون کے جھرمٹ میں سوار ہوکر شکار کیا کرتا تھا، ہمارے مورخین اس کو ایک سادہ لوح بادشاہ کہتے ہیں، اور انکی سادہ لوحی کے متعلق یہ واقعہ نقل کرتے ہیں، کہ ایک بار ایک شخص اس کے پاس ایک گدہے کی سم لایا، اور کہا کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گدہے کی سم ہے، سلطان نے اس کو پچاس ہزار تنکہ سیاہ پر خرید لیا، اس کے بعد دو تین شخص اور بھی اسی قسم کی سم لائے، اور اسی قیمت پر فروخت کر گئے، آخر میں ایک اور شخص اسی قسم کی سم لایا، اور بادشاہ نے اس کو بھی اسی قیمت پر خریدنا چاہا، لیکن مقربان سلطنت میں سے ایک شخص نے کہا کہ شاید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گدہے کے پانچ پانون تھے، لیکن بادشاہ نے کہا کہ ممکن ہے کہ یہی اصلی سم ہو، یا یہ کہ اون میں

---

[۱] فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۴۴،

سے کسی نے غلطی کی ہو،

ممکن ہے کہ یہ اس کی سادہ لوحی ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو عجیب و غریب جانوروں کے جمع کرنے کا جو شوق تھا، اسی سلسلہ میں اس نے ان ہموں کی خریداری کی ہو[۱]

گجرات کے سلاطین کی دلچسپی | سلطان محمود شاہ ثالث گجراتی نے اوصاف بالکل سلطان غیاث الدین خلجی سے ملتے جلتے تھے، سلطان غیاث الدین خلجی اگرچہ ایک مذہبی شخص تھا تاہم اس کے ساتھ عیاشانہ زندگی بھی بسر کرتا تھا، اور شکار کا شوق اسی زندگی کا ایک جزو تھا، سلطان محمود شاہ گجراتی بھی اسی قسم کا شخص تھا، اور اس نے شکار کی غرض سے دریاے کھارندی کے کنارے ایک آہو خانہ قائم کیا تھا، اور اس مین طرح طرح کے جانور چھوڑ رکھے تھے جن مین توالد و تناسل کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا، اور اس وجہ سے انکی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی، اس آہو خانے کی چار دیواری سات کوس مین پھیلی ہوئی تھی. اور جسقدر درخت اس چار دیواری کے اندر تھے سب پر سبز و سرخ مخمل لپیٹے گئے تھے، اس آہو خانے میں جو باغیچے لگائے گئے تھے، ان کی باغبانی عورتون سے متعلق تھی، اور سلطان انکے ساتھ اس میں شکار اور چوگان کھیلتا تھا[۲]

شہنشاہ اکبر کی دلچسپی | سیر و تفریح کے لیے مختلف قسم کے جانورون کی فراہمی بھی اگرچہ ایک تمدنی مشغلہ ہے، تاہم اصلی تمدنی خدمت یہ ہے کہ غیر ممالک کے حیوانات کی نسلون مین اضافہ کیا جائے، اور ملکی جانورون کی نسل کو ترقی و تربیت کے ذریعہ سے اعلیٰ تر بنا کر ملک کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد بنایا جائے، فرمانروایان اسلام میں تیموری

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۸۱، [۲] فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۲۸،

دورِ حکومت مین اسکا سلسلہ اکبر کے زمانے سے شروع ہوا، اور اُس نے ایک ساتھ یہ دونون تمدنی خدمتین انجام دین، ایک طرف تو اس نے سیر و تفریح کی غرض سے ایران، توران اور کشمیر کے تمام شکاری اور غیر شکاری جانور فراہم کیے[1] مختلف ممالک بالخصوص کابل کے نہایت عمدہ کتے جمع کیے، جو زیورون سے آراستہ کیے گئے، اور ان کے نام رکھے گیے، یہ کتے شیرون سے لپٹ جاتے تھے، اور ان کو زمین پر پچھاڑ دیتے تھے، ہرن سے ہرن کے شکار کرنے کی ابتدا اگرچہ سلطان فیروز خلجی نے کی تھی، لیکن اکبر نے اس طریقہ کو اسقدر ترقی دی کہ اس قسم کے شکاری ہرنون کی ایک مستقل نسل تیار ہوگئی، اور ایک ہرن نے ایک چیتے کا شکار کیا،[2]

کبوترون کی نسل کو بہت زیادہ ترقی دی، اکبر کے اس شوق کو دیکھکر ایران اور توران کے بادشاہون نے ہدیۃً کبوتر بھیجے، اور سوداگر بھی بہ کثرت عمدہ عمدہ کبوتر لائے اور اکبر نے ان کبوترون کی نسل اور انکے اوصاف کو جس طرح ترقی دی اس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

(۱) قدیم زمانے مین صرف ایک ذات کے کبوترون کے پیوند سے بچہ لیتے تھے اکبر نے اس کی بنیاد اوصاف پر رکھی یعنی مختلف اوصاف کے کبوترون کو پیوند دیا اور اس طریقہ سے عمدہ قسم کی نئی نئی نسلین تیار ہوگئین،

(۲) پہلے اگیارہ یا اکیس کبوتر ایک ساتھ اوڑائے جاتے تھے، اکبر کے زمانے میں ایک سو ایک کبوتر ساتھ اوڑنے لگے،

(۳) پہلے کبوترون کے شناخت کی علامتین بہت کم اور مشکل تھین، اکبر نے بہت زیادہ

---

[1] آئین اکبری جلد سوم صفحہ ۴۷ [2] ایضاً جلد اول ص ۱۵۰

علامتین پیدا کین جن سے کبوترون کی شناخت مین آسانی ہوگئی،

(۴) رنگ کے اعتبار سے کبوترون کے مختلف نام رکھے،

دوسری طرف ملکی اور غیر ملکی جانورون کی نسل کو ترقی دیکر انکو ملک کے لئے زیادہ مفید اور کار آمد بنایا، مثلاً ہاتھی ہندوستان کا ایک نہایت عام اور کار آمد جانور ہے، لیکن اکبر سے پہلے اس کی نسل میں کوئی ترقی نہین ہو سکتی تھی، کیونکہ ہندوستان کے لوگ ہاتھی سے بچہ لینا منحوس سمجھتے تھے، لیکن اکبر کے زمانے میں ہاتھیون سے بچے لئے گئے، اور نحوست کا خیال دلون سے دور ہو گیا، ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے،

وپیشینیان از خانگی نتاج بر نگرفتے و نافرخ انگاشتے اقبرمان گیتی خدیو گزین نر او بر بچہ برگرفتند و آن خدک از دلہا برخاست[۱]

اکبری دور سے پہلے ہندوستان مین عمدہ گھوڑے نہیں پیدا ہوتے تھے، اکبر کے شوق کو دیکھکر، عراق عرب، عراق عجم، روم، ترکستان، بدخشان، شروان، قرغز، تبت، کشمیر، توران، ایران اور دوسرے ممالک کے تاجر عمدہ عمدہ گھوڑے لائے اور اکبر نے اس تجارت کا نہایت عمدہ انتظام کیا، اور لوگ ان گھوڑون کی نسل کے پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ

در اندک فرصتے ہندوستان باج ستان عرب آمد و بسیارے از عربی و عراقی جدا نتوانند کرد[۲]

کشمیر اور دوسرے کوہستانی علاقون کے گھوڑے جنکو گوٹ یا ٹانگن کہتے تھے نہایت پست قد ہوتے تھے، اگرچہ حکام کے لئے کبھی کبھی تحفۃً غیر ممالک کے

---

[۱] آئین اکبری جلد اول ص ۸۶، [۲] آئین اکبری جلد اول ص ۹۴،

گھوڑے بھی آجاتے تھے، لیکن ان کی نسل کے ترقی دینے کا کوئی انتظام نہ تھا، اکبر نے کشمیر میں اسکا خاص طور پر انتظام کیا اور گھوڑون کی نہایت عمدہ نسلین تیار ہوگئین، چنانچہ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے:۔

"پیش از عہد دولت حضرت عرش آشیانی (اکبر) مدار سواری مردم اینجا بر گونٹ بود، اسپ کلان نمے داشتند، مگر از خارج اسپ عراقی وترکی برسم تحفہ بہت حکام آوردندے۔ گونٹ عبارت از یابوے است چہار شانہ بزمین نزدیک درسائر کوہستان ہند نیز فراوان می باشد بعد ازانکہ این گلشن خدا آفرین بتائید دولت ومین تربیت خاقان سکندر آئین رونق جاوید یافت بسیارے از اہمافات را درین صوبہ جاگیر مرحمت فرمودہ گلہ ہاے اسپ عراقی وترکی حوالہ شد کہ کرہ (بچھڑہ) بگیرند ودر اندک فرصت اسپان بہم رسیدہ[1]"

خچر صرف گجلی اور اس کے اطراف میں پیدا ہوتے تھے، لیکن بڑے بڑے لوگ گدہے کی طرح ان کی سواری کو موجب ننگ وعار سمجھتے تھے، اکبر کے زمانے میں عراق عرب اور عراق عجم وغیرہ سے بھی خچر آنے لگے، اور لوگون کو ان کی سواری سے عار نہ رہا، اور بہترین خچر کی قیمت ہزار روپیہ تک پہونچ گئی[2]

اونٹ اگرچہ اجمیر، جودھپور، ناگور، بیکانیر، جیسلمیر، بھٹنڈا، بھٹنیر، گجرات اور سندھ میں بکثرت پیدا ہوتے تھے، لیکن ان کی عمدہ نسلون کو پیدا کرنے اور انکے ترقی دینے کا کوئی انتظام نہ تھا، اکبر نے اس کی طرف خاص توجہ کی اور اسقدر عمدہ

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۳۶، [2] آئین اکبری جلد اول صفحہ ۱۴۰

نسلیں تیار ہوگئیں، جو غیر ممالک کے اونٹوں کا مقابلہ کرتی تھیں، چنانچہ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے،

ودرین آباد بوم گزیدہ سترگ چہرہ برافروخت واز تورانی و ایرانی پیشی گرفت[1]

دوسرے موقع پر لکھتا ہے،

دبہ شاہی خواہش شتر را چنان نتاج برگرفتند کہ از عراقی بختیان برگذشت[2]،

جہانگیری عہد | جہانگیر نے اپنے دور حکومت میں اگرچہ اکبر کی طرح کار آمد جانوروں کی نسل کو کوئی خاص ترقی نہیں دی، تاہم اس نے اس سلسلے میں اکبر کے ادھورے کاموں کو پورا کیا، مثلاً چیتے کی یہ خاصیت ہے کہ وہ جنگل کے سوا اور کہیں بچہ نہیں جنتا اکبر نے اس خاصیت میں تبدیلی پیدا کرنا چاہی، اور اس غرض سے ایک مدت تک ایک ہزار چیتوں کو یکجا رکھا، اور بار ہا نر و مادہ کو باغوں میں آزاد چھوڑ دیا کہ نر مادہ سے جفت ہو، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی، جہانگیر کے زمانے میں اس قدر تغیر ہوا کہ ایک چیتہ مادہ سے جفت ہوا، اور ڈھائی مہینے میں بچہ پیدا ہوا، جہانگیر نے فخریہ لکھا ہے کہ گرفتاری کے بعد شیر اور چیتے کبھی جفت نہیں ہوتے، لیکن میرے عہد حکومت میں صحرائی جانوروں کی وحشت چونکہ بالکل زائل ہوگئی ہے، اس لئے شیر اس قدر رام ہوگئے ہیں کہ بے قید و زنجیر قطار در قطار شہر میں چھوٹے پھرتے ہیں، اور آدمیوں کو نہیں ستاتے، اتفاق سے ایک شیرنی حاملہ ہوئی اور ۳ مہینے کے بعد اس نے بچہ دیا، حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ جنگلی شیر گرفتاری کے بعد جفت ہو

---

[1] آئین اکبری جلد اول ص ۹۹ [2] آئین اکبری جلد سوم صفحہ ۷ [3] تزک جہانگیر مطبوعہ نولکشور ص ۱۱۰،

چکور بھی میدان کے سوا اور کہین بچہ نہین دیتا، اکبر نے بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا لیکن جہانگیر کے زمانے مین چکور نے انڈے دئے اور اس طرح دو سال کی مدت مین ساٹھ ستر بچے پیدا ہوئے[1]، سارس کی نسبت بھی مشہور ہے کہ وہ گھرون مین انڈے بچے نہیں دیتا، لیکن جہانگیر کی سرکار مین سارس کا ایک جوڑا تھا، جس کا نام اس نے لیلی مجنون رکھا تھا، یہ دونون باہم جفت ہوئے اور انڈے اور بچے دئے، (تزک جہانگیری صفحہ ۲۳۵، ۲۳۹، ۲۴۴)،

کار آمد جانورون مین وہ اصیل بکری کی نسل کے ترقی دینے اور پھیلانے کا بڑا خواہشمند تھا، چنانچہ تزک مین لکھتا ہے،

دور فراہم آوردن بکہ ماخورد و بز اصیل نہایت توجہ دارم ومیخواہم کہ نتاج اینہا بسیار شود و در مردم انتشار یابد[2]"

اکبر کے زمانے تک کبوتر صرف سیر و تفریح کے لئے اوڑائے جاتے تھے، لیکن جہانگیر نے نامہ بر کبوتر تیار کرائے، اور ان سے نامہ بری کا کام لیا، چنانچہ تزک مین لکھا ہے کہ مین نے پہلے روز ان کو مانڈو سے اوڑایا تو معلوم ہوا کہ اگر بارش زیادہ ہوتی ہے، تو انتہا سے انتہا ڈہائی پہر مین بلکہ ڈیڑھ پہر مین برہانپور تک پہونچ جاتے ہین، اور اگر ہوا صاف ہوتی ہے، تو اکثر کبوتر ایک ہی پہر مین یہ مسافت طے کرلیتے ہین[3]، لیکن زیادہ جہانگیر کو عجیب و غریب جانورون کے جمع کرنے کا شوق تھا، اور اس پر وہ بیدریغ روپیہ صرف کرتا تھا، چنانچہ ایک بار مقرب خان

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۰۶، [2] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲۷۳، [3] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۹۲،

گوگوا مین بھیجا کہ وہان کی نادر چیزین خرید کر لائے، مقرب خان نے بیدریغ روپیہ صرف کر کے وہان سے بہ کثرت نادر چیزین لایا جن مین چند عجیب و غریب جانور بھی تھے، چنانچہ جہانگیر لکھتا ہے،

از انجملہ جانورے چند آوردہ بسیار عجیب و غریب چنانچہ تا حال ندیدہ بودم بلکہ نام او را کسے نمی دانست،

جہانگیر نے ان عجیب و غریب جانورون کی تصویرین کھنچوا کر جہانگیر نامہ مین شامل کروائین، اور ان مین دو جانورون یعنی پیرو اور ایک عجیب و غریب بندر کا حال تزک مین تفصیل کے ساتھ لکھا ہے[1]،

جہانگیر کے اس شوق کو دیکھکر لوگ نہایت عجیب و غریب جانور لاتے تھے، اور اس کی خدمت مین پیش کرتے تھے، ایک بار راجہ نرسنگھ دیو نے سفید چیتہ اس کی خدمت مین پیش کیا، جو کبھی اس کی نظر سے نہین گذرا تھا، چنانچہ تزک مین لکھتا ہے کہ اگرچہ جانورون کی مختلف قسمین سفید پیدا ہوتی ہیں، لیکن اب تک سفید چیتہ نہین دیکھا گیا تھا، مین نے سفید رنگ کے جانورون مین صرف شاہین، باشہ، شکرہ، گنجشک، کوا، بٹیر، تیتر، بودنہ، طاؤس، باز، چوہا، اور چکارہ دیکھا ہے[2]،

ایک بار سراندیپ کا ایک درویش اس کی خدمت مین ایک نادر جانور لایا جسکو دیوتک کہتے تھے، جہانگیر لکھتا ہے،

روے پشت برہ کلان شباہت تمام دارد و ہیئت مجموعی او بہ میمون شبیہ است اما دم ندارد و حرکاتش بہ میمون سیاہ بے دم کہ

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۰۶، [2] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۶۷

بزبان ہندی بن مانس میگویند جثۂ او برابر میمون بچہ دو سہ ماھہ باشد پنج سال پیش این درویش بودہ است معلوم شد کہ ازین کلان ترنمے شود، خورش او شیر است کیلہ ہم میخورد،

چونکہ یہ جانور جہانگیر کو نہایت عجیب معلوم ہوا اس لئے مصورون کو حکم دیا کہ مختلف حرکات کے ساتھ اس کی تصویر کھینچیں[1]،

ایک بار لوگ اس کی خدمت مین شیر دار ہرنی لائے، جو بے تکلف دودھ دوھنے دیتی تھی، اور روزانہ چار سیر دودھ دیتی تھی، جہانگیر نے لکھا ہے کہ اب تک مینے دودھ دینے والی ہرنی نہین دیکھی تھی، ہرنی اور گائے بھینس کے دودھ کے مزہ مین کوئی فرق نہیں ہوتا[2]، ایک بار ایک شخص نے اس کی خدمت میں ایک بدھی بکرا پیش کیا جو بکری کی طرح تھن رکھتا تھا، اور بقدر قہوہ کی ایک پیالی کے دودھ دیتا تھا[3]،

ایک بار ولایت زیرباد سے ایک پرند لاکر اس کی خدمت مین پیش کیا گیا، جس کی خاصیت یہ تھی کہ پانی بالکل نہین پیتا تھا، کیونکہ پانی اس کے لئے زہر کا حکم رکھتا تھا، اور تمام رات اولٹا لٹک کر چہچہے کرتا تھا، چنانچہ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے،

درین روزہا جانورے از ولایت زیرباد آوردہ بودند کہ رنگ اصل بدن او موافق برنگ طوطی است لیکن در جثہ از وکوچک تر است

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۶۹ [2] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۱۰۱
[3] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور ص ۱۰۵،

یکے از خصوصیات این جانور آن است کہ تمام شب پائے خود را
بر شاخ درختے وبا چوبے کہ او را بران نشانیدہ باشند بند کردہ
خود را سر نشیب مے سازد و با خود زمزمہ میکند، آب مطلق نے خورد
و در طبیعت او کار زہر میکند[۱]

ایک بار پہلوان بہار الدین برق انداز نے ایک لنگور کے بچے کو ایک
بکری کے ساتھ پیش کر کے عرض کیا کہ میرے ایک توپچی نے ایک لنگور کی مادہ
کو جو سینے سے اپنے بچے کو لپٹائے ہوئے تھی بندوق کا نشانہ بنایا، بندوق
چلنے کے ساتھ ہی اس نے بچے کو سینے سے الگ کر کے ایک شاخ پر چھوڑ دیا۔
اور خود زمین پر گر کر مر گئی، اسی اثنا مین مین پہونچ گیا، اور بچے کو شاخ سے
اتار کر دودھ پلانے کے لئے اس بکری کے پاس لے گیا، خدا نے بکری کو
اس پر مہربان کر دیا، اور باوجود عدم جنسیت کے باہم دونون میں اسقدر
محبت ہو گئی ہے کہ گویا یہ بچہ بکری کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے، جہانگیر نے
یہ سنکر حکم دیا کہ بچے کو بکری سے جدا کر لین، بچے کے جدا ہونے کے ساتھ ہی
بکری نے چلانا شروع کیا، اور لنگور کا بچہ بھی بے قرار ہو گیا، جہانگیر اس واقعہ
کے بعد لکھتا ہے کہ دودھ پینے کی غرض سے لنگور کے بچے کی محبت چندان
تعجب انگیز نہین، البتہ بکری کی محبت بہت زیادہ حیرت انگیز ہے،[۲]

ایک بار شاہزادہ داور بخش نے اس کی خدمت میں ایک شیر نر پیش کیا، جو
ایک بکری کے ساتھ اسقدر مانوس ہو گیا تھا کہ دونون ایک پنجرے میں

[۱] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۳۴ [۲] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲۲۳

رہتے تھے، جہانگیر نے حکم دیا کہ اس بکری کو چھپا دیں، شیر نے چیخنا چلانا شروع کیا، پھر حکم دیا کہ اُسی رنگ روپ کی دوسری بکری پنجڑے میں داخل کریں، شیر نے پہلے اس کو سونگھا، پھر اس کی کمر توڑ ڈالی، اب حکم ہوا کہ بھیڑ کو پنجڑے میں ڈالیں شیر نے اس کو بھی چیر پھاڑ ڈالا، پھر اس بکری کو لائے، حسب دستور سابق الفت و محبت کا اظہار کرنے لگا، چت لیٹ گیا، اور بکری کو سینے سے چمٹا کر اسکا مونھ چاٹنے لگا،

فرمانروایان اسلام کے دور میں عجیب و غریب جانوروں کے فراہم ہونے کا ایک سبب جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے یہ تھا کہ سلاطین ایک دوسرے کو جو تحفے اور ہدیے بھیجتے تھے، ان میں جانور بھی ہوتے تھے، چنانچہ شاہ عباس صفوی نے اسی تقریب سے بہت سے تحفوں کے ساتھ جہانگیر کی خدمت میں ایک شاہین سفید بھیجا تھا، جہانگیر نے بھی شاہ عباس کے پاس جب بہت سے تحفے بھیجے تو ان میں ایک عجیب و غریب گورخر تھا، جس کی تصویر جہانگیر نے ان الفاظ میں کھینچی ہے،

درینولا گورخرے بنظر در آمد بغایت غریب و عجیب بعینہ مانند شیر سیاہ و زرد است این سیاہ و سفید از سر بینی تا انتہاے دم و از نوک گوش تا سر سم خطہاے سیاہ مناسب جا و مقام کلان و خرد بقرینہ او فتادہ و بر گرد چشم خطے سیاہ در غایت لطافت کشیدہ گوئی نقاش تقدیر بقلم بدائع نگار کارنامہ در صحیفہ روزگار گذاشتہ، ازبسکہ عجب بود بعضے را گمان آن بود کہ شاید رنگ کردہ باشند بعد از تحقیقات بہ یقین پیوست کہ از خداوند جہان آفرین است، چون نادر بود داخل سوغات ہاے برادرم

لہ تزک جہانگیری ص ۳۰۹ مطبوعہ نولکشور

شاہ عباس نمودہ شد[۱]،

جہانگیر کو نادر اور عجیب و غریب جانوروں کا اسقدر شوق تھا کہ اس نے بعض ایسے جانوروں کا پتہ لگایا جن کا صرف نام ہی نام سنا جاتا تھا، مثلاً لوگ ہما کا صرف نام ہی نام سنتے ہیں، کسی نے اس کو دیکھا نہیں ہے، لیکن جہانگیر کو جب پتہ چلا کہ کوہ پیر پنجال میں ایک جانور رہتا ہے جو ہما کے نام سے مشہور ہے، اور وہ صرف ہڈی کے ٹکڑے کھاتا ہے، اور ہمیشہ ہوا میں اوڑتا ہوا نظر آتا ہے، تو اس نے حکم دیا کہ جو قراول اس کا شکار کر کے لائے ہزار روپیہ انعام پائے گا، چنانچہ جمال خان قراول اسے بندوق سے مار کر لایا، چونکہ زخم اس کے پاؤں پر لگا تھا، زندہ و تندرست تھا، جہانگیر نے اس کے چینہ دان کو چاک کروا کے دیکھا تو اس سے ہڈی کے ٹکڑے نکلے، اور پہاڑی آدمیوں نے بھی بیان کیا کہ وہ صرف ہڈی کھاتا ہے اس غرض سے ہمیشہ ہوا میں اوڑا کرتا ہے اور نگاہ زمین پر رکھتا ہے، جہاں کہیں ہڈی نظر آتی ہے، چونچ میں لیکر اوڑ جاتا ہے اور اوپر سے اس کو زمین پر گرا دیتا ہے تاکہ چور چور ہو جائے، اس کے بعد اس کو چن چن کر کھا جاتا ہے، اسی بنا پر شاعر کہتا ہے،

ہمائے بر ہمہ مرغان ازان شرف دارد | کہ استخوان خورد و طائرے نیاز ارد[۲]

جہانگیر جب شکار کرتا تھا تو بعض جانوروں کا وزن اور تشریح کرتا تھا جس سے بعض جانوروں کے خصائص کے علل و اسباب پر روشنی پڑتی تھی، اور بعض مشہور باتوں کی غلطی ثابت ہو جاتی تھی، مثلاً اس نے ایک شیر ببر کا شکار کیا، اور اس کی تشریح اس غرض سے کرائی کہ اس کی بہادری کا سبب معلوم ہو، تو معلوم ہوا کہ

---

[۱] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۳۳۳ - [۲] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۴۰۹

بخلاف اور جانوروں کے شیر ببر کا پتہ جگر کے اندر ہوتا ہے، اور اس کی بہادری کا غالباً یہی سبب ہے، چنانچہ تزک میں لکھتا ہے،

بخلاف حیوانات دیگر کہ زہرۂ آنہا خارج جگر واقع است زہرۂ شیر ببر درون جگر جا دارد و بخاطر میرسد کہ دلاوری شیر ببر ازین ممر خواہد بود[1]

ایک نر بھیڑیئے کے پتہ کا تجربہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شیر کی طرح اس کا پتہ بھی جگر کے اندر ہوتا ہے،

ایک خاص قسم کے ہرنون کی نسبت مشہور تھا کہ ان کے پتہ نہیں ہوتا لیکن جہانگیر نے اس کی تشریح کرائی تو معلوم ہوا کہ یہ ایک بے اصل بات ہے[2]،

مختلف قسم کے غیر معمولی قد و قامت کے جانورون کے وزن کرانے کا حال اس نے تزک میں جابجا لکھا ہے،

شاہجہانی عہد شاہ جہان اگرچہ اپنے باپ کی طرح عجیب و غریب جانورون کا اسقدر شائق نہ تھا تاہم اس کو عمدہ گھوڑون کا نہایت شوق تھا، اور ان کو غیر ممالک سے منگوا تا تھا، چنانچہ ایک بار ایک شخص طریف نامی کو ایران کے ایلچی کے ساتھ عراقی گھوڑون کی خریداری کے لئے روانہ کیا تھا لیکن چونکہ وہ اچھی طرح اس خدمت کو انجام نہ دے سکا تھا، اس لئے اس نے عرض کیا کہ اگر مجھکو عرب اور ملک روم میں بھیجا جائے تو سفر ایران کی شرمندگی کا تدارک کر سکون گا، چنانچہ شاہ جہان نے اس کو جلوس کے دسوین سال بہت سے تحفہ و ہدایا کے ساتھ سلطان مراد قیصر روم کی خدمت میں بھیجا اور اس نے

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۸۴ [2] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۸۴،

موصل میں جو گھوڑون کی منڈی تھی ٹھہر کر گھوڑون کی خریداری کی [۱]

شاہجہانی دور سے پہلے سفید ہاتھی کا وجود صرف افسانہ کی حیثیت رکھتا تھا، اور صرف یہ سنا جاتا تھا کہ سلاطین عجم میں کسریٰ اور پرویز کے فیلخانے میں اس قسم کا ہاتھی تھا، مسلمان فرمانروایان ہند میں بہت سے بادشاہون کو اس قسم کے ہاتھی کی تلاش تھی، بالخصوص اکبر کو ہاتھیون کا اسقدر شوق تھا کہ اس کی وفات کے بعد ۶ ہزار ہاتھی اس کے فیلخانے میں نکلے، اس شوق کے ساتھ اس نے ۵۲ سال تک حکومت کی اور برابر اس قسم کے ہاتھی کی تلاش میں مصروف رہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی، شاہجہانی دور میں صرف حسن اتفاق اور شاہجہان کے بلند اقبال سے اس قسم کا ہاتھی اسکے فیل خانے میں داخل ہوا جس کی تفصیل یہ ہے،

جہانگیری دور میں خواجہ نظام ایک مشہور تاجر تھے جن کے گماشتے بندر پیگو، چین، اور اچین وغیرہ کا دورہ کیا کرتے تھے، اور وہان سے سامان تجارت خرید کر ہندوستان لاتے تھے، بندر پیگو و برہما، میں ایک نہایت کمسن اور لاغر ہاتھی کا بچہ فروخت ہونے کیلئے آیا جس کی نسبت خافی خان نے لکھا ہے، کہ اسکا رنگ مائل بہ خاکستری تھا، اگرچہ یہ یقین نہیں تھا کہ آئندہ اسکا کیا رنگ نکلیگا تاہم اس امید میں کہ شاید آئندہ اسکا رنگ سفید نکل آئے، انھون نے اس بچہ کو خرید لیا، اور خواجہ نظام کے پاس لائے، اور انھون نے امیدواری کے سلسلے میں چند دنون تک اس بچہ کو اپنے یہان رکھنا چاہا، اسی اثنا میں جہانگیر نے اُن کو یاقوت کی خریداری کے لئے بندر پیگو کی طرف روانہ کیا، چونکہ سید ولیر خان سے انکی ملاقات تھی، اسلئے اس بچے کو انھون نے انکی جاگیر میں چھوڑ دیا، سوء اتفاق سے خواجہ نظام بندر پیگو میں مدتون کے لئے نظربند ہو گئے اور یہ بچہ ۱۲ سال تک ان کی جاگیر میں پرورش پاتا رہا، اور اس مدت میں اس کا رنگ صاف ہوتے ہوتے بلور کی طرح بالکل

---

[۱] خافی خان جلد اول صفحہ ۵۰۴،

سفید ہوگیا، چونکہ ایک نادر جانور تھا، سید دلیر خان نے اس کو شاہجہان کے دربار میں پیش کیا، جس کو اس نے نہایت پسند کیا، اور اس کا نام گج پتی رکھا، جب شاہ جہان اس پر سوار ہوا، تو طالب کلیم نے فی البدیہی یہ رباعی کہی۔

برفیل سفیدت کہ بنیاد گزند | شد بخت بلند ہر کہ او دیدہ فگند
چون شاہجہان بر زبر آمد گوئی | خورشید شد از سپیدۂ صبح بلند

اور عمدہ صلہ پایا[1]

سفید ہاتھی کی طرح سفید طاؤس بھی ایک کمیاب اور نادر پرند ہے، اگرچہ جہانگیر نے لکھا ہے، کہ مین نے سفید طاؤس دیکھا ہے، لیکن شاہ جہان نے نہیں دیکھا تھا، ایک بار اسلام آباد (کشمیر) کے جنگل میں اس قسم کا طاؤس ہاتھ آیا، اور وہان کے ایک شخص نے تحفۃً شہزادہ عالمگیر کی خدمت میں، اور عالمگیر نے شاہجہان کی خدمت میں پیش کیا، جس کو دیکھکر لوگ نہایت مسرور و متحیر ہوئے[2]، امراے شاہجہانی میں مرزا جعفر کو جانورون کے جمع کرنے کا نہایت شوق تھا چنانچہ مآثر الامراء میں ہے،

در ہر موسم بفراہم آوردن جانوران شغفے داشت[3]

عالمگیری عہد — عالمگیر کو اگرچہ بذات خود اس قسم کے جانورون کی طرف میلان نہ تھا تاہم اس کے امرا میں فیض اللہ خان نے دنیا کے ہر قسم کے جانورون کا ایک بہت بڑا عجائب خانہ قائم کیا تھا، یہان تک کہ مچھر اور پسو تک کو بھی لکڑی اور تانبے کے ظروف میں پال رکھا تھا، چنانچہ مآثر الامراء میں ہے،

---

[1] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۰۲،۳۰۳ و خافی خان جلد اول صفحہ ۴۱۰، ۴۱۱، دونون کتابون کی روایتون میں کسی قدر اختلاف ہے [2] عمل صالح جلد دوم ص ۲۴۶، [3] مآثر الامراء حصہ اول ص ۱۱۳،

صحبت او جز باصناف دواب و سباع و وحوش و طیور و سوام و ہوام نادر دکہ از اقصاے امصار دنیا در برائے اوے آوردند نمیساخت، گویند کم جانورے بود از وحشی و انسی و متعارف و غیر متعارف کہ در سرکارش فراہم نیامد حتی کبک و بشتہ و سوس و شپش را در اوانی چوبی و سی نگاہداشتے و پرورش میدادے[1]"

ترجمہ مآثر عالمگیری میں ہے،

اس کا تمام وقت چوپایون اور درندون اور وحوش و طیور کی جو دور دراز ممالک و بندرگاہون سے خاص اسی امیر کے لئے لائے جاتے تھے، پرورش و پرداخت اور ان کے سیر و تماشے میں صرف ہوتا تھا[2]۔

---

[1] مآثر الامرا، حصہ سوم صفحہ ۳۰ [2] ترجمہ مآثر عالمگیری ص ۱۴۸،

تعلیم کی ترقی

از مولانا عبدالسلام ندوی

ہندوستان میں اگرچہ اسلامی فتوحات کا آغاز پہلی صدی ہجری سے ہوا، لیکن اسلامی حکومت کی اصلی بنیاد سلطان محمود نے قائم کی جو ایک مذہبی اور علم دوست بادشاہ تھا، اور اسی علم دوستی اور مذہبی شیفتگی کا یہ اثر تھا کہ جب وہ ۴۰۹ھ کے بعد قنوج کو فتح کرکے غزنی میں واپس آیا، تو ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی جس کے پہلو میں ایک مدرسہ اور اس مدرسہ میں ایک کتب خانہ قائم کیا، اس مسجد اور مدرسہ پر بہت سے دیہات وقف کئے، سلطان محمود کے اس علمی اور مذہبی ذوق کو دیکھکر اس کے امرار و اعیان دولت نے بھی اس کی تقلید کی اور بہت سے مدرسے اور بہت سی مسجدیں اور خانقاہیں قائم کیں[1]، سلطان محمود کے بعد اس کا دوسرا لڑکا شہاب الدین مسعود اس کا جانشین ہوا، جو اپنے باپ ہی کی طرح علم پرور اور علم دوست تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کے دربار میں علمار و فضلار کا مجمع رہتا تھا، اور وہ ان کے ساتھ نہایت فیاضانہ برتاؤ کرتا تھا، ان میں بہت سے علمار نے اس کے نام پر کتابیں لکھیں اور بیش قرار انعامات پائے، چنانچہ ابوریحان خوارزمی نے اس کے نام پر ریاضی میں قانون مسعودی لکھی تو اس کو چاندی

---

[1] فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰،

کا ایک ہاتھی انعام میں دیا، قاضی ابو محمد ناصحی نے بھی فقہ حنفی میں اس کے نام پر کتاب مسعودی لکھی، اس علم دوستی کا یہ نتیجہ تھا کہ اس نے اپنے حدود حکومت میں بہ کثرت مدرسے قائم کئے، چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے،

در اوائل سلطنت او در ممالک محروسہ چندان مدارس و مساجد بنیاد نہادند که زبان بیان از تعداد آن عاجز و قاصر است[۵]،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے جو حصے سلاطین غزنویہ کی سلطنت میں شامل تھے، ان میں بھی مدارس ضرور رہے ہوں گے،

دوسری تاریخی تصریحات سے بھی یہ ثابت ہے کہ نہایت قدیم زمانے سے ہندوستان میں، مدارس کے قائم کرنے کا رواج ہو چکا تھا، چنانچہ فرشتہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے حال میں لکھتا ہے:

"چون مولانا قطب الدین کاشانی از ماوراء النہر بملتان رسید شاہ ناصر الدین قباچہ والی ملتان سرائے با مدرسہ برائے او بنا نمود و مولانا کہ علامۂ روزگار بود نماز بامداد دران مدرسہ گزاردہ بدرس گفتن می پرداخت و شیخ بہاء الدین زکریا کہ ابتدائے حال او بود ہر روز نماز بامداد آنجا حاضر شدے و نماز فجر در پس او گزاردے[۶]"،

شیخ بہاء الدین زکریا کی ولادت ۵۷۸ھ میں ہوئی، اس لئے چھٹی صدی ہجری کے اختتام اور ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں ہندوستان میں مدرسوں کے قائم کرنے کا رواج ہو چکا تھا،

---

[۵] فرشتہ جلد اول ص ۳۴۲ [۶] فرشتہ جلد دوم ص ۸۰۴

اسی زمانے میں خسرو ملک بن خسرو شاہ غزنوی کو بہ مقام لاہور امیر شہاب الدین محمد غوری کے مقابلے مین شکست ہوئی، اور حکومت ہند خاندان غزنویہ کے ہاتھ سے نکل کر غوری خاندان مین منتقل ہوگئی، اس کے بعد شہاب الدین محمد غوری نے ۵۸۷ھ مین اجمیر کو فتح کیا، اور وہان متعدد مدرسے قائم کئے، اگرچہ ان مدارس کی تاریخ بنا صحیح طور پر متعین نہین تاہم یہ یقینی ہے، کہ یہ ہندوستان کے قدیم ترین مدارس ہیں[1]، اسی زمانے میں دو اور مدرسون کا پتہ چلتا ہے، ایک مدرسہ معزی، اور دوسرا مدرسۂ ناصریہ، مصنف طبقات ناصری نے سلطان رضیہ کے حال مین ضمنی طور پر ان دونون مدرسون کا ذکر کیا ہے، چنانچہ مدرسہ معزی کی نسبت لکھا ہے کہ جب قرامطہ نے دہلی پر یورش کی تو اس مدرسہ کو جامع مسجد سمجھ کر اس کے اندر گھس آئے[2]، اس سے ہم کو اس زمانے کے مدرسون کے طرز تعمیر اور ان کی عمارتون کی شان وشوکت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے، مدرسہ ناصریہ کے مہتمم اور نگران خود طبقات ناصری کے مصنف مقرر ہوئے تھے، چنانچہ لکھتے ہین،

"در ماہ شعبان ہمین سال (۶۳۵ھ) سلطان رضیہ مدرسہ ناصریہ در حضرت منضم باقتضائے کالیور بدین داعی مفوض فرمود[3]"

اگرچہ یہ تصریح نہیں کی ہو کہ یہ مدرسے کب قائم ہوے ؟ اور کس نے قائم کئے، تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے، کہ مدرسہ معزی کو شمس الدین التمش نے جو ۶۰۷ھ میں تخت نشین ہوا تھا، اپنے آقائے ولی نعمت شہاب الدین غوری جس کا اصلی نام معزالدین محمد غوری ہے، کے نام پر قائم کیا تھا، اور مدرسہ ناصریہ ناصر الدنیا والدین شہزادہ محمود بن سلطان شمس الدین التمش کے نام پر قائم کیا گیا تھا، اسی عہد میں جب محمد بختیار خلجی نے بنگال کو فتح کیا تو وہان

۱؎ معارف جلد چہارم نمبر۲ بابت ماہ ذیقعدہ ۳۷ھ، ۲؎ طبقات ناصری صفحہ ۱۸۹، ۳؎ طبقات ناصری ص ۱۸۸

بہ کثرت مدرسے، مسجدیں اور خانقاہیں، قائم کیں اور یہ پہلا دن تھا کہ ان اطراف میں شعائر اسلام کا رواج ہوا، چنانچہ فرشتہ اس کے حال میں لکھتا ہے،

اولین کسے از بادشاہان اسلام کہ بآن نواحی رفتہ وشعار اسلام دراں حدود رواج دادہ محمد بختیار خلجی است۔

درعوض شہر نودیا شہرے موسوم برنگ پور تیار کردہ دار الملک خود ساخت ومساجد وخوانقاہ ومدارس دراں شہر وولایت بجائے معابد کفار برسم شعار اسلام برونق ورواج تمام مزین ومحلی گردانید[1]

اس کے ارکان سلطنت نے بھی اس کی تقلید کی اور اس طرح ان اطراف میں بہ کثرت مدرسے قائم ہوگئے، چنانچہ طبقات ناصری میں ہے،

مساجد ومدارس وخانقاہات دراں اطراف بسعی جمیل او وامراے او بنا شدہ[2]

اس کے بعد آٹھویں صدی ہجری میں فیروز شاہ تغلق نے تعلیم کو بہت زیادہ ترقی دی، اور جو قدیم مدرسے بالکل بے نام ونشان ہوگئے تھے، ان کو نئے سرے سے قائم کیا، چنانچہ وہ خود اپنی کتاب فتوحات فیروز شاہی میں لکھتا ہے،

ودیگر بقاع خیر بادشاہان ماضیہ راز مسجد وخانقاہ ومدرسہ وچاہ وحوض وپل ومقبرہ کہ مندرس شدہ بود بتجدید معمور ساختم واوقاف مقرر کردم[3]،

تاریخ فیروز شاہی میں اس کی تعلیمی فیاضیوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

وادرارات وانعامات ووظائف علماء ومشائخ ومدرسان ومفتیان ومذکران ومتعلمان وحافظان ومقریان وارباب مساجد وآستانہ داران وحیدریان وقلندران ومستحقان

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۲۹۲، ۲۹۳، [2] طبقات ناصری ص ۱۵۱، [3] فرشتہ جلد اول ص ۱۵۱،

و مسکینان دار الملک دہلی از ہزارہا، گذشت و بہ گلہا رسید و مدارس و مساجد قدیم و جدید کہ خالی و مندرس گشتہ بود از مدرسان و مذکران و متعلمان مشحون و مملو گشت و رونق علم و رواج تعلیم از سر پیدا آمد و بہ ہزار ادرار استادان و بہا انعام یافتند و مبجل و معظم شدند و آنان را کہ صدگان و دو بیستگان تنگہ ادرار بودہ است و آن ادرار مندرس گشتہ و آن دفاتر محو شدہ چہار صدگان و پانصدگان و ہفتصدگان و ہزارگان تنگہ ادرار تعین فرمود و طوائفے کہ از طالبان علم محتاج دہ تنگہ بودند صدگان و دو بیستگان و سیصدگان تنگہ ادرار معین گشت و علماء و متعلمان شہر از خرد و بزرگ با نعمت و ثروت شدند و از فقر و فاقہ و احتیاج و خواست خلاص یافتند و بیشترے از طوائف مذکور کہ نقش درست نداشتند از مراحم سلطان فیروز شاہی جامہائے لطیف مے پوشند و بر اسپان چیدہ سوار مے شوند و بیشتر در علوم دین و تعلیم احکام شرع مشغول مے باشند[1]

قدیم مدارس کی مرمت و اصلاح کے علاوہ اس نے خود ۳۰ مدرسے قائم کیے،[2] جن میں مدرسۂ فیروز شاہی کی تعریف و توصیف میں ضیاء برنی نے صفحے کے صفحے سیاہ کر دیے ہیں اس کی عبارت کا ابتدائی حصہ جس سے عمارت کا ایک اجمالی نقشہ سامنے آ جاتا ہے، حسب ذیل ہے،

بس بو العجب عمارتے بر سر حوض علائی بنا شدہ است و عمارت مدرسۂ مذکور از رفعت گنبدہا و شیرینی عمارتہا و ہوا و از زین صحنہا و لطافت نشست جاہائی و محلہائے مروح و صفہائے دلاویز گوئے لطافت از عمارتہائے کہ در عالم معروف ہست ربودہ است[3]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی جلد اول ص ۵۵۵ [2] فرشتہ جلد اول ص ۱۵۱، [3] تاریخ فیروز شاہی حصہ اول ۵۶۲،

قدیم زمانے میں تعلیم کا مفہوم صرف کتابی تعلیم تک محدود تھا، اور یہ تعلیم بھی زیادہ تر دینی، ادبی اور عقلی فنون تک محدود تھی، لیکن اس زمانے میں تعلیم کا مفہوم نہایت وسیع ہوگیا ہے، اور کتابی تعلیم کے علاوہ ہر ہنر، اور ہر پیشہ کی تعلیم، نظام تعلیم کا جزء ہوگئی ہے، فرمانروایانِ ہند میں فیروز شاہ پہلا شخص ہے، جس نے تعلیم کے مفہوم میں وسعت پیدا کی اور صنعت و حرفت کی تعلیم کا ایک مستقل نظام قائم کیا، اس کی تقریب یہ ہوئی کہ اس کے دل میں غلامون کے جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور تمام حکام اور عہدہ داران سرکاری کو تاکیدی حکم ہوا کہ منتخب غلام دربار میں بھیجے جائیں، حکام اور عہدہ دارون نے بادشاہ کا یہ شوق دیکھا تو نہایت عمدہ وضع و لباس میں خوبصورت اور اصیل غلامون کو دربار میں پیش کیا، اور اس طرح ایک لاکھ اسی ہزار غلام جمع ہوگئے، اور فیروز شاہ نے مختلف شہرون مثلاً دیپالپور، حصار فیروزہ، سامانہ اور گجرات مین ان کے قیام کا انتظام کیا، اور ان کی معاش کے لئے جاگیرین مقرر کین ان کے علاوہ جو غلام شہر میں تھے، ان کی مختلف تنخواہیں مقرر ہوئیں کسی کو سو تنکہ کسی کو پچاس تنکہ، اور کسی کو چالیس تنکہ ملتا تھا، اور دس تنکہ سے تو کسی کی تنخواہ کم نہ تھی، اطمینان کی یہ صورت پیدا ہوئی تو ان میں بعض نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا، بعض نے دینی علوم کی طرف توجہ کی، اور بعض نے تحریر و کتابت کا مشغلہ اختیار کیا، اور بعض نے صنعت و حرفت سیکھ لی، اور مختلف پیشون کے ۱۲ ہزار غلام تیار ہوگئے، رفتہ رفتہ ان کا ایک مستقل محکمہ قائم ہوگیا، اور یہ لوگ تمام شاہی کاروبار میں دخیل ہوگئے، یہی لوگ آبدار، شربدار، جامدار، عطردار، طشت دار، چتر دار، شمعدار، پردہ دار، جاندار، سلاحدار، شکرہ دار، سیہ گوش دار، خاصدار، دار و دار، سنگتراش، سقا اور پیلبان ہوتے تھے، کتب خانہ میں قرآن خوانی کرتے تھے،

علم خانہ اور گھڑیال خانہ کی خدمات ان سے متعلق تھین، اور بعض محکمون میں محرری کی خدمت انجام دیتے تھے،

اس کے علاوہ فیروز شاہ نے ان کو بہت سے امراء و سلاطین پر تقسیم کر دیا کہ ان کو خدمتگذاری کے آداب سکھائیں، اس شاہی حکم کے بموجب یہ لوگ نہایت عمدہ طریقہ پر ان کی پرورش کرکے ہر سال ان کو دربار مین بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے، تاکہ انھون نے خدمتگذاری کا جو سلیقہ اور جو مختلف ہنر سیکھے ہیں، بادشاہ کی نظر سے گذر جائیں، چنانچہ تاریخ فیروز شاہی میں ہے،

"چون ہندگان مقطعان پیش می گذرانیدند، بعضے بندگان بر حکم فرمان سلطان تسلیم بعضے امراء و ملوک میشدند تا ایشان را ادب خدمت آموزند، امراء و ملوک آن بندگان را بطریق فرزندان میپروردند و طعام و جامہ و سر جامہ و ہنر آموختن و مقام خوردن و خفتن و نشستن و غمخوارگی ایشان بواجبی نگاہ میداشتند و ہر سالے ایشان را پیش تخت می گذرانیدند و ادب و خدمت و ہنر ہاے ایشان را پیش تخت عرضہ میداشتند، سلطان فیروز شاہ در باب آن امراء و ملوک چندان مرحمت می فرمودند کہ در تحریر نیاید[1]"

فیروز شاہ کے بعد سلطان محمود بہمنی نے گلبرگہ، بیدر، قندھار، ایلچپور، دولت آباد، جنیر، چیول، دابل اور دوسرے بڑے بڑے شہرون اور قصبون میں یتیم بچون کی تعلیم کے لیے معلم مقرر کیے اور بڑے بڑے شہرون میں محدثین کو وظائف دیئے[2]

نوین صدی ہجری میں سلطان محمود خلجی نے جو شوال ۸۳۹ھ میں مالوہ کے

[1] تاریخ فیروز شاہی حصہ اول از ص ۲۷۰ تا ص ۲۷۳ [2] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۱۲،

تخت سلطنت پر بیٹھا، تعلیم کو بہت زیادہ ترقی دی اور بہت سے مدرسے قائم کئے، اور علماء وطلبہ کے وظائف مقرر کئے، چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے،

چون سلطنت بروقرار گرفت ہمت بر تربیت علماء وفضلا گماشتہ ہر جا از ارباب کمال کسے را شنید زر فرستادہ او را طلب میمود و در ولایت خود مدرسہ ساختہ علماء وفضلاء وطلاب را وظیفہا مقرر کردہ بافادہ واستفادہ مشغول گردانید وبالجملہ بلاد مالوہ من جمیع الوجوہ در ایام دولت او محسود شیراز وسمرقند بود[1]،

مآثر رحیمی میں ہے،

وبجانب چتور نہضت نمودند واز آب بہم عبور نمودہ بتخا تھاے، آں ولایت راخراب نمودہ مساجد ومدارس ساخت[2]،

اس نے ذیحجہ ۸۴۷ھ میں شادی آباد میں ایک مدرسہ اور مسجد جامع ہوشنگ شاہی کے محاذی منارہ ہفت منظر قائم کیا[3]،

اسی صدی میں سلطان محمود بیگڑہ نے جو ۸۶۳ھ میں گجرات کے تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، تعلیم کو بہت زیادہ ترقی دی اور بہت سے مدارس قائم کئے، چنانچہ مرات احمدی میں ہے،

ومدارس بہشت آئین ومساجد مانند خلد برین ساخت[4]،

اسی صدی میں جام نظام الدین نے جو ۸۶۶ھ میں سندھ کے تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، علماء وفضلاء کی جمعیت خاطر اور ان کی فارغ البالی کے سامان مہیا کئے، اور اس

---

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۲۴۳ [2] مآثر رحیمی جلد اوّل ص ۱۳۲ [3] مآثر رحیمی جلد اوّل ص ۱۳۳ [4] مرات احمدی اول ص ۶۰،

کثرت سے مدارس قائم کئے گئے کہ احاطۂ بیان میں نہیں آسکتا، آثر رحیمی میں ہے،

دور زمان دولت او علما وصلحا وفقرا در نہایت فراغت بودند، دور زمان دولت او احیاے سنن ورواج مدارس بنوعے درسند مقرر بود کہ زبان قلم از تحریر آن عاجز است[1]

اس کی علم پروری کی شہرت سنکر مولانا جلال الدین دوانی نے شیراز سے آنے کا ارادہ کیا، اور اپنے دو ممتاز شاگرد میر شمس اور میر معین کو ٹھٹھ میں بھیجا اور جام نظام الدین سے درخواست کی کہ ٹھٹھ میں ان کے قیام کا انتظام کیا جائے، جام نے عمدہ قیام گاہ کا انتظام کیا، اور مصارف سفر کے ساتھ قاصد روانہ کئے کہ مولانا کو جاکر لے آئیں، لیکن خرچ راہ اور قاصدوں کے پہونچنے تک مولانا سفر آخرت اختیار کر چکے تھے[2] اس لئے ہندوستان ان کے علمی فیوض و برکات سے مستفیض نہ ہوسکا،

اسی صدی میں سلطان سکندر لودی نے جو ۸۹۴ھ میں تخت نشین ہوا تھا، نہایت کثرت سے مدارس قائم کئے، اور ان کے مدرسین کے وظائف مقرر کیے، چنانچہ سیر المتاخرین میں ہے،

د مساجد و مدارس تعمیر نمود، و در مساجد و مدارس امام و موذن و خطیب و مدرس مقرر کردہ وظائف انجماعہ از سرکار مرحمت کرد سے[3]

اس کے عہد حکومت میں نظام تعلیم میں دو عظیم الشان انقلاب پیدا ہوئے،

(۱) ایک تو یہ کہ اس کے عہد حکومت سے پہلے ہندوستان میں معقولات کا رواج بہت

---

[1] آثر رحیمی جلد دوم ص ۳، ۲ [2] آثر رحیمی جلد دوم ص ۴، ۲ [3] سیر المتاخرین جلد اول ص ۱۴۰،

کم تھا، لیکن ملتان کی تباہی کے بعد اس کے زمانہ میں ملتان سے دو عالم یعنی شیخ عبداللہ تلبنی اور شیخ عزیزاللہ تلبنی ہندوستان میں آئے، اور شیخ عبداللہ تلبنی نے دہلی میں اور شیخ عزیزاللہ تلبنی نے سنبل میں قیام کیا اور ان اطراف میں علم معقول کو رواج دیا، چنانچہ خافی خان لکھتا ہے،

واز جملہ علمائے کبار در زمان سلطان سکندر شیخ عبداللہ طلبنی در دہلی و شیخ عزیزاللہ طلبنی در سنبل بودند و این ہر دو عزیز ہنگام خرابی ملتان ہندوستان آمدہ علم معقول را دران دیار رواج دادند و قبل ازین بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نہ بود،

ان دونوں بزرگوں کے فیض تربیت سے بہت بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، جنھوں نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی خدمت انجام دی، خود سلطان سکندر کو درس و تدریس سے اسقدر دلچسپی تھی کہ جب شیخ عبداللہ تلبنی درس دیتے تھے، تو وہ خود آکر اس خیال سے ایک گوشے میں چھپ کر بیٹھ جاتا تھا کہ طلبہ کے درس میں خلل نہ واقع ہو، لیکن جب وہ درس سے فارغ ہو جاتے تھے، تو سلام علیکم کہکر ان کے پاس بیٹھ جاتا تھا، اور باہم صحبت رہتی تھی[1]

(۲) دوسرے یہ کہ اب تک ہندوستان میں فارسی زبان کی تعلیم کا رواج نہیں تھا، لیکن اس کے زمانے سے ہندوستان میں بھی فارسی زبان کی تعلیم کا رواج ہوا، چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے،

وبعہد فرخندہ او علم رواج یافت و امرا و ارکان دولت و سپاہیان بکسب فضائل

---

[1] خافی خان حصہ اول ص ۳۲۳ - ۳۲۴

اشتغال نمودند و کافران بخواندن و نوشتن خط فارسی که تا آن زمان در میان ایشان معمول نبود دیرہ واختند[1]

اور انھون نے اس زبان میں اسقدر ترقی کر لی کہ شعر کہنے اور درس دینے لگے، چنانچہ خافی خان ایک موقع پر لکھتا ہے

دیگے از شعراے عہد سلطان سکندر برہمن بودی گویند کہ باوجود کفر کتب علم رسمی را درس میگفت[2]

ان بادشاہون کے بعد سلاطین تیموریہ میں اکبر کا دور حکومت شروع ہوا، جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سے تعلیمی تغیرات وانقلابات پیدا ہوئے، چنانچہ سب سے بڑا تغیر ابتدائی تعلیم میں یہ ہوا کہ مدت تعلیم گھٹ گئی، اور جو کام برسون میں ہوتا تھا، وہ مہینون میں ہونے لگا، اس کے ساتھ نصاب تعلیم میں وسعت پیدا ہوئی، اور اس میں بہت سے علوم کا اضافہ کیا گیا، یہان تک کہ ہندی علوم بھی نصاب درس میں داخل کئے گئے، چنانچہ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے،

در ہر کشور خاصہ درین آباد بوم سالہا نو آموز را بدبستان باز دارند و مفردات حروف معجم را بچندین گونہ اعراب آموزش رود، بیقرا وان نامۂ گرامی انفاس رایگان شود لبفرمودۂ گیتی خداوند حروف ابتث را بر نویسند و دیگر گون پیکر ایدان نگارند، نخست بصورت و نام آشنا گردند و دو روز بینش نکشد کہ از نقوش حروف پیوستہ آگھی برگیرد و چون ہفتہ بدین دریافت خوسندی یابد لختے نظم و نثر آشنا رود ور نیایش ایزدی واندرزگزاری جد انگاشتہ در آموزند و کوشش رود کہ ہریک را خود بشناسد واندکے اوستاد دستگیری کند و چندے ہر روز

---

[1] فرشتہ حصہ اول ص ۱۸۷، [2] خافی خان حصہ اول ص ۳۲۳

یک مصرع با یک بیت بانجام رساند، در کمتر زمانے سواد خوانی روشنی پذیرد، دآموزگار هر روز از پنج چیز آگهی برجوید، شناسائی حروف' الفاظ' مصرع' بیت پیشین خوانده بدین روش انچه بسالها آموختے بماه بل بروز کشید وجهانے بشگفت درآمد، اخلاق، حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، هندسہ' نجوم، رمل، تدبیر منزل سیاست مدن، طب، منطق، طبیعی، ریاضی، الٰہی، تاریخ، مرتبہ مرتبہ اندوزد، داز ہندی علوم بیاکرن نیائے بیدانت پاتنجل برخواند و ہرکس را از بایست دقت درنگذرانند،

طریقہ تعلیم کے اس تقریری تفصیل کے بعد ابوالفضل لکھتا ہے۔

ازین طرز آگہی مکتبا رونقے دیگر گرفت و مدرسہا فروغ تازہ یافت[۵]،

اکبر کے زمانے تک ہندوستان میں جو تعلیم جاری تھی وہ زیادہ تر مذہبی حیثیت رکھتی تھی، سکندر لودی کے زمانے میں اگرچہ معقولات کا رواج ہو چکا تھا، تاہم عقائد وخیالات پر انکا کوئی اثر نہیں پڑا تھا، اور مذہبی علوم کی عظمت باقی تھی، لیکن اکبر نے دین الٰہی کے نام سے جب ایک جدید مذہب کی بنیاد ڈالی، اور اس سلسلے میں تمام مذاہب کی تحقیقات کے لیے ہر مذہب و ملت کے علماء کو دربار میں جمع کیا، اور ان میں باہم مذہبی مناظرے ہوئے، تو بے تعصبی کے ساتھ سخت عقلی آزادی پیدا ہو گئی، اور اس کا نتیجہ صاحب مآثر الامرا کے الفاظ میں یہ ہوا کہ

علوم شرعیہ ونقلیہ را اعلا وقع و اعتبارے نماند. مردم رغبتے بحکمت وحساب وطب ونجوم وشعر و تاریخ نمودند[۶]،

---

[۵] آئین اکبری جلد اول ص ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴۔ [۶] مآثر الامرا جلد دوم ص ۳۸۶۔

اسکے ساتھ اسی زمانے میں معقولات کی ترویج و اشاعت کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ ۹۹۱ھ میں امیر فتح اللہ شیرازی جو حکمت علمی و نظری میں یکتائے روزگار تھے، امرائے اکبری میں داخل ہوئے، اور انھوں نے متاخرین علمائے معقول ایران کی کتابیں درس میں داخل کیں، چنانچہ مولوی غلام علی آزاد مآثر الکرام میں لکھتے ہیں،

تصانیف علماء متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور، و میرزا جان بہندوستان آوردو در حلقۂ درس انداخت و جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند، و از ان عہد معقولات را رواجے دیگر پیدا شد[1]

لیکن باانیہمہ آزادخیالی اکبری دور میں علوم شرعیہ کی تعلیم کا رواج بالکل جا نہیں رہا، جو امرائے اکبری میں قلیچ خان کی نسبت صاحب مآثر الامرا لکھتے ہیں،

قلیچ خان صلاح و تقوی بسیار داشت و در تسنن متعصب بود و ہمیشہ بدرس علوم و افادہ طلاب اشتغال مے نمود، گویند در صوبہ داری لاہور یکپاس بدرس فقہ و تفسیر و حدیث در مدرسہ قیام مے ورزید و باقصی غایت در ترویج علوم شرعیہ میکوشید مردم آنجا امید ردشناسی و انجاح مطالب غلوے تام بتحصیل علم کردند[2]،

اکبر کے دور حکومت میں سب سے بڑا انقلاب کشمیر کی تعلیمی حالت میں ہوا، چنانچہ اس انقلاب سے کشمیر میں جو تعلیمی ترقیاں ہوئیں، ان کے متعلق بادشاہ نامہ کا مصنف لکھتا ہے،

در اگرچہ دران چندے کہ اکثر علوم متعارفہ درس گویند بودند،

---

[1] مآثر الکرام جلد اوّل ص ۲۳۸ [2] مآثر الامرا حصہ سوم ص ۷۱،۲

"علوم متداولہ شیوع تمام نداشت، برخے خط نستعلیق نیکوے نوشتند و بندے زبان شعر وا شتند بعد از انکو در عہد دولت حضرت عرش آشیانی کشائش یافت اکثر ساکنان ش الکتاب مراسم اہلیت و دوازم آدمیت نمودہ شائستگی جوہر ظاہر ساختند و فارسی گفتن و خط خوش نوشتن و نغمۂ فارسی سرائیدن رواج تمام یافت[۲]"

اسی زمانے میں عادل شاہ نے بیجاپور میں مذہبی تعلیم کو بیحد ترقی دی اور اپنی سلطنت کے بوضوابط و آئیں مقرر کیے اس میں دینی تعلیم کے متعلق یہ قاعدہ مقرر کیا،

"در آثار شریف دو مدرس تعیین نمودہ درس احادیث و فقہ و علم ایمان بر یاد آرند شاگردان را از سفرۂ آثار آرش و نان بوقت صبح بریانی و مزعفر و بوقت شام نان گندم و کھچڑی فی اسم بایک ہون و بدون این کتاب ہائے عربی و فارسی امداد نمایند و ہر سال امتحان میشد و انعام ہون سرفرازے فرمودند و در مسجد جامع دو ملا مکتب دار اطفال و دو مکتب تحصیل علم عربی و یک مکتب علم فارسی مقرر داشتہ ہر آنکس کہ از شاگردان متوکل و محتاج باشند از نان و آش بوقت صبح فی اسم دو نان گندم و کھچڑی، و بوقت شام بریانی و مزعفر و شیرنی میخورانند و فی اسم یک ہون ماہوار کتاب ہا سرفرازی فرمودند وہم بوقت امتحان بتاریخ سلخ ذیحجہ میشد انعام از قسم ہون میدادند و کسیکہ دران ہوشیار از علم میشد بعہدہ و عمدہ بہتر نوکر و ملازم میداشتند و در اجرائے مکتب ہا در کارنگ بجد تر گشتہ نگہدار ندہ[۳]"

---

[۲] بادشاہ نامہ حصہ دوم ص ۵۵، [۳] بساتین السلاطین ص ۳۵۱،

اکبر کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا، تو اس نے رفاہ عامہ کے کاموں کا ایک خاص نظام قائم کیا، اور حکم دیا کہ،

ہر جا کہ مسافر تاجر و مقیم الدار فوت شود و وارث او حاضر نباشد مال او را امانت نگاہ دارند و در صورت مفقود الاثر بودن وارث مال ترکہ میت را،

صرف تعمیر و احداث مساجد و پل و مدرسہ و سرائے نمایند[1]

اور یہ ظاہر ہے کہ اس حکم کے بعد ہندوستان میں کس کثرت سے مدرسے قائم ہوئے ہونگے۔ جہانگیر کے بعد شاہ جہان کا دور حکومت آیا تو اس نے نومسلمون کی تعلیم کا ایک مستقل نظام قائم کیا، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے زمانے میں بعض جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ کا رواج ہوگیا تھا، اور مسلمان بے تکلف ہندوؤں کو اپنی لڑکیاں دیتے تھے، ان سے لڑکیاں لیتے تھے، شاہجہان کو اس کی اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ جس ہندو کے گھر میں مسلمان لڑکی ہو اگر وہ اسلام قبول کرے تو اس کے ساتھ دوبارہ اس کا نکاح کر دیا جائے، لیکن اگر وہ اسلام قبول نہ کرے، تو مسلمان عورت اس سے علحدہ کر دی جائے، اس حکم کے بعد جوکھو نامی زمیندار جس نے اس رسم قبیح کے جاری کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا اپنے پورے خاندان کے ساتھ مسلمان ہوگیا، اور اس کے علاوہ بہت سے اور ہندو مسلمان ہوئے، چونکہ مسلمانوں میں یہ رسم جہالت کی وجہ سے پھیلی تھی، اور نومسلمون کو عبادت وغیرہ کا طریقہ معلوم نہ تھا، اس لئے سرکاری طور پر قاضی اور معلم مقرر کئے گئے تاکہ اس قسم کے لوگوں کو احکام شریعت اور طریقہ عبادت کی تعلیم دیں[2]، تیموری دور حکومت میں چونکہ مختلف ممالک کے

---

[1] خافی خاں حصہ اول ص ۲۴۹، [2] بادشاہ نامہ دوم ص ۵۷،

لوگ ہندوستان میں آکر مقیم ہو گئے تھے، بالخصوص اس قسم کے مختلف العناصر لوگ فوج میں زیادہ تر شامل تھے، اس لئے ہندوستان پر ان کے مختلف کمالات کا اثر خاص طور پر پڑا، چنانچہ شاہجہانی عہد میں کشمیر پر ان لوگوں کا جو اثر پڑا اس کے متعلق عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں لکھتا ہے،

"واز آنجا کہ درعسکر اقبال فضلاء وہنرمندان ہفت اقلیم فراہم آمدہ کامیاب سالنان این زمین نشاط آگین از مصاحبت وہمزبانی اہل اردو فضائل وہنرہا کسب نمودند[1]"

عبدالحمید لاہوری نے اگرچہ شاہجہان کے عہد حکومت کی تخصیص کی ہے، اور اس اثر کو کشمیر تک محدود کر دیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے، کہ تیموریون کے ہر دور میں یہ اثر پڑا اور ہندوستان کے گوشے گوشے پر پڑا،

شاہجہان کے بعد عالمگیر نے تعلیم کو بہت زیادہ ترقی دی اور علماء و طلباء کے وظیفے اور جاگیریں مقرر کرکے ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر قصبہ کو تعلیم سے معمور کر دیا، چنانچہ عالمگیر نامہ میں ہے،

واز انجاکہ توجہ خاطر دانش مآثر ترویج مراتب فضل وتاسیس معالم علم درجہ قصوی دارد ودر جمیع بلاد وقصبات این کشور وسیع فضلا ومدرسان را بوظائف لائقہ از روزیانہ واملاک موظف ساختہ بشغل تدریس وتعلیم محصلان علوم گماشتہ اند وبراے طلبہ علم در ہر معمورے وناحیہ وجوہ معیشت درخور رتبہ وحالت واستعداد مقرر داشتہ وہر سالہ بدین وجہ نیز از خزائن

---

[1] بادشاہ نامہ حصہ دوم ص ۵۷،

احسان پادشاہانہ مبلغہاے معتدبہ صرف میشود وازفیض مکرمت وافضال
شہنشاہ ابرکف دریانوال طالبان علم وکمال سمت افزونی پذیرفتہ
منشرح البال ومرفہ الحال بکسب وتحصیل علوم اشتغال مے ورزند[۱]

مراۃ احمدی میں ہے،

چون حکم مقدس معلی در جمیع صوبجات ممالک محروسہ شرف نفاذ یافت کہ در
ہرصوبہ مدرس تعیین نمانید وطلبۂ علم از میزان تاکشاف خوان باستصواب صدر صوبہ
موافق تصدیق بمہر مدرسان وجہ علوفہ از تحویل خزانچی خزانہ آن صوبہ
میدادہ باشند درینولا سہ نفر مدرس در احمد آباد، وپٹن وسورت وچہل
وپنج نفر طلبہ علم اضافہ درصوبہ احمد آباد مقرر شد[۲]،

سرکاری مدارس کے علاوہ جو مدرسے دوسرے اہل خیر نے قائم کئے تھے.
ان کو بھی سرکاری امداد ملتی تھی، چنانچہ اسی کتاب میں ہے،

ویک ہزار وپانصد وہشتاد روپیہ بموجب برآورد بنابر ترمیم مدرسہ مسجد و
حمام ودارالشفاسے بنا کردہ سیف خان تنخواہ گردید[۳]

وہمدران سال مدرسہ ہدایت بخش ومسجد بنا نمودہ شیخ محمد اکرم الدین صدر کہ بمبلغ یک لک وبیست
وچہار ہزار روپیہ صرف عمارت آن تمام پذیرفت وبموجب التماس صدر
بنابر اخراجات مدرس وطلبہ موضع سوندرہ معولہ پرگنہ سانولی وموضع
سیہپہ عملہ پرگنہ کڑی دو دروپیہ یومیہ حسب لنگر از جناب اقدس
مرحمت گشت[۴]

---

[۱] عالمگیرنامہ ص ۱۰۸۵، ۱۰۸۶۔ [۲] مرات احمدی ج ۱ ص ۲۶۲، [۳] مرات احمدی ج اول ص ۳۰۹، [۴] مرات احمدی ج اول ص ۳۰۳

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ سلاطینِ اسلام نے اطراف ہند میں بکثرت مدارس قائم کئے تھے، لیکن یہ پتہ لگانا سخت مشکل ہے، کہ یہ مدارس کن کن شہرون اور کن کن قصبون میں قائم تھے؟ البتہ ہمارے دوست مولوی ابو الحسنات مرحوم نے خاص خاص شہرون اور خاص خاص قصبون کے چند مدارس کا پتہ لگایا ہے، اور اس پر معارف میں ایک سلسلہ مضمون لکھا ہے، چنانچہ اس مضمون کا خلاصہ حسب ذیل ہے،

مدارس اجمیر | ۵۸۷ھ میں شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر کو فتح کیا، اور وہان متعدد مدرسے قائم کئے،

مدارس دہلی | قطب الدین ایبک کا جانشین شمس الدین التمش ۶۰۷ھ میں تخت نشین ہوا، اور خاص دار السلطنت دہلی میں متعدد مدارس قائم کئے، غالبًا مدرسۂ معزی اسی علم پرور بادشاہ کے عہد حکومت کی یادگار ہے، اس عہد کے بعد دلی میں ایک مدرسہ قائم ہوا جس کا نام مدرسۂ ناصریہ تھا، اور وہ ناصر الدنیا والدین شہزادہ محمود بن سلطان شمس الدین التمش کے نام پر قائم کیا گیا تھا،

دلی میں ایک اور مدرسہ علاء الدین خلجی کے مقبرے میں مسجد قوۃ الاسلام اور قطب صاحب کی لاٹ کے متصل واقع تھا، ۷۱۵ھ میں علاء الدین خلجی کا انتقال ہوا، اور اس کے بعد سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی نے غالبًا ۷۱۶ھ میں یہ مقبرہ بنوایا، مقبرہ، مدرسہ اور مسجد سب کی مرمت فیروز شاہ نے اپنے عہد حکومت میں کرائی اور صندل کے چھپر کھٹ چڑھائے، صحیح طور نہین کہا جا سکتا کہ یہ مدرسہ کب قائم ہوا اور کس نے قائم کیا؟ اگر قطب الدین مبارک شاہ نے مقبرہ، علائی کے ساتھ قائم کیا تو اس کا سنہ بنا ۷۱۶ھ ہوگا اور اگر مسجد قوۃ الاسلام کے

ساتھ اس کی بنیاد پڑی تو ۵۸۹ھ اس کی تاریخ بنا ہوگی، کیونکہ اسی سال قطب الدین ایبک نے اس مسجد کی بنیاد ڈالی تھی، پھر ۶۲۷ھ میں سلطان شمس الدین التمش نے بھی اس مسجد پر تین تین محرابوں کا اضافہ کیا، اور اصل لاٹ پر بھی پانچ درجے زیادہ کئے، ممکن ہے، مدرسہ کی بنیاد اسی سلسلۂ تعمیرات میں پڑی ہو،

دلی میں ایک اور مدرسہ حوض خاص مشہور مدرسہ تھا حوض دراصل سلطان خلجی کا بنوایا ہوا تھا جس کو اس نے اپنی تخت نشینی کے سال ۶۹۶ھ میں بنوایا تھا، فیروز شاہ کے زمانے میں یہ حوض مٹی سے بھر گیا تھا، فیروز شاہ نے اس کو صاف کرایا، جہاں جہاں مرمت کی ضرورت تھی مرمت کرائی، اور تقریباً ۷۵۵ھ میں اس کے اوپر ایک مدرسہ قائم کیا جس میں مشہور مدرسین جمع کئے گئے۔

مدرسہ فیروز شاہی دلی کا سب سے مشہور اور اپنے عہد کا بہترین مدرسہ تھا، جس کو فیروز شاہ نے ۷۵۳ھ میں فیروز آباد دلی میں قائم کیا تھا۔

مدرسہ بالا بند آب سیری دراصل ایک شاہی عمارت میں واقع تھا۔ ضیاء برنی لکھتا ہے۔ کہ مدرسۂ فیروز شاہی کی عمارت سے دہلی کی کوئی عمارت مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ یہی مدرسہ بالا بند آب سیری کی عمارت ہے، اس کے لئے کچھ وقف اور شاہی وظیفہ مقرر کر دیا گیا تھا، نیز بہت سے طلبہ کی کفالت کی جاتی تھی۔

ماہ صفر ۷۷۶ھ میں سلطان فیروز شاہ نے اپنے بیٹے شہزادہ فتح خان کی وفات پر اس کے مقبرہ کے ساتھ ساتھ بطور کار خیر و ایصال ثواب ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، جس کے اخراجات کا مدار شاہی وظائف پر تھا،

ہمایون کا عہد حکومت تقریباً ۹۳۵ھ سے شروع ہوا اور اس نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ایک مدرس شیخ حسین تھے، لوگون کو یہ عام طور پر معلوم نہیں کہ ہمایون کے مقبرے کے اوپر جو چھت تھی، وہ دراصل ایک مدرسہ تھا جس میں بڑے بڑے اساتذہ وقت تعلیم دیتے تھے، اور مقبرہ کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے کمرے طلبہ کی اقامت کے لئے بنے ہوے تھے،

عہد اکبری میں ماہم بیگم نے جو اکبر اعظم کی مرضعہ تھین، ۹۶۹ھ میں پرانے قلعہ کے پاس مغربی دروازے کے مقابل میں ایک مسجد اور مدرسہ بنوایا جس کا نام خیرالمنازل رکھا گیا،

شیخ عبدالحق محدث دہلوی جو جہانگیر کے عہد میں تھے، اخبارالاخیار میں ایک مدرسہ کا ذکر کرتے ہیں، جہان انھون نے تعلیم پائی تھی، اس مدرسہ میں تعلیم کا وقت صبح سے دوپہر تک اور ظہر کے بعد سے شام تک مقرر تھا، چنانچہ شیخ موصوف روزانہ اپنے گھر سے انہی اوقات میں مدرسہ جایا کرتے تھے،

مدرسۂ دارالبقا — دلی کی جامع مسجد ہی عہد شاہجہانی کی تنہا تعمیری یادگار نہیں بلکہ اس سلسلے میں رفاہ عام کی چند عمارتین بھی یادگار زمانہ تھین، جیسا کہ اسٹیفن نے لکھا ہے، مسجد کے شمالی رخ پر شاہی شفاخانہ قائم تھا، جہان غربا ومساکین کے لئے علاج کے تمام ساز و سامان مہیا کئے گئے تھے، اور مفت علاج کیا جاتا تھا، مسجد کے جنوبی رخ پر شاہی مدرسہ تھا جس کا نام دارالبقا تھا، اس مدرسہ کا سال بنا تخمیناً ۱۰۶۰ھ عہد شاہ جہانی ہے، یہ مدرسہ گردشِ روزگار کے ہاتھون ۱۸۵۷ء کے غدر سے بہت پہلے ویران ہوگیا،

بہادر شاہ کے عہد حکومت میں ایک نیا مدرسہ دلی میں قائم ہوا جس کے بانی امیر غازی الدین خان فیروز جنگ تھے، امیر غازی الدین خان نواب آصف جاہ بانی خاندان حیدرآباد دکن کے والد بزرگوار اور اورنگ زیب عالمگیر کے اُن محبوب و معتمد امرا میں تھے، جو دربار بہادر شاہی کے بھی معتمد رکن رہے۔ امیر غازی الدین نے یہ مدرسہ اجمیری دروازہ کے قریب قائم کیا تھا، اور مدرسہ کی عمارت کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔ اس مدرسہ کی شکستہ عمارت میں ابھی تک ایک خوبصورت دروازہ باقی ہے، جو ایسے مقام پر لے جاتا ہے جس کی ظاہری حالت بتاتی ہے کہ وہ مدرسہ کا مطبخ تھا،

نواب اعتماد الدولہ فضل علی خان لکھنوی نے اس مدرسہ کے خرچ کے واسطے ایک لاکھ ستر ہزار روپئے انگریزی کمپنی کو دئے تھے، چنانچہ کمپنی کی طرف سے مقبرہ کی دیوار پر ان کے نام کا ایک کتبہ لگایا گیا، جس کی عبارت یہ ہے:

کتبہ مقبرہ غازی الدین خان	"نہ بر لوح نقشے بماند و لیک خبر اے عمل ماند و نام نیک

"بیاد حسنات نواب اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خان بہادر سہراب جنگ کہ یک لک و ہفتاد ہزار روپیہ برائے ترقی علوم در مدرسہ ہذا واقع دہلی خاص مولد و وطن خویش بصاحبان کمپنی انگریز بہادر تفویض نمودہ اند منقوش گردیدہ ۱۸۲۹ء"

محمد شاہ کے عہد حکومت میں نواب شرف الدولہ ارادت خان نے ایک مدرسہ اور اس کے ساتھ ایک مسجد بنوائی۔ اس مدرسہ کا سالِ بنا ۱۱۳۵ھ ہے، مسجد پر یہ

کتبہ لگا ہوا ہے،

در زمانِ شہ خورشید سریر	ظل حق ماہ زمین شاہ زمان
ناصر الدین محمد شاہ است	تیغ او کفر شکن در دوران
شرف الدولہ بنا فرمودہ است	مسجد و مدرسۂ عالی شان
این دو بیت الشرفِ علم و عمل	ہمچو سعدین فلک کردہ قران
سال تاریخ بنا گفت خرد	قبلۂ حج ازادت کیشان

مدرسہ شاہ عبدالرحیم دلی کا سب سے آخر الذکر لیکن کثیر المنافع مدرسہ شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی کا ہے، یہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے پدر بزرگوار اور فتاوای عالمگیری کے جامعین میں تھے، یہی مدرسہ تھا جس کے آغوش میں شاہ ولی اللہ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی، شاہ اسمٰعیل، شاہ اسحاق، شاہ عبدالقادر وغیرہ علماے کرام پل کر جوان ہوے، اور آخر باری باری سے اس کے مسند درس پر متمکن ہوے، یہی وہ سرچشمۂ فیض ہے، جہاں سے حدیث نبوی کے برکات تمام گوشہاے ہند میں پھیلے، اس مدرسہ کی مٹی ہوئی یادگار اب تک دلی میں باقی ہے،

مدارس پنجاب پنجاب کا اسلامی پایہ تخت لاہور تھا، اس شہر نے اسلامی عہد حکومت میں بہت کچھ ترقیاں کیں، پونے دو سو برس تک غزنویہ خاندان کے حکمرانوں کا تخت گاہ رہا، علماء و فضلاء کا مرجع و مرکز تھا لیکن افسوس ہے کہ تصریح کے ساتھ اس شہر میں متعدد مدارس کے نام نہیں ملتے، البتہ لاہور میں وزیر خان کی مسجد مدرسہ کا بھی کام دیتی تھی، اس کے نیچے اور گرد و پیش جو دکانیں تھیں

اون سے بانی کا مقصد یہ تھا، کہ ان کی آمدنی سے دو عالم مقرر کئے جائیں تاکہ سلسلۂ تعلیم بغیر کسی مالی دقت کے جاری رہے،

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں سیالکوٹ کی علمی شان و شکوہ کا پتہ چلتا ہے، اس شہر نے اس عہد میں علمی مرکزیت حاصل کر لی تھی، یہاں بڑے بڑے مشاہیر علما تھے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جن سے ہمارے عربی مدارس کا بچہ بچہ واقف ہے ان کے صاحبزادے ملا عبداللہ اپنے والد ماجد کی جگہ پر اس شہر کے مدرسہ میں قائم مقام ہوئے،

سیالکوٹ کی علمی مرکزیت کا نشان عہد اکبری کے بعد سے ملتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہاں علم و فضل کا چرچا بہت پہلے سے تھا،

مدرسۂ درگاہ شیخ چلی

تھانیسر علاقہ پنجاب میں درگاہ شیخ چلی کے قریب ایک مدرسہ تھا، جو مدرسۂ شیخ چلی کے نام سے مشہور بھی تھا، مدرسہ کی عمارت ایک سو جو ہتر فیٹ مربع تھی، اس کے ہر طرف نو نو در اور جانب مشرق دروازہ مع سیڑھیوں کے بنا ہوا تھا، اس کے دروازے ہندوانہ وضع کے تھے، جب سکھوں نے زور پکڑا اور درگاہ شیخ چلی کو مندر بنایا، تو اس عمارت میں، گرنتھ رکھا گیا، اب یہ عمارت شکستہ حال اور مرمت طلب ہے، آثار یات ہند کے بیان سے منکشف ہوتا ہے، کہ اس مدرسہ کو سنہ ۱۰۶۵ھ میں دارا شکوہ نے تعمیر کرایا تھا،

مدرسہ نارنول

شیر شاہ نے ایک مدرسہ نارنول میں قائم کیا تھا، مدرسہ کی عمارت بہت بڑی اور شاندار تھی شیر شاہ کے دادا ابراہیم سور کی قبر یہیں واقع ہے، ایک کتبہ جو مدرسہ کی عمارت پر اب تک لگا ہوا ہے، اس سے تاریخ تعمیر سنہ ۹۶۷ھ ظاہر ہوتی ہے مدرسہ و مقبرہ کے تعمیری مصارف ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ تھے،

یہ مدرسہ شیرشاہ نے اپنے عہد حکومت سے پہلے دادا کے انتقال کے موقع پر بطور کار خیر کے بنوایا تھا،

مدارس آگرہ اس شہر نے اسلامی عہد حکومت میں مختلف حیثیتون سے ایسی ترقیان حاصل کین، جو کسی دوسرے شہر کو نصیب نہین ہوئین، تعلیمی حیثیت سے ایک مدت تک فخر روزگار رہا، آگرہ میں متعدد مدارس قائم تھے، یہان کی تعلیم گاہون کے لئے علماء شیراز سے بلائے جاتے تھے، لالہ سیل چند جو غدر ۵۷ء کے پس وپیش زمانہ میں موجود تھے، اپنی کتاب تفریح العمارات میں لکھتے ہیں، کہ ان کے زمانہ تک آگرہ میں ایک بہت بڑا مدرسہ موجود تھا جس کی پروفیسری کے لئے شیراز سے ایک عالم بلائے گئے تھے۔

شیخ زین الدین خوافی نے جو نظم ونثر کے ماہر تھے، آگرہ میں اپنا ذاتی مدرسہ قائم کیا تھا جس کے مصارف کا تعلق بالکل ان کی ذات سے تھا، ۹۴۱ھ مطابق ۱۵۳۴ء میں جب جنار کے قریب ان کا انتقال ہوا، تو وہ اسی مدرسہ کے صحن میں دفن کئے گئے جو ان کا قائم کیا ہوا تھا، آگرہ نے اکبری عہد حکومت میں جو عروج وترقی حاصل کی تھی، وہ جہانگیر کے زمانہ تک باقی رہی، وہ خود اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ

آگرہ کی آبادی صناعون اور طلباء علوم سے بھری ہوئی ہے، ہر مذہب و ملت کے علماء اس شہر میں آباد ہیں۔

جام جہان کا مصنف لکھتا ہے، کہ جہانگیر نے تخت نشینی کے بعد قدیم مدارس کو جو کچھ مدت سے پرندون اور جانورون کے مسکن بنے ہوئے تھے، طالب علمون

اور اوستادون سے بھر دیا،

ایک مدرسہ آگرہ کے مقابل جمنا کے کنارے قائم ہوا تھا، بانی اور سنہ بنا کی تفصیل نہیں ملتی،

مدرسہ خس | مولانا علاء الدین لاری جنھون نے شرح عقائد نسفی پر حواشی لکھے ہیں، آگرہ میں درس دیا کرتے تھے، جو مدرسہ انھون نے قائم کیا تھا، وہ مدرسہ خس کے نام سے مشہور رہا، اور یہی اس کا تاریخی نام تھا، ملا بدایونی لکھتے ہیں،

بآگرہ آمدہ اشتغال بدرس علوم نمود و مدرسہ از خس ساخت و مدرسہ خس تاریخ آن یافتند،

مدرسۂ بیانہ | منجملہ دیگر مدارس کے بیانہ کا ایک مدرسہ قابل ذکر ہے، جس کو مولوی قاضی رفیع الدین صاحب نے قاضیون کی مسجد کے متصل قائم کیا تھا، مدرسہ کی عمارت پر جو کتبہ ہے، اس سے مدرسہ کا سال بنا ۱۰۱۱ھ معلوم ہوتا ہے،

مدارس فتح پور سیکری | اکبر نے فتح پور سیکری میں پہاڑی کے اوپر ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا تھا، لالہ سیل چند اپنی کتاب تفریح العمارات میں لکھتے ہیں،

اکبر نے اجمیر سے واپس آکر فتحپور سیکری کو اپنا دار السلطنت بنایا، یہان بہت سی عمارتین بنوائیں، جن میں مدرسہ و خانقاہ وغیرہ بھی داخل ہیں،

آئین اکبری میں لکھا ہے،

"بفرمان گیہان خداوند مسجدے و مدرسۂ و خانقاہے، بر فراز آن کوہ انجام یافت جہان دیدگان بدان نمط نشان کم دہند،

ان کے علاوہ فتحپور سیکری میں اور مدارس کے نام بھی مل سکتے ہیں، لیکن اُن کے

تفصیلی حالات نہیں ملتے،

مدارس متھرا و نروار سکندر لودی نہایت پابند شریعت اور علم دوست بادشاہ تھا، تاریخ داؤدی اور جام جہان سے معلوم ہوتا ہے، کہ متھرا میں اس نے متعدد مدرسے قائم کئے، گو ان مدارس کی تفصیلی حالت نہیں معلوم لیکن قاسم فرشتہ ان الفاظ میں ان کا مجمل تذکرہ کرتا ہے،

در ہر جا کہ ہندوان غسل میکردند سرائے و مسجد و مدرسہ و بازار ساختہ موکلان گماشتہ اند،

سکندر لودی نے جب ۹۱۴ھ میں علاقہ مالوہ کے قلعہ نروار کی تسخیر کا ارادہ کیا، اور پورے آٹھ مہینے کی مسلسل کوششوں کے بعد فتحیاب ہوا، تو چھ مہینہ تک وہان اقامت گزین ہوکر مساجد و مدارس کی بنا و تاسیس میں مشغول رہا، فرشتہ لکھتا ہے،

وسلطان شش ماہ در پائے قلعہ نشستہ بتخانہا را بر انداخت و مساجد بنا نمودہ مفتی و خطیب تعیین فرمودہ علماء و طلبہ را وظائف مقرر ساختہ دران جا متوطن گردانید،

مدارس بدایون قدیم زمانہ سے یہ شہر ہیجان امراء اور شاہزادوں کا مستقر رہا ہے، اسکی علمی و تعلیمی تاریخ دہلی و آگرہ کی طرح روشن ہے لیکن آج اسکی تاریخی تفصیلات مجہول ہیں، پھر بھی وہان ہمیشہ علماء و فضلاء کی جمعیت اور طلبہ کا ہجوم اس کی گذشتہ عظمت کی ہلکی سی یادگار ہے، تاریخ شاہ عالم میں جس کو مسٹر فرنکلین نے شائع کیا ہے لکھا ہے کہ

بدایون کی قدیم عمارتوں کے ویران و منہدم حصے جو ابتک باقی ہیں وہ محل باغوں، مسجدوں، خانقاہوں، اور قدیم مدرسوں کے آثار باقیہ ہیں، (صفحہ ۵۷)

مدرسہ معزی بدایون کی جامع مسجد ۶۲۰ھ میں شمس الدین التمش کے عہد امارت میں بنی،

اس کے عقب میں مدرسہ مغزی تھا، یہ دونوں عمارتیں غالباً شمس الدین التمش ہی کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں،

مدرسہ دارانگر | یہ امروہہ کے گرد و نواح میں ایک مشہور مقام ہے، یہاں نجیب الدولہ نے ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا تھا، جہاں سے بیشمار طلبہ نے فیض تعلیم حاصل کیا، اس مدرسہ میں خصوصیت کے ساتھ فرنگی محل کے اکثر فارغ التحصیل اشخاص مدرسین میں داخل تھے۔

مدرسۂ رام پور | مولانا بحر العلوم کو نواب فیض اللہ خان نے رام پور بلایا، اور مدرسۂ عالیہ جو اب تک قائم ہے، اس کا صدر مدرس مقرر کیا، مولانا وہاں پانچ برس تک درس و تدریس میں مشغول رہے، ہندوستان کے دوسرے مشہور عالم ملا حسن بھی مدرسہ عالیہ رامپور میں عرصہ تک مدرس رہے، ان بزرگوں کے فیض و برکت سے تعلیم و تعلم کی وہاں بڑی گرم بازاری رہی،

مدارس شاہ جہان پور و بریلی | اخیر زمانے میں روہیلکھنڈ پر حافظ الملک رحمت خان نے قبضہ کر لیا تھا، اور اپنی نوابی کے زمانے میں انھوں نے روہیلکھنڈ کے مشہور شہروں کو رشک دہلی بنا دیا، مولانا بحر العلوم کو باصرار و التجا شاہجہان پور بلایا، اور ان کے لئے ایک خاص مدرسہ قائم کیا جس میں مولانا ۲۰ برس تک مشغول درس و تدریس رہے،

حافظ الملک رحمت خان کی علمی فیاضیاں جسقدر بڑھی ہوئی تھیں، اور انھوں نے اپنے قلیل زمانے میں تعلیم کی جو کچھ اشاعت کی، مصنف گل رحمت کے اس بیان سے اس کی تصدیق ہوگی،

با ستائے خیر قدر شناسی و دین پروری حافظ الملک صدہا علماے متبحر مثل مولانا عبد العلی

لکھنوی وغیرہم در تمامی شہر ہائے کیٹھر (علاقہ روہیلکھنڈ کا قدیم نام ہے) مجتمع شدہ مواجب کثیرہ زیادہ از حاجت از سرکارے یافتند و در مدارس و مساجد کہ برائے ایشان از سرکار ترتیب یافتہ بود بفراغ خاطر بدرس و تدریس اشتغال می ورزیدند و در ہر مدرسہ کتب درسی و وظیفہ طلبہ از سرکار تعین مے یافت،

ایک ہندو مصنف کندن لال اشکی جو اسی زمانہ میں تھا، اپنی تصنیف نزہۃ الناظر کے خاتمہ میں لکھتا ہے،

"یاد دارم کہ در ایام تحصیل فقیر در بلدۂ بریلی قریب سہ صد کس طالب العلم آشنائے فقیر بودند،

مدارس صوبہ اودھ و الہ آباد

یہ صوبے نسبتہً اور صوبوں سے اس خاص وصف میں ممتاز تھے کہ یہاں دس دس پانچ پانچ میل پر شرفا اور نجبا کے دیہات آباد تھے، جن میں اچھے اچھے علماء و فضلاء درس دیتے تھے، اور دور دور سے طلبہ آکر تحصیل علوم کیا کرتے تھے، سلاطین کی طرف سے ان مدرسوں کے مصارف کے لئے دیہات معاف ہوتے تھے، مآثر الکرام میں مولوی غلام علی آزاد لکھتے ہیں،

اگرچہ جمیع صوبجات ہند بوجود حاملان علوم تفاخر دارند اما صوبہ اودھ و الہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتوان یافت چہ تمام صوبہ اودھ و اکثر صوبہ الہ آباد بہ فاصلہ پنج کروہ دہ کروہ نہایت دہ کروہ تخمیناً آبادی شرفا و نجبا است کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتہ اند و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ اند و مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم

بر روے دانش پژوہان کشادہ و صلائے اطلبوا العلم در دادہ و طلبۂ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے میروند و ہر جا موافقت وست بہم داد بہ تحصیل مشغول مے شوند و صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبۂ علم را نگاہ میدارند و خدمت این جماعہ را سعادت عظمیٰ می دانند،

یہ نظام ۱۱۳۰ھ یعنی عالمگیر کی وفات کے بعد ۱۲ سال تک قائم رہا، لیکن جب محمد شاہ کے عہد حکومت میں برہان الملک سعادت خان نیشاپوری اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے، اور صوبہ الہ آباد کے بہترین شہر مثلاً جونپور، بنارس، غازی پور، کڑا اور مانک پور وغیرہ بھی ان کی حکومت کے ساتھ ملحق ہو گئے، تو انھون نے یہ تمام معافیان ضبط کر لیں، اس لئے علماء و فضلاء کی اولاد کسب معاش کی ضرورت سے پڑھنا پڑھانا چھوڑ کر سپہگری میں مصروف ہو گئی، مدرسے ویران ہو گئے، اور علمی صحبتیں درہم برہم ہو گئیں، برہان الملک کی وفات کے بعد ان کے بھانجے ابو المنصور خان صفدر جنگ اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے، اور ان کے زمانے میں بھی یہ تمام معافیان بدستور ضبط رہیں، محمد شاہ کے آخری زمانہ یعنی ۱۱۵۹ھ میں وہ الہ آباد کے بھی صوبہ دار ہوئے اور انھون نے اس صوبے کے بچے کھچے وظائف بھی ضبط کر لئے، احمد شاہ کے زمانے میں صفدر جنگ کو وزارت ملی اور ان کے نائب نے وظیفہ داروں کو اور تنگ پکڑا، اور اس طرح وہ تمام علمی بستیان اوجڑ گیئن، لیکن باایں ہمہ تعلیم و تعلم کا سلسلہ کلیۃً منقطع نہیں ہوا۔ بالخصوص ان صوبون میں معقولات کی تعلیم کو اور صوبون سے زیادہ فروغ حاصل ہوا، چنانچہ مولوی غلام علی آزاد اس تفصیل کے بعد مآثر الکرام میں لکھتے ہیں،

باوجود این حرابیهار واج علم خصوص معقولات بہ کیفیتے کہ آنجاست در قلمر
ہندوستان ہیچ جانیست ہنوز علمار فحول جلوہ طراز ندو بہ وصول
اقصی مراتب کمال ممتاز

مدرسہ سہالی | اودھ کے انہی مشہور قصبون میں سہالی بھی داخل تھا، جو لکھنؤ سے ۳۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، شیخ نظام الدین انصاری ایک مشہور عالم اس قصبہ میں آکر سکونت پذیر ہوئے اور اونھون نے سلسلۂ درس وتدریس قایم کیا، ان کے پرپوتے شیخ حافظ نے علم وفضل میں بڑی شہرت حاصل کی، یہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا، جب وقائع نگارون کی اطلاع سے جس کا سلسلہ خصوصیت کے ساتھ تیموری عہد حکومت میں تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا، اکبر تک اس کی خبر پہونچی تو شیخ حافظ کے لئے جاگیر مقرر ہوئی، شیخ موصوف باطمنان تمام مشغلۂ درس وتدریس میں مصروف رہے، ان کی درسگاہ میں طلبہ کی سکونت کا انتظام بھی تھا، مصارف کی کفالت بھی تمامتر شیخ موصوف کرتے تھے جس کا ذریعہ وہی شاہی وظیفہ تھا، ملا قطب الدین شیخ حافظ کی نسل سے چوتھی پشت میں تھے، ملا قطب الدین کے والد لاہور کے کسی مدرسہ میں مدرس تھے، اونھون نے زیادہ تر کتابیں اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں، اور کچھ دوسروں سے بھی فراغت کے بعد سہالی ہی میں سلسلۂ درس جاری کیا، عالمگیر نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن انھون نے اپنے زاویۂ عزلت سے باہر نکلنا پسند نہ کیا، ملا صاحب نے ۱۱۰۳ھ میں شہادت پائی، اور اس دن سے سہالی کی بزم علم فرنگی محل میں منتقل ہو گئی،

فرنگی محل لکھنؤ | ملا قطب الدین شہید سہالوی کے نامور فرزند ملا نظام الدین کے فیض نے فرنگی محل کو ہندوستان کا دار العلم داعمل بنا دیا، یہ اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے وقت

۱۴ برس کے تھے، شرح ملاجامی تک تعلیم ہوچکی تھی، بقیہ کتابیں ملاعلی قلی جائسی، مولانا نقشبند گورکھپوری، مولانا عبدالسلام دیوی اور مولانا امان اللہ بنارسی سے پڑھیں،

۲۴ برس کی عمر میں فراغت تعلیم کے بعد مسند درس پر بیٹھے اور سہالی کا چراغ علم وفضل فرنگی محل میں روشن ہوا، فرنگی محل کا مکان سکونت شہنشاہ عالمگیر نے عطا کیا تھا، فرمان کے چند جملے یہ ہیں،

"فرمان واجب الاذعان صادر شد کہ یکمنزل حویلی فرنگی محل با متعلقہ آن واقع بلدہ لکھنو مضاف بصوبہ اودھ کہ از امکنہ نزولی است برائے بودن شیخ محمد سعد و محمد سعید پسران ملاقطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم"

چونکہ ملانظام الدین اس وقت صغیر السن تھے، اس لئے فرمان میں انکا نام مذکور نہیں ہے، نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام میں یہ فخر صرف اسی خاندان کو حاصل ہے کہ تقریبا ڈھائی سو برس تک اس میں بافضل علمار وفضلا پیدا ہوتے رہے، اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی محض علم وفن کی خدمت کے لئے وقف کردی اور ان کی درسگاہوں سے ہزارہا علمار نکل کر ملک کے ہر گوشہ میں پھیل گئے، اور الحمد للہ کہ یہ فیض اب تک جاری ہے،

اس سلسلہ میں دیوا، جائس، گوپامئو اور خیرآباد وغیرہ قصبوں کے نام بھی لینا چاہییں، جہاں اول الذکر میں مولانا عبدالسلام، ثانی الذکر میں ملاعلی قلی، ثالث الذکر میں قاضی مبارک اور رابع الذکر میں مولانا فضل حق وغیرہ مدتوں درس وتدریس میں مشغول رہے، اور ان کے فیوض علمی بھی بہت کچھ عام تھے، ملانظام الدین نے اول الذکر دو بزرگوں کے حلقہ درس میں شرکت کی تھی، اور زانوے تلمذ تہ کیا تھا، بلکہ امام بھی ان

قصبات میں مخصوص حیثیت رکھتا ہے، تعلیمی حیثیت سے یہ جگہ بھی مدتوں ممتاز رہی، اور متعدد مشاہیر علمار و فضلا اس کی خاک سے اوٹھے،

مدرسہ فتح گڈھ یہ قصبات درحقیقت اپنے اپنے علمار کے فیضِ وجود سے بجائے خود کالج بلکہ یونیورسٹی تھے، اس سلسلہ میں فتح گڈھ کا مدرسہ بھی قابل ذکر ہے، جس کو حکیم مہدی وزیر نواب سعادت علی خان اور نواب غازی الدین نے اپنے عہد قیام میں جب لکھنؤ سے فتح گڈھ کچھ دنوں کے لیے آکر رہے تھے، قائم کیا تھا، لیکن اس مدرسہ کے تفصیلی حالات نہیں معلوم، مسز فینی پارکس نے اپنے روزنامچہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے،

مدارس فرخ آباد بہادر شاہ کے عہد حکومت میں فرخ آباد کے ایک مدرسہ کا پتہ چلتا ہے، جس کا نام فخر المرابع تھا، بعض لوگ اسی نام کو ربیع المفاخر کی صورت میں بدل کر قنوج کا بھی ایک مدرسہ بتاتے ہیں، لیکن یہ اشتباہ اسمی ہے، ربیع المفاخر یا فخر المرابع نام قنوج میں کسی مدرسہ کا تذکرہ کتب تاریخ میں نہیں ملتا، فخر المرابع فرخ آباد کا مدرسہ ہے، جس کے بانی مولوی ولی اللہ نامی ایک بزرگ تھے، مولوی علیم الدین اور مولوی فہیم الدین نے اسی درسگاہ میں تعلیم پائی تھی، حسن رضا خان وزیر آصف الدولہ نے فرخ آباد (مگر صحیح غالباً فیض آباد) میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس کے ایک مدرس مولانا عبدالواحد خان خیرآبادی تھے، یہ زمانہ شاہ عالم کے عہد حکومت کا تھا،

مدارس جونپور اسلامی عہد حکومت میں جونپور کی تعلیمی و علمی اہمیت اس درجہ ممتاز تھی کہ اس کو شیراز ہند کا لقب دیا گیا، شاہ جہان فخریہ

کہا کرتا تھا کہ،

پورب شیراز مملکت ماست

اور خاص جونپور کو اس نے شیراز ہند کا خطاب دیا تھا، ہندوستان کے مشہور بادشاہ شیر شاہ نے اسی علمی سرزمین کے آغوش تربیت میں پرورش پائی تھی، ۸۴۵ھ میں بی بی راجہ بیگم نے جونپور میں ایک مدرسہ قائم کیا، جو مدرسہ بی بی راجہ بیگم کے نام سے موسوم ہوا،

جب ۹۰۲ھ میں سلطان سکندر لودی نے جونپور کو فتح کیا تو حسین شاہ شرقی کی اس شکست پر سلاطین شرقیہ کی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا، لیکن جونپور کی بزم علمی اب بھی قائم رہی، اب جونپور کا انتظامی تعلق براہ راست حکومت دلی سے ہوگیا، اور شاہجہان نے حکام جونپور کو عام طور پر حکم دیدیا کہ وہان کے علمار و طلبہ کو ہمیشہ وظائف دئے جایا کریں اور واقعہ نگار ہر مدرسہ کے حالات لکھین، جب شاہجہان کو کسی نئے مدرسہ کے قیام اور استحقاق اعانت کی خبر ملتی تھی تو فوراً اس کے لئے وظائف مقرر کرتا تھا، جب ملک کے امرار، شاہزادے اور حکام جونپور سے گذرتے تھے، تو ان مدرسون کے دیکھنے کیلئے لازمی طور پر قیام کرتے تھے، اور جیب خاص سے بیش از بیش عطیے دیتے تھے، تاکہ اس طرح شاہان دہلی کی خوشنودی حاصل کرسکیں،

تقریباً ۱۱۴۷ھ میں نواب سعادت خان نیشاپوری جب اودھ، جونپور، اور بنارس کے صوبہ دار مقرر ہوئے، تو حسب دستور اس عظیم الشان شہر کی بھی زیارت کی لیکن اس بنا پر کہ علمار ان سے ملنے کے لئے نہین آئے، خفا ہوکر چلے گئے، اور حکم دے گئے کہ ان کی جاگیرین ضبط کرلی جائیں، اس حکم کی تعمیل ہونا تھی کہ دفعۃً جونپور کی تمام علمی و تعلیمی سرگرمیون پر اوس پڑگئی، طلبہ اور علمار وہان سے چلے گئے، اور تمام آباد مدرسے

ویران ہوگئے۔ ۱۱۸۹ھ میں آصف الدولہ نے ان کی جاگیروں کی واپسی کا حکم دیا، لیکن ایلچ خان نے مخالفت کی، اسی زمانے میں جونپور انگریزوں کے قبضہ میں آگیا، ۱۲۰۱ھ میں جب ڈنکن نے اس شہر کو دیکھا تو اس کی بربادی پر افسوس کیا، اس زمانہ کے کمشنر اور کلکٹر بنارس کے سرکاری کاغذات میں اس کی گذشتہ عظمت کے غیر فانی نقوش باقی ہیں، مرقوم ہے کہ

"جونپور جو مسلمانوں کے علوم وفنون کا مرکز اور علما کا مرجع تھا، جس کو شیراز ہند کا خطاب حاصل تھا، جہاں بہت سے مدارس قائم تھے، اور جسکی اب گذشتہ عظمت کی داستان ہی داستان باقی رہ گئی ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ شہر ہندوستان کا شیراز تھا یا زمنہ وسطی کا پیرس، جونپور کا ہر شاہزادہ اس پر فخر کرتا تھا کہ وہ علم وحکمت کا مربی ہے، علماء وحکماء اس شاہی دارلحکومت کی پُر امن سرزمین میں ہر طرح کی علمی ترقی کے لئے ہمہ تن کوشاں رہتے تھے، محمد شاہ کے زمانے تک ۲۰ مشہور مدرسے جونپور میں موجود تھے، جن کے اب صرف نام ہی نام باقی رہ گئے ہیں، ان میں سے ایک کا بانی پندرہویں صدی کے وسط میں مرا اور ایک اور کا بانی سترہویں صدی کے وسط میں"

اٹالہ کی مسجد | جونپور کی یہ مشہور ومعروف مسجد دراصل ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی کا مدرسہ ہے جس میں ایک مدت تک اس فخر روزگار ہستی کی بدولت بزم تعلیم گرم رہی، اس کے گردوپیش جو وسیع سلسلہ حجروں کا ہے، اس کو علماء وطلبہ کی اقامت گاہ سمجھنا چاہیئے،

مدرسہ مولانا امان اللہ بنارس | بنارس میں مولانا امان اللہ بنارسی کی بہت مشہور درسگاہ تھی جہاں سے ملا نظام الدین نے بھی فیض حاصل کیا تھا، لیکن یہ معلوم نہین کہ اس کی حیثیت کیا تھی ؟ اگر کوئی خاص مدرسہ تھا، تو اس کے متعلق تفصیلی معلومات بہم نہ پہونچ سکیں[1]،

ان مدارس کے علاوہ ابتدائی تعلیم کے لئے مکتبون کا ایک وسیع سلسلہ قائم تھا، اور اس سے مسلمانون کا کوئی شہر بلکہ کوئی محلہ خالی نہ تھا، چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے،

> و محاذی مکتب خانہ کہ دربلاد اسلام مے باشد درہمہ محلات احمد نگر درزش خانہ شمشیر بازی ساختہ[2]

لیکن ہندوستان میں اسلامی مدارس و مکاتب کی یہ نہایت نامکمل تاریخ ہے، اور ان کے علاوہ ہندوستان مین اور بھی سیکڑون اور ہزارون مدارس و مکاتب قائم تھے، جنکا تفصیلی ذکر تاریخون میں موجود نہیں، البتہ مورخین کے اجمالی اشارات سے اونکا پتہ چلایا جا سکتا ہے، مثلاً ہر شخص نے فارسی تاریخون میں سلاطینِ اسلام کے اعمالِ زندگی مین عموماً یہ الفاظ پڑھے ہونگے،

> در عہد حکومت خود تا لا بہا و چاہ ہا و پلہا بستند و در ہر طرف دیگر عمارات و بقاع خیر نیز بنا نہادند"

ایسی عبارتون میں عموماً عمارات و بقاع خیر سے مدرسے، مکتب، مسجدین اور خانقاہیں مراد ہیں، مدارس و مکاتب کے علاوہ اس زمانہ کی تمام مسجدین بھی مدارس کا کام

---

[1] منقول از معارف جلد ۴ نمبر ۲ و ۳ بابت ماہ ذیقعدہ و ذوالحجہ ۱۳۳۷ھ بحذف و تزئید و اضافہ

[2] فرشتہ حصہ دوم ص ۱۰۱

دیتی تھیں، دلی، آگرہ، لاہور، جونپور، بیجاپور، احمد آباد، اور گجرات وغیرہ قدیم اسلامی دار السلطنتون مین جو عظیم الشان مسجدین تعمیر ہوئی تھین، اور جو اب تک باقی ہیں، انکی ہیئت کذائی صاف بتاتی ہے کہ ان کا بڑا حصہ تعلیم گاہون کے کام میں آتا تھا، ان مسجدون میں اب تک صحن کے چارون طرف چھوٹے چھوٹے حجرون کا جو وسیع سلسلہ نظر آتا ہے، یہ درحقیقت طلبہ اور مدرسین کے رہنے کی مقامات تھے، اور ان میں سے ابتک بعض اسی کام مین ہین،

مساجد کی طرح قدیم خانقاہیں بھی عموماً تعلیم گاہون کے فرائض ادا کرتی تھین، اور ہر خانقاہ مین تشنہ لبان تصوف وعلوم باطن کی طرح طالبین علوم ظاہر کی جماعت کثیر بھی پائی جاتی تھی، خانقاہون کے لئے حکومت کی طرف سے جو عطیے یا شخصی اوقاف ہوتے تھے، ان کا بڑا حصہ طلبہ پر صرف ہوتا تھا، اس بنا پر قدیم خانقاہون کو بھی مدارس ومکاتب کے سلسلہ میں شمار کرنا چاہیے،

سلاطین اور بزرگان کرام کی قبرون پر جو مقبرے اور روضے تعمیر ہوتے تھے، ان کے ساتھ اردگرد بہت سے حجرے اور کمرے اس غرض سے تعمیر کئے جاتے تھے کہ وہ مدرسون کے کام میں آئیں، چنانچہ اس وقت بھی جو قدیم مقبرے دلی، آگرہ، احمد آباد اور بیجاپور وغیرہ میں قائم ہیں، ان کی ہیئت خود ان کی تاریخ کو بتارہی ہے،

مدارس ومکاتب سے زیادہ طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم کی تاریخ تاریکی میں ہے، البتہ تفحص وجستجو سے جو باتین معلوم ہوسکی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) ہندوستان کے نصاب درس میں اگرچہ ہمیشہ تغیرات وانقلابات ہوتے رہے، تاہم چند کتابیں ان تغیرات سے محفوظ رہیں، اور وہ اب تک عربی وفارسی

نصاب میں داخل ہیں، چنانچہ خافی خان شیر خان کے حال میں لکھتا ہے،

درجونپور بہ تحصیل علوم وکسب کمالات میگذرانید تاآنکہ کتاب کافیہ را
باحواشی ودیگر مختصرات خواند واز کتب سواد گلستان وبوستان
وسکندرنامہ وغیرآن نیز استحضار گرفت[1]،

مرأت احمدی میں عالمگیر کے حال میں ہے،

دوحکم مقدس ومعلی درجمیع صوبجات ممالک محروسہ شرف نفاذ یافت کہ درہر صوبہ مدرس
تعین نمایند وطلبہ علم از میزان تاکشاف خوان باستصواب صدر صوبہ بموافق تصدیق
بمہر مدرسان وجہ علوفہ از تحویل خزانچی آن صوبہ میدادہ باشند[2]

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کشاف نصاب درس میں داخل تھی، لیکن اب اس کی جگہ دوسری تفسیریں پڑھائی جاتی ہیں، البتہ میزان اب تک داخل نصاب ہے،

فیروز شاہ بہمنی جو بہت بڑا ریاضی دان تھا، ہفتے میں چند روز حسب ذیل کتابوں کا درس دیا کرتا تھا،[3]

زاہدی، شرح تذکرہ، شرح مقاصد، تحریر اقلیدس، مطول، لیکن مطول کے سوا آج یہ تمام کتابیں خارج از درس ہیں،

اس کے بعد ان تغیرات کی تفصیلی تاریخ تو معلوم نہیں ہے، البتہ اتنا معلوم ہے کہ خاندان فرنگی محل نے نصاب درس میں بہت زیادہ تبدیلیاں پیدا کیں، مثلاً اس خاندان نے پہلے ہر فن میں متعدد اور کثرت سے کتابیں داخلِ درس تھیں، ملا قطب الدین

---

[1] خافی خان حصہ اول ص ۱۳۵، [2] مرأت احمدی جلد اول ص ۲۷۲، [3] فرشتہ جلد اول ص ۳۰۸

شہید نے یہ طریقہ قائم کیا کہ ہر فن کی صرف ایک مختصر اور جامع کتاب مقرر کی، ملا نظام الدین نے ایک ایک کتاب کا اور اضافہ کیا، یعنی ہر فن کی دو دو کتابیں لیں، اسطرح ایک بڑا طومار کم ہوگیا، اور حاشیہ قدیمہ وجدیدہ وغیرہ جن کو ملا فتح اللہ نے ہندوستان میں رواج دیا تھا سب نصاب درس سے خارج ہو گئے،

ہندوستان میں علم وفن کا رواج گو ۷ سو برس سے ہے، لیکن زیادہ تر منقولات کا رواج تھا، سب سے پہلے مولانا عبداللہ تلبنی المتوفی ۹۲۲ھ نے معقولات کی ترویج واشاعت کی، اس کے بعد دور اکبری میں کچھ تو اکبر کے مذہبی خیالات اور کچھ ملا فتح اللہ شیرازی کی وجہ سے معقولات کا زیادہ رواج ہوا، ان کے بعد مولانا قطب الدین شہید اور ان کے خاندان نے معقولات کو بہت زیادہ ترقی دی، یہی وجہ ہے کہ صوبہ اودھ والہ آباد میں منطق وفلسفہ کو زیادہ فروغ حاصل ہوا، اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ علماء میں وہ سختی کم ہوگئی، جو فقہا میں عموماً ہوتی ہے،

ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں

ہندوستان میں فرمانروایان اسلام نے جو بڑے بڑے مدارس قائم کئے، وہ زیادہ تر مذہبی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے وہ مسلمانوں کے لئے مخصوص تھے، البتہ مکاتب میں معمولی نوشت وخواند اور فارسی زبان کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی، اس لئے ہندو بھی ان میں تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ اور قیاس یہ ہے کہ سکندر لودی کے زمانے میں جب ہندوؤں نے فارسی زبان کی تعلیم شروع کی تو انہی مکاتب سے فائدہ اٹھایا ہوگا، بہرحال جہاں تک ہمکو معلوم ہے مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کی تعلیم وتربیت کے لئے، کوئی مستقل انتظام نہیں کیا، لیکن مختلف طریقوں سے اس کی حوصلہ افزائی کی جس کی تفصیل آگے آئیگی،

اور ہندوون نے اپنے خاص علوم وفنون کی تعلیم کے لیئے، صوبہ ٹھٹھ، ملتان بالخصوص بنارس میں جو مدارس قائم کئے تھے، وہ بدستور قائم رہے، بلکہ خود مسلمانون کو ان درسگاہون مین تعلیم حاصل کرنے سے بھی نہین روکا، البتہ عالمگیر نے اپنے عہد حکومت میں ان مدارس کو بالکل توڑ دیا، مآثر عالمگیری میں ہے،

بعرض خداوندِ دین پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھ و ملتان خصوص بنارس برہمنان بطالت نشان، در مدارس مقررہ بہ تدریس کتب باطلہ اشتغال دارند و راغبان و طالبان از ہنود و مسلمانان مسافتہاے بعیدہ طے نمودہ بجہت تحصیل علوم شوم نزد آن جماعت گمراہ مے آیند، احکام اسلام نظام بہ ناظمان کل صوبہ جات صادر شد کہ مدارس و معابد بے دینان دستخوش انہدام سازند وبہ تاکید اکید طور درس و تدریس و رسم شیوع مذہب کفرانیان براندازند (صفحہ ۸۱)

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے تمام صوبون میں ہندوون کے مدارس قائم تھے، اور ان میں ہندوون کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی تعلیم حاصل کرتے تھے، لیکن باایں ہمہ عالمگیر کے زمانے تک ان سے کسی قسم کا تعرض نہین کیا گیا تھا، لیکن اس کو مذہبی تعصب پر مبنی کرنا صحیح نہ ہوگا، بلکہ وہ اورنگ زیب کی تعلیمی پالیسی کا نتیجہ تھا جس طرح انگریزون نے اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں مسلمانون کے عربی مدارس توڑ دے اور ان کے اوقاف ضبط کر لیئے، جس کی پوری تفصیل مسٹر ٹیلر کی کتاب میں موجود ہے لیکن ہندوونکی دینی تعلیم کے نظام سے کوئی تعرض نہیں کیا، خافی خان لکھتا ہے،

جس زمانے میں، مین بندر سورت مین مقیم تھا، بانہا نامی ایک برہمن طبیب نے

مجھ سے بیان کیا کہ ہماری قوم میں یہ قاعدہ ہے کہ جب غریب برہمن، طب نجوم اور شاستر کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بنارس جاتے ہیں، تو وہاں کے ایک برہمن کو اپنا اوستاد بنا لیتے ہیں، اور ان سے پڑھتے ہیں، اور اپنے اوستاد کی طرف سے صبح و شام گنگا کے کنارے جاکر مقررہ قاعدہ کے مطابق ان لوگوں کی خدمت کرتے ہیں، جو غسل کے لئے آتے ہیں، اور اس خدمت کے صلہ میں جو کچھ ملتا ہے، نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنے اوستاد کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، شاگردوں کی خوراک اور پوشاک کی ذمہ داری اوستاد پر ہوتی ہے، اور وہ بقدر ضرورت اونکو لازمی طور پر دیتے ہیں، میں نے بنارس میں جاکر تین چار سال تک ایک برہمن کی خدمت کی اور اور دوسروں کی طرح دریا کے کنارے جو کچھ ملتا رہا، اس کو اوستاد کی خدمت میں پیش کرتا رہا، اور وہ نہایت خیر رسی کے ساتھ میری کفالت کرتا رہا، ایک روز صبح کے اندھیرے میں حسب دستور روزانہ میں دریا کے کنارے گیا، تو ایک شخص نے میرا ہاتھ پکڑ کر مٹھی بھر جواہر، اشرفی، اور ہون میرے ہاتھ میں دیا، اور کہا کہ مٹھی مت کھولو، اور مجھکو جلد لوازم غسل سے فارغ کر دو، میں اس خوش نصیبی سے جامے میں پھولا نہ سمایا، اور سرسری نظر سے دیکھا، تو جواہر اور اشرفی کے سوا کچھ نظر نہ آیا، اور جلد جلد اس کی داڑھی مونڈنے اور غسل دینے لگا، ابھی میں اس کی خدمت سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ سیوا کی دار و گیر کا شور ہوا، اور گرز بردار پہونچ گئے، میں چونکا تو وہ شخص فوراً غائب ہو گیا، اور میں سمجھا کہ میں جس شخص کی خدمت کر رہا تھا وہی سیوا تھا،

پھر میں نے اس نقد کی مقدار و تعداد پر نظر ڈالی تو جواہر، اشرفی اور روپے شمار میں نہ آئے، اور میں نے بہ مقتضائے مصلحت پھر استاد کی صورت نہیں دیکھی اور اپنے وطن بندر سورت کی راہ اختیار کی، یہ حویلی جو میری خاص ملک ہے، اسی روپیہ سے بنی ہے[1]،،

یہ نظام تعلیم صرف طب و نجوم تک محدود نہ تھا، بلکہ اس طریقہ سے شاستر کی تعلیم بھی دی جاتی تھی،

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو قوم دوسری قوموں کو اس قدر ملیچھ اور ناپاک خیال کرتی تھی، کہ اس وقت یہ کسی کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا، کہ کسی زمانے میں ہندو قوم بھی اسقدر روادار اور وسیع الخیال ہو جائے گی، کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ مل جل کر کام کریگی، اس کی زبان سیکھے گی، اس کے علوم و فنون پڑھے گی، اس کے تمدن و معاشرت کو اختیار کرے گی، اور اس کے ساتھ شاگردی اور اوستادی کا رشتہ قائم کریگی، لیکن سو دو سو برس ہی کے اندر ان خیالات میں بڑا تغیر پیدا ہو گیا، اور اور فارسی زبان کی تعلیم نے جو سکندر لودی کے زمانے سے ہندؤں میں پھیلی، ہندوؤں کے اخلاق و معاشرت میں وہی تبدیلی پیدا کی، جو انگریزوں کے زمانے میں انگریزی زبان نے پیدا کر دی تھی، یہ تبدیلی فارسی زبان کی اُس تعلیم کا اثر تھی، جو ہندو اور مسلمان مکتبوں میں پہلو بہ پہلو بیٹھ کر مسلمان اوستادوں سے حاصل کرتے تھے، اس غیر متعصبانہ طریقہ سے پہلے ہندؤں نے فارسی زبان کی تحصیل و تکمیل کی اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے رسم و رواج اور وضع و لباس کی تقلید کی، جس طرح انگریزی

---

[1] خافی خان جلد دوم صفحہ ۲۱۹ - ۲۲۰۔

دور کے زمانے میں لوگوں نے پہلے انگریزی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد انگریزی وضع ولباس اختیار کیا، بہرحال فارسی زبان کی تعلیم نے ہندوؤں میں بے تعصبی پیدا کی اور یہی ابتدائی بے تعصبی ہندوؤں کی موجودہ تعلیمی ترقی کا زینہ ہے،

اگر مسلمانوں کا درمیانی دور جس نے سو دو سو برس کے اندر اندر ہندوؤں کو انہی قدیم تنگ خیالی کے بدلنے پر مجبور کیا، اور ان میں دوسری قوموں کے علوم وفنون کے سیکھنے کا شوق پیدا کیا، ہندوستان میں قائم نہ ہوا ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے اول یوم سے وہ انگریزی تعلیم کا آغاز کر دیتے اور ساٹھ ستر برس کے اندر اندر تمام ہندوستان میں ایک غیر قومی زبان کی تحصیل کے لئے اسکول اور کالج کھل جاتے، ان کو سو دو سو برس تو صرف اپنے تعصب مذہبی کے مٹانے میں صرف ہوتے، اور اس اثنا میں مسلمان کہیں سے کہیں جا نکلتے،

ہندوؤں پر مسلمانوں کا دوسرا تعلیمی احسان یہ ہے کہ مسلمانوں سے پہلے ہندو دھرم کے مطابق تعلیم ہندوؤں کے ایک مخصوص طبقہ تک محدود تھی، اور یہ حکم تھا، کہ اگر وید کا کوئی فقرہ کسی شودر کے کان میں پڑجائے تو اس میں سیسہ پلا دیا جائے، ممکن ہے کہ یہ سخت حکم مذہبی تعلیم تک محدود ہو، تاہم اس کا اثر عام تعلیم پر بھی پڑا اور برہمنوں کے علاوہ ہندوؤں کے دوسرے طبقوں میں یا تو تعلیم کا مطلق رواج ہی نہیں ہوا، اور اگر ہوا تو بہت کم ہوا، لیکن مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر تعلیم کو ہندوؤں کے ہر طبقہ تک عام کر دیا، اور برہمنوں سے لیکر کھتری، کایستھ بنیے اور ان سے بھی نیچے درجوں تک علم اتر آیا، آج ہندوستان میں برہمنوں سے زیادہ نہیں، تو برہمنوں کے برابر غیر برہمن ہندو بھی تعلیم سے بہرہ اندوز ہیں،

اور مسلمانون کے عہد حکومت میں بھی یہی حال تھا کہ برہمنوں سے زیادہ کایستھ اور کھتری تعلیم یافتہ تھے،

مسلمان فرمانروایان ہندوستان میں صرف اکبر کی نسبت تاریخون میں مذکور ہے، کہ اس نے رذیل قومون کو تعلیم سے روک دیا تھا، لیکن تاریخون میں اس کی کوئی وجہ مذکور نہین ہے، ممکن ہے کہ اس کی کوئی سیاسی وجہ موجود ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے قدیم ہندو نظام تعلیم کا دوبارہ احیا، کیا، ہو جس کے رو سے شودر لوگ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے، بہر حال وجہ جو کچھ بھی ہو، لیکن اس سے استناضر در ثابت ہوتا ہے کہ اکبر کے زمانے سے پہلے رذیل قومین بلا روک ٹوک تعلیم حاصل کرتی تھین، اور اکبر کے بعد بھی، اور سلاطین نے اُس کے اس تعلیمی اصول کو قائم نہیں رکھا اس لئے جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں بھی وہ تعلیم حاصل کرتی رہیں،

ہندؤن پر مسلمانون کا تیسرا تعلیمی احسان یہ ہے کہ مسلمانون نے اُن کے تعلیمی علوم وفنون میں وسعت پیدا کی، مسلمانون کے عہد سے پہلے ہندوستان میں جن علوم کی تعلیم رائج تھی، ان کی فہرست نہایت مختصر تھی، نصاب تاریخ سے یہان کے مدارس ہمیشہ خالی رہے، جغرافیہ کا وجود یہان برائے نام تھا، فلسفہ، حکمت، اقلیدس، ہیئت، طب، شاعری اور موسیقی وغیرہ علوم ہندوستان مین پہلے سے موجود تھے، لیکن انکی تعلیم اولاً تو مخصوص لوگون کو دیجاتی تھی، دوسرے یہ کہ ان علوم کے متعلق دنیا کی دوسری قومون کی جو تحقیقات تھی، اس سے ہندو بالکل ناواقف تھے، مسلمان علما، نے ان کے نصاب تعلیم کی یہ کمی پوری کی،

مسلمانون میں ہندوستان کا سب سے پہلا علمی فاتح بیرونی ہے، وہ سلطان محمود کے

زمانہ مین ہندوستان آیا، اور ہندؤون کو بہت سی نئی باتین سکھائین، چنانچہ خود کتاب الہند کے پہلے باب میں لکھتا ہے،

"اجنبی ہونے کے سبب سے مجھکو ہندو علمائے ہیئت کی پہلے شاگردی اختیار کرنی پڑی لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد جب میری زباندانی کی واقفیت بڑھ گئی تو میری حیثیت استادکی ہوگئی، چونکہ ہیئت وریاضیات میں مجھکو کامل مہارت حاصل تھی، میں خود انکو تعلیم دینے لگا، پنڈتون کو یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی، تعجب سے پوچھتے تھے، کہ تم نے یہ باتین کس پنڈت سے سیکھی ہیں، ان کو یقین نہیں آتا تھا، کہ کسی دوسری قوم کا آدمی بھی علوم وفنون میں ان کا ہمسر ہوسکتا ہے، وہ مجھکو جادوگر سمجھتے تھے، اور "بحر العلوم" کہتے تھے"

ہندو پنڈتون کی واقفیت کے لئے اس نے عربی زبان سے حسب ذیل کتابین سنسکرت میں ترجمہ کین رسالہ اصطرلاب، مجسطی، اقلیدس کے مقالے، اس کے علاوہ ہندو ہیئت دانون نے اس سے ہیئت کے متعلق سوالات کئے اور ۱۲۰ صفحون مین اس نے ان کے جوابات لکھے، ایک رسالہ اس کا اس بحث پر ہے کہ اعداد کے مدارج جو عربی زبان میں ہیں، وہ باعتبار ہندی کے زیادہ صحیح طریقہ پر مقرر ہیں،

مسلمانون کی فتوحات نے ہندوستان میں جب وسعت حاصل کی، تو ہندو پنڈتون کو ان کے اندرونی حالات کے دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ بھوجبر برہمن نام بنارس کا ایک باشندہ قاضی رکن الدین کی خدمت میں پہونچا، اور ان سے مسلمانون کے علوم کی تکمیل کی، قاضی صاحب نے بھوجبر سے سنسکرت سیکھی اور اس کی مدد سے امرت کنڈ (حوض آبحیات) نام ایک کتاب کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا،

سلطان زین العابدین جو ۸۲۶ھ میں تخت کشمیر پر جلوہ آرا ہوا تھا، اور جسکے آثار سلطنت پر شہنشاہ اکبر نے اپنی حکومت کی بنیاد ین کھڑی کین، اس نے ہندؤون کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور بہت سی عربی اور فارسی کتابون کے ترجمے ہندی میں کرائے، نصاب تعلیم میں سب سے پہلے اکبر کے زمانے میں وسعت پیدا ہوئی،

ہندؤونکی تعلیم اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ہندؤون کی تعلیم سلاطین دہلی کے زمانہ سے شروع ہو گئی تھی، اور ہر دور میں ان میں ایسے صاحب علم وکمال پیدا ہوتے رہے جو حکو کے اعلیٰ عہدون پر ممتاز ہوئے، لیکن ان کی تعلیمی ترقی کا اصلی دور تموریوں کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے، انھون نے تعلیم کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے عربی مدارس کے مروجہ مذہبی نصاب کے علاوہ ایک مشترک نصاب بھی بنایا جسکو ہندو مسلمان دونون پڑھ سکیں، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس میں حسب ذیل فنون تھے جن کو کسی مذہب سے کوئی علاقہ نہیں،

اخلاق، ریاضیات، حساب، زراعت، اقلیدس، مساحت، ہیئت، رمل، قواعد، آئین سلطنت، طب، طبیعیات، الٰہیات، اور تاریخ ہندؤون کو ان کے علاوہ سنسکرت صرف ونحو، ہندو تصوف واخلاق اور ہندو فلسفہ کی بھی تعلیم دیجاتی تھی، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس تعلیم کے بدولت تمام سلطنت آراستہ ہو گئی،[1]

فارسی زبان وادب کا عام نصاب یہ تھا، جس مین وقتاً فوقتاً جزوی تبدیلی بھی ہوتی رہی، کریما، مامقیمان، گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، سکندر نامہ، بہار دانش، اخلاق ناصری، انوار سہیلی، شاہنامہ، انشائے خلیفہ، بعد کے زمانہ میں اس میں وقائع نعمت خان عالی، سہ نثر ظہوری، رقعات عالمگیر، پنج رقعات اور انشائے مادھو رام بھی

---

[1] آئین اکبری

درس میں داخل ہوتی رہیں،

یہ اعلیٰ مشترک تعلیم کا نصاب تھا، ابتدائی مکتبی تعلیم کا پرانا نظام بدستور قائم رہا، جس مین پنڈت اپنے پاٹھ شالون میں اور مسلمان ملا اپنے مکتبون میں بچونکو ابتدائی تعلیم دیتے تھے، جن سے ہندو مسلمان طلبہ دونون پڑھتے تھے، چنانچہ بہت سے ہندو مکتبون اور مسلمان اساتذہ کے فیض یافتہ تھے، مسلمان فضلائ کے اساتذہ میں بھی ہندوؤن کے نام ملتے ہیں، ان کا ذکر تاریخون میں بکثرت ملتا ہے، اس لئے ان کی تفصیل کی ضرورت نہین، آج بھی ہندو مسلمانونکی پرانی نسلین اس کی شاہد ہیں،

اس کے علاوہ تیموریون نے مختلف طریقون سے ہندوؤن کی تعلیمی ہمت افزائی کی وہ اپنے دربارون میں مسلمان فضلار کے پہلو بہ پہلو ہندو فضلار اور اصحاب کمال کو بھی جگہ دیتے تھے، اکبری دربار میں حسب ذیل فضلا کے نام ملتے ہیں،

مہادیو، بھیم ناتھ، نارائن شیوجی، مادھو، رام چندر، سری بھٹ، مادھو سرستی، مدروپ بھٹ، بشن ناتھ، مدسودن، رام کشن، نارائن اسرم، بلبھدر مصر، ہرجی سور، باسدیو مصر، داموددا بہن بھٹ، رام تیرتھ، بدھ نواس، نرسنگھ، گوری ناتھ، پرم اندر، گوپی ناتھ، بجے سین سو، کشن پنڈت، نہال چند بھٹاچارج، کاشی ناتھ، دیوی برہمن، دیوی برہمن نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا،

اکبری دور کے مصورون میں مسلمانون کے علاوہ حسب ذیل ہندو تھے، دسونت کہار دساون، کیشولال، مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، ساذیلا، ہربنس رام، اس کی تفصیل آئین اکبری میں موجود ہے،

جہانگیر نے بھی ہندو ارباب کمال کی قدردانی میں کمی نہیں کی، اس کے زمانہ میں جدرو دیگر شعرا میں

ایک مشہور پنڈت تھا، جہانگیر خود اس کی ملاقات کو جاتا تھا، اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتا تھا،[۱] راے منوہر لال ولد لون کرن، جہانگیر کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پاکر جوان ہوا، فارسی شاعری اور خوشخطی میں خاص سلیقہ رکھتا تھا،[۲] اس کے دربار کا مشہور نقاش بشن داس تھا، جس کو اس نے ایران بھیجا تھا،[۳]

دارا شکوہ خود ہندوؤن کے علوم و فنون میں کمال رکھتا تھا، اس کا دربار ہندو فضلاء سے بھرا ہوا تھا، اس کے دربار کا نامور شاعر جس کو ملک الشعراء کہنا چاہئے چندر بھان برہمن تھا، اس کا فارسی دیوان ابتک موجود ہے،

تیموریون کی اس قدر افزائی کی وجہ سے ان کے زمانہ میں ہندوون نے تعلیم میں بڑی ترقی کی، بیشتر ہندو شرفا، فارسی زبان و ادب خوشخطی و خطاطی اور دوسرے مروجہ فنون میں پورا درک رکھتے تھے، خصوصاً لاہور، دلی، آگرہ صوبہ متحدہ آگرہ اودھ اور بہار کے ہندو تعلیم میں بہت ممتاز تھے، یہان کے ہندوون میں ہر علم و فن کے بڑے بڑے اہل کمال پیدا ہوئے، جن کے نام تاریخون مین محفوظ ہیں، ان میں سے بہت سے مصنف اور صاحب قلم بھی تھے، جنھون نے مختلف علوم پر کتابیں لکھیں ان کی تصانیف آج بھی موجود ہیں، اور اپنے موضوع پر سند کا حکم رکھتی ہیں، اور ان سے استفادہ کیا جاتا ہے، ان سب کتابون کی فہرست نقل کرنا دشوار ہے، نمونے کے طور پر صرف اہم فنون کی کچھ کتابون اور ان کے مصنفین کے نام لکھے جاتے ہیں،

مورخین لب التواریخ بندرابن داس، خلاصۃ التواریخ سجان راے بٹالوی،

---

[۱] تذکرہ خوشنویسان [۲] تزک جہانگیری ص۱۵ [۳] ایضاً ص۲۸۵

فتوحات عالمگیری ایشر داس ناگر، تاریخ دلکشا بھیم سین کایستھ، تاریخ کشمیر نرائن کول عاجز، گلشن امرار بنیہ نرائن کھتری، تحفۃ الہند رام لال، تاریخ محمد شاہی خوشحال چند کایستھ، چہار گلشن رائے چترمن کایستھ، تاریخ فیض بخش منشی شیو پرشاد، تاریخ شاہ عالم منا لال، چہار گلزار شجاعی ہرچرن داس کایستھ، تاریخ جگلکشور جگلکشور، صحیح الاخبار سروپ چند کھتری، زبدۃ الاخبار امر سنگھ خوشدل، حالات مرہٹہ رگھو ناتھ، خلاصۃ التواریخ کلیان سنگھ، مخزن الفتوح بھگوان داس، مرآت دولت عباسیہ بہاول پور دولت رائے، خلاصۃ التواریخ مہاراجہ کلیان سنگھ، منتخب التواریخ سدا سکھ، اشرف التواریخ کشن دیال، احوال شہر اکبر آباد مانک چند، احوال عمارات مستقر الخلافہ سیل چند، تواریخ جموں و صاحب نامہ گنیش داس قانونگو، سلطان التواریخ رتن ناتھ زخمی، کشمیر نامہ بھان سنگھ

تذکرہ نویسی: سفینۂ خوشگو درگا داس عشرت، گل رعنا، شام غریباں اور چمنستان شعرا لچھمی نرائن شفیق، عیار الشعراء خوب چند ذکا، سفینۂ ہندی و تذکرہ حدیقۂ ہندی بھگوان داس، تذکرۃ الامراء منشی کیول رام، انیس العارفین رتن ناتھ زخمی

انشاء: انشائے ہرکرن، ہرکرن ولد متھرا داس کنبوہ، منشآت برہمن چندر بھان برہمن، انشائے مادھو رام، نگار نامہ منشی لعل چند، ہفت انجمن اودے راج رستم خانی، طرز الانشاء اندر جیت محقر، دقائق الانشاء رگھو داس، رقعات مخلص انند رام مخلص، طلسمات خیال نوکشور نزاکت، خلاصۃ الانشاء لچھمن رام دہلوی، منشآت منشی گنیش داس، شمع شبستان درگا پرشاد عاشق، تضمین گلستان ہرگوپال تفتہ، انشائے دلپسند ستیل داس سیٹھی، منشآت نہنگ لال،

مفید الانشا، پنڈت لچھمی نرائن، انشائے فیض پیر، منشی ہر سہائے قانونگو، منشآت امرلال، منشآت کالی رائے تمیز، رقعات فیض آگین و گنجینۂ خیال منشی خیالی رام، نادر الانشا کشن جی پنڈت، دستور الصبیان و دستور المکتوبات نونده رائے، انشائے دولت رائے، منشآت ہیرالال،

لغت، مرآۃ الاصطلاح آنند رام مخلص، مصطلحات وارستہ سیالکوٹی مل وارستہ، بہار عجم ٹیک چند بہار، گنج اللغات گردھاری لال، غنچۂ بے خار گنیش داس لائق، ہفت گل منشی کامتا پرشاد نادان، مفتاح الصفات رام نرائن،

انکے علاوہ ہیئت، نجوم، طب، موسیقی، علوم طبیعیہ، ریاضیات، قصص و حکایات اور دوسرے فنون پر بھی ہندوؤں کی بکثرت تصانیف ہیں، ان سب کی تفصیل بہت طویل ہے، اس لئے اس کو قلم انداز کیا جاتا ہے، ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے اپنی قابل قدر تصنیف "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" میں ان تصانیف کی پوری فہرست دی ہے، اور اہم تصنیفوں پر تبصرہ بھی کیا ہے، مذکورۂ بالا تصانیف اور ان کی تصانیف کا بڑا حصہ اسی کتاب سے ماخوذ ہے،

فارسی زبان کے ہندو شعراء کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کا احاطہ دشوار ہے، مثال کے طور پر کچھ نام لکھے جاتے ہیں جن میں کچھ صاحب دیوان بھی تھے، چندر بھان برہمن، متھرا داس نبد، ساطع کشمیری، بنوالی داس ولی، لچھمی نرائن شفیق، بندرا بن داس خوشگو، آنند رام مخلص، سیالکوٹی مل وارستہ، ٹیک چند بہار، جسونت رائے منشی، لالہ دھنراج برہانپوری سبقت، لالہ سدانند تکلف، رائے راجی ہاتف، کشن چند کھتری اخلاص، اودھے بھان بہار، لالہ سکھراج سبقت، گلاب رائے مخلص، لالہ شیورام حیا، لالہ امانت رائے امانت، خوشحال چند فرحت، ہری گوپال

برہمن تمیز، راجہ داس مخلص، لالہ اجاگر چند الفت، بابو بالمکند شہود، گوربخش حضوری، لالہ حاکم چند ندرت، راجہ رام نرائن موزون، منشی سرب سنگھ کایستھ خاکستر، جے کشن عشرت بندرابن داس خوشگو، لالہ رتن سکھ رائے شوق، پنڈت رندہ رام موبد، منشی سندر داس آرام، راجہ دیال امتیاز، سکھم لال عزت، رائے مکھنی مل نشاط، رائے بجے مل تسلی شیورام عاشق، راجہ مدن سنگھ اٹاوی موزون، لال جی تازہ، لالہ دولت رائے برہانپوری دبیر، لالا مشتاق رائے کھتری قدرت، لالہ روپ نراین زبین، لالہ فتح چند برہانپوری، منشی سرب سنگھ دیوانہ، انندلچھمن خوش، لالہ ٹیکارام تہمت،

مغلوں کے آخری دور میں جب شمشیر و سنان کے بجائے چنگ ورباب کا دور آیا، اور شعر وادب کا ذوق تعلیم و تہذیب کے لوازم میں داخل ہوگیا، تو اس کثرت سے شعراء پیدا ہوئے کہ ان کا شمار دشوار ہے، جن شعراء کے نام کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں، ان کا احاطہ بھی نہیں کیا جاسکتا، صرف مثال کے طور پر کچھ نام لکھے جاتے ہیں:

کندن لال آگہی، بسادون لال شادان، کنہیا لال ہندی، رام داس قابل، منشی تنھن لال بہجت، مٹھو لال مرشد، نت لال آفرین، لکشمی نرائن سرور، منولال فلسفی، بچھو لال تمکین، ہرگوپال تفتہ۔ خیالی رام خیالی، ہیتل داس بیخود، کالکا پرشاد نادان، کامتا پرشاد نادان، مینڈولال زار، ہیرالال ضمیر، ذوقی رام حسرت، صاحب رام خاموش، بابو رائے اخفر، پنڈت بینی رام احقر، بلدیو پرشاد احقر، رام دیال احقر، کندن لال ارشاد، منا سنگھ آشنا، منشی گربھائے آشنا، دیوان امرناتھ اکبری، کالکا پرشاد نور، لالہ جگناتھ انور، خیالی رام افسر، پرشاد رائے عالم، لالہ بیجناتھ آتش، لالہ کیرت سنگھ آسد، لالہ گردھاری پرشاد باقی، پنڈت سنت رام بیخود، لچھمن لال بہجت، میدنی لال بیمار، لالہ جے کشن بیجان

لچھمن پرشاد بہار، رائے ٹکارام تسلی، گنگا داس تسکین رائے بیجو لال تمکین، موہن لال تحسین،
جواہر سنگھ جواہر، بشن نرائن حیران، کنج بہاری لال حیرت، بنسی رام حقیر، خوشوقت رائے لکھنوی،
جے سنگھ رائے خیال، بہاری لال خود رفتہ، جواہر لال دبیر، نرائن داس دل، دیارام درآ
دھرم نرائن ذکر، جے سنگھ رائے ذہین، رام پرشاد رام، لالہ لچھمی نرائن رفیق، لالہ بھاگ مل رنج،
دیوناتھ پنڈت رنگین، لالہ جواہر سنگھ رم، گوبند رام زیرک، منشی منولال زاری، لالہ ہیبت پرشاد
سرور، گنگا پرشاد شاد، لالہ بدھ سنگھ شادان، راجہ کشن پرشاد شاد، پنڈت امرناتھ شیدا،
لالہ خوشوقت رائے شاداب، لالہ دیبی پرشاد شائق، رادھے کشن شائق، بستی رام شائق،
لالہ متھرا داس شاہ، شنبھوناتھ جودت، امرناتھ شعلہ، دولت سنگھ شکری، لالہ طوطارام
شایان، جے جے رام صبا، رائے بالک رام صبوری پنڈت ستیارام صوفی، جے موہن لال
صادق، سکھ رائے ضمیر، پنڈت نرائن داس ضمیر، جانکی پرشاد ضمیر، لالہ ٹکارام ظفر، بدیادھر
فصیح، پریم کشن فراقی، لالہ دین دیال فرحت، لچھمی نرائن فرزانہ، پنڈت بدیادھر فطرت،
گوبند پرشاد فضا، منولال فہیم، رائے بیجناتھ عاشق، موہن لال عاشق، مہاراجہ کلیان
سنگھ عاشق، بابو محبت سنگھ عاشق، رائے سوہن لال عاشق، درگا پرشاد عاشق،
زورآور سنگھ عزیز، لالہ ہندوپت عشرت، لالہ شتاب رائے عزیز، آتمارام عاشق،
بھولاناتھ عاشق، بھگوان دیال عاقل، لچھمن سنگھ غیوری، لالہ موہن رائے غالب، رائے
رتن لال غریب، رائے چنی لال قریب، رام داس قابل راجہ ایودھ کشن کنور، نندلال
گویا، پرکاش داس لطفی، راجہ کانجی سہائے متین، منشی کنور سین مضطر، ستیل داس ممتاز،
بیجناتھ مشتاق، سکھن لال موحد، گنگا بشن مسرور، لالہ مٹھولال مرشد، لالہ بلند
سنگھ معروف، پنڈت مادھورام مشتاق، موتی لال مفتون، ہرچند مہر،

موہن لال منعم، لالہ درگا پرشاد مضطرب، کنہیا لال تمیز، منشی کنور جی مدہوش، رائے چنی لال نحیف، منشی درگا پرشاد نشاط، لال مولراج نظمی، دیا شنکر نسیم، لالہ بھٹن لال نامی، شنکر ناتھ نادر، بنسی دھر ہمت، رائے کنہیا لال ہندی، گوکل چند لاہوری ہندو، نوبت رائے وقار، جوالا پرشاد وقار، مہاراجہ چندو لال شاداں وغیرہ۔

یہ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ فارسی کے مصنف اور اہل قلم بھی تھے، اردو زبان کے دور میں اس سے بھی زیادہ ہندو شعراء ادباء اور مصنفین و اہل قلم پیدا ہوئے، اردو نے گو مغلوں کے آخری دور میں مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی، لیکن اس کا دائرہ بول چال اور شعر و ادب تک محدود تھا، نثر کی تصانیف برائے نام تھیں وہ بھی زیادہ تر مذہبیات اور ادبیات تک محدود تھیں اور اس کی زبان بالکل ابتدائی شکل کی تھی، اس کی اصلی ترقی کا زمانہ انگریزوں کے عہد سے شروع ہوتا ہے، اس لئے اسکا شمار اسلامی دور میں نہیں کیا جاسکتا، لیکن اردو جس شکل میں بھی رہی اس کی تعلیم اور توسیع و ترقی میں ہندوؤں کا بھی حصہ رہا، چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں للو لال جی بینی نرائن منشی، طوطا رام شایاں اور منشی شادی لال چمن نے اردو کی کتابیں بھی تالیف و ترجمہ کیں، اس کے بعد اردو کی ترقی کے ہر دور میں اردو کے ہندو شعراء و ادباء اور مصنفین پیدا ہوتے رہے، لیکن یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے، اور اس دور کے نامور شعراء اور ادیبوں سے اصحاب علم عام طور سے واقف ہیں، اس لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں اس زمانہ میں بھی ہندو شعراء، اور ادیبوں اور مصنفین کی بہت بڑی تعداد موجود ہے،

کاغذسازی

(از مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مولف تاریخ گجرات وغیرہ)

آج جس کثرت سے ہم کاغذ کا استعمال کرتے ہیں، اس فراوانی کو دیکھ کر بہت کم اشخاص اس حقیقت سے آگاہ ہونگے کہ ایک زمانہ ایسا بھی ہندوستان پر گذرا ہے، کہ یہان کاغذ کا رواج نہ تھا،

ہندوستان کے مختلف صوبون میں کاغذ کی جگہ دوسری مختلف چیزین رائج تھین، ضرورت کے وقت اُن ہی کو استعمال میں لاتے تھے بھوج پتر، کھجور کے پتے، تاڑ کے پتے، تانبہ، پتھر، ریشم وغیرہ کا استعمال ہوتا تھا، چنانچہ اشوک کے فرمان آج بھی پتھر پر کندہ ہیں، اسی طرح عطیات کے پروانے جو ولبھی خاندان (کاٹھیاواڑ) کی طرف سے دیئے گئے تھے، تامر پتر (تانبہ کی تختی) پر تحریر ہیں جن کو محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے بمبئی کے عجائب خانہ میں رکھ دیا گیا ہے،

ہندوستان کی ہمعصر قومیں بھی اس سے واقف تھین، جیسا کہ عربی کی ایک قدیم تاریخ میں ہے،

العرب تکتب فی اکتاف الابل	عرب اونٹ کے شانوں کی ہڈیوں اور
واللخاف.. والهند فی النحاس	کھجور کے پتوں پر۔ اور ہندوستانی تانبہ پتھر
والحجارو فی الحریر الابیض[1]،	اور سفید ریشم پر لکھتے تھے،

ہندوستانیون نے جب اس سے زیادہ ترقی کی تو درخت کے پتے استعمال کرنے لگے: اور

---

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۳۲ مصر،

اس کے لئے انھوں نے بھوج پتر اور تاڑ زیادہ موزون سمجھا، بیرونی لکھتا ہے،

اما فی البلاد الجنوبیة فلهم شجر	جنوبی ہند میں ایک اونچا درخت کھجور اور ناریل
باسق کالنخل والنارجیل ذو ثمر یوکل	کی طرح ہوتا ہے جسکا پھل کھایا جاتا ہے اس کے
واوراق فی طول ذراع وعرض ثلاث	پتے طول میں ایک ہاتھ اور عرض میں تین انگل
اصابع مضمومة یسمونها تاری	کے برابر ہوتے ہیں، اس کا نام تاڑ ہے، اسی
(تاڑ) ویکتبون علیها ویضم کتابهم	پر لکھتے ہیں، اس کے بیچ میں ایک سوراخ
منها خیط ینظمها من ثقبة فی	کر کے دھاگے سے اس کو منظم کر لیتے
اوساطها، فینفذ فی جمیعها	ہیں،
واما فی واسطة المملکة و	اور وسط مملکت اور اسکے شمالی حصہ میں
شمالها فانهم یاخذون من	توز کے درخت کی چھال کو جس کی ایک قسم
لحاء شجرة التوز الذی یستعمل	کمانوں کے غلاف میں استعمال کی جاتی ہے اسکو
نوع منه فی اغشیة القسی یسمونه	بھوج کہتے ہیں، اسکو ایک گز کے طول اور پھیلی
" بهوج" فی طول ذراع وعرض	ہوئی انگلیوں کے عرض کے برابر یا اس سے
اصابع ممدودة فما دونه و	کم لیتے ہیں، پھر اس پر ایک طرح سے چہرہ کشی
یعملون به عملاً کالتدهین والصقل	اور صیقل کر کے اس کو چکنا بنا دیتے ہیں جس سے
یصلب به ویملس ثم یکتبون	وہ سخت اور چکنا ہو جاتا ہے، تو اس پر لکھتے ہیں
علیها، وهی متفرقة یعرف نظامها	یہ متفرق ہوتے ہیں، انکی نظم و ترتیب کے لئے
بارقام العدد المتوالی ویکون	صفحوں میں ہندسے لکھ دیتے ہیں، اور پوری
جملة الکتاب ملفوفة فی قطعة	کتاب دو تختیوں کے درمیان کپڑے کے ایک

ثوب مشدود و دقاہین لوحین بقدرھا [1]	ایک کپڑے (جزدان) میں لپٹی ہوتی ہے،
واسم ھذہ الکتاب "پوتی" (پوتھی)	اور اس کا نام "پوتھی" ہوتا ہے، انکے خطوط
ورسائلھم وجمیع اسبابھم تنقذ	اور دیگر چیزیں سب اسی میں لکھی جاتی تھیں،

[illegible]

سجان رائے نے اڑیسہ کے حالات میں لکھا ہے کہ تاڑ کے پتہ پر فولادی قلم سے تحریر کرتے تھے، اس کے اصل الفاظ یہ ہیں :-

بر برگ درخت تاڑ بفولادی قلم نامہا نویسند	تاڑ کے پتہ پر لوہے کے قلم سے خطوط لکھتے
و خامہا بہ مشت بر گیرند، کاغذ و سیاہی کمتر	تھے، اور قلم کو مٹھی میں پکڑتے، کاغذ بھوج تیج
بکار رود،	اور سیاہی بہت کم کام میں لاتے،

کشمیر کے حالات میں بیان کرتا ہوا تحریر کرتا ہے :-

و بیشتر بر توز درخت کہ خاص در آن ملک	اور زیادہ تر بھوج پتر پر جو اس ملک میں
است بنگارند، و ہمگی کہن نامہا بر آن نوشتہ	بکثرت ہوتا ہے، لکھتے ہیں، اور قدیم تحریریں
و سیاہی چنان سازند کہ بشستن شستہ	اسی پر ہیں، اور سیاہی اس طرح بناتے
نمی رود [2]،	ہیں کہ دھونے سے زائل نہیں ہوتی،

ان بیانات سے واضح ہو گیا کہ ہندوستان میں کاغذ کا رواج نہ تھا، بلکہ پتوں پر لکھا کرتے تھے، اس قسم کی پوتھی جس کا بیرونی نے بیان کیا ہے، اب بھی ہندوستان میں موجود ہے جس میں قدیم کتابیں تحریر کی گئی ہیں، ایک دفعہ احمد آباد میں خود راقم الحروف کو اس قسم کی پوتھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ جین مذہب کی ایک قدیم کتاب تھی، جو بھوج پتر پر لکھی گئی تھی، اس کے دونوں جانب دفتی کی جگہ چوبی تختی لگی تھی جس کے سبب سے ذرا وزنی ہو گئی تھی،

---

[1] کتاب الہند بیرونی ص۸۱ لیڈن [2] خلاصۃ التواریخ ذکر صوبہ جات (قلمی دار المصنفین)

دوسری قدیم کتاب بودھ مذہب کی رنگون کے بڑے مندر میں تھی جس وقت میں گیا تو اس کی نقل ایک سل (پتھر) پر کندہ کی جارہی تھی، یہ کتاب تاڑ کے پتوں پر تھی،

کاغذ کی اصل ایجاد چینیوں کی ہے، یہ لوگ ایک قسم کی گھاس سے کاغذ بناتے تھے، الفہرست میں ہے،

والصین فی ورق الصینی ویعمل	چین والے چینی کاغذ پر لکھتے ہیں جو گھاس
من الحشیش وهو اکثر ارتفاع	سے تیار کیا جاتا ہے، اور یہ شہر کی بڑی آمدنی
البلد،[۵]	کا ذریعہ ہے،

ابتدا میں اس قسم کے کاغذ سے دنیا ناواقف تھی، آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے اس کو سیکھا، اور پھر ان کے توسط سے تمام دنیا میں یہ ہنر پھیل گیا،

بیرونی نے لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے سمرقند پر حملہ کیا تو قیدیوں میں چند ایسے بھی تھے، جو کاغذ بنانا جانتے تھے، عربوں نے ان سے اس صنعت کو سیکھ کر اسے ترقی دی، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

ولیس للهند عادة بالکتبة علی	ہندوستان میں یونانیوں کی طرح چمڑے
الجلود کالیونانیین فی القدیم	پر لکھنے کا دستور نہیں ... کاغذ چینیوں کی ایجاد
..... والکاغذ للصین وانما	ہے، سمرقند میں اس کو چینی قیدیوں نے جاری
احدث صنعها بسمرقند سبی منهم	کیا، پھر وہاں سے مختلف مقامات میں یہ
ثم عمل منه فی بلاد شتی،[۶]	صنعت پھیلی،

ہندوستان فتح کرنے سے پہلے مسلمانوں میں کاغذ رائج ہوچکا تھا، اور مختلف مقامات میں اس کے کارخانے قائم ہوچکے تھے، غالباً سمرقند اور خراسان میں سب سے پہلے اس کا کارخانہ قائم کیا گیا،

---

[۵] کتاب الفہرست ص ۳۲ مصر [۶] کتاب الہند ص ۸۱ لیڈن،

جہاں اس قسم کی گھاس بکثرت پیدا ہوتی تھی ۱۵۱ھ/۷۶۷ء ۱۳۴ھ کے بعد عربوں نے کاغذ سازی میں ترقی کا قدم بڑھایا، اور روئی سے کاغذ تیار کرنے لگے[1] اور دوسری ہجری کے وسط سے اس کا استعمال باقاعدہ سرکاری دفتروں میں بھی ہونے لگا[2]،

ہندوستان میں گو مسلمانوں کی آمد و رفت پہلی صدی ہجری کی ابتدا ہی سے شروع ہوگئی تھی، مگر صوبہ سندھ پر قبضہ اس صدی کے آخر (۹۳ھ) میں ہوا، حجاج بن یوسف ثقفی محمد بن قاسم فاتح سندھ کو ہر قسم کی ہدایات تحریری بھیجا کرتا تھا، اور وہ ہر تیسرے دن اس کا جواب دیا کرتا تھا، بلاذری میں ہے،

وکانت کتب الحجاج ترد علی محمد	حجاج کے خطوط محمد بن قاسم کے پاس، محمد بن قاسم
کتب محمد ترد علیه بصفة ما قبله	کے حجاج کے پاس آتے جاتے رہتے جیسا
واستطلاع رائه فیما یعمل به	کہ اوپر بیان ہوا، حجاج کی رائے کے مطابق
فی کل ثلاثة ایام[3]	عمل درآمد کیلئے ہر تیسرے دن خط روانہ کئے جاتے

اب سوال یہ ہے کہ کس کاغذ میں خط و کتابت ہوتی تھی؟ قلقشندی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سپید پتھر اور کھجور کی شاخوں پر لکھتے تھے، عہد صحابہ میں رق (پتلا چمڑا) استعمال ہوتا تھا، ابتدائے حکومت بنی عباسیہ تک یہی حال رہا،

ہارون الرشید عباسی پہلا خلیفہ ہے جس نے باقاعدہ سرکاری طور پر یہ حکم صادر کیا کہ تمام دفاتر کاغذ پر لکھے جائیں، اسی دن سے کاغذ کا عام رواج ہوگیا، اور لوگ کاغذ پر لکھنے لگ گئے، صبح الاعشیٰ میں ہے،

...... واجمع رای الصحابة رض علی	صحابہ کے عہد میں قرآن لکھنے کیلئے مضبوطی کے
کتابة القرآن فی الرق لطول بقائه	خیال سے یا اس لئے کہ یہی چیز اس وقت

---

[1] انسائیکلوپیڈیا جلد ۲۰ ص ۲۵، طبع یازدہم، [2] صبح الاعشیٰ جلد دوم ص ۴۰۵ مصر [3] بلاذری ص ۴۳۲ مصر

ولانه الموجود عندهم حینئذٍ وبقی الناس علی ذالک الی ان ولی الرشید الخلافة وقد کثر الورق وفشا عمله بین الناس امر ان لا یکتب الناس الا فی الکاغذ،

(صبح الاعشی ج ۲ ص ۴۷۵)

موجود تھی، رق (پتلا چمڑہ) استعمال کیا گیا، (بنی امیہ تک یہی حال رہا، عہد عباسیہ میں جب رشید خلیفہ ہوا تو اس وقت کاغذ رائج ہو چکا تھا۔ اور لوگ اسی پر لکھنے لگے تھے، اس وقت رشید نے حکم دیا کہ سوائے کاغذ کے کسی دوسری چیز پر نہ لکھا جائے، پھر عام طور سے کاغذ پر لکھنے کا رواج ہو گیا،

اس سے معلوم ہوا کہ فتح سندھ کے وقت (۹۳ھ) تک ہندوستان میں کاغذ نہیں پہنچا تھا، اغلب یہی ہے کہ عہد عباسی میں عرب پہلی دفعہ سندھ میں کاغذ لائے اور یہاں اس کا استعمال ہوا، چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں کی ابتدا تک سندھ میں عربوں کی حکومت رہی اور ان کے نظام حکومت میں باقاعدہ دیوان خراج وغیرہ کا محکمہ تھا، جہاں غالباً وہی عربی کاغذ استعمال میں آتا تھا جو عرب تاجر خراسان اور دوسرے اسلامی ممالک سے لاتے تھے،

چوتھی صدی کے آخر میں شمالی ہند سلاطین غزنہ کے مقبوضات میں شامل ہو گیا، اور اسلامی تجارت کو فروغ ہونے لگا، میرا خیال ہے کہ اسی زمانہ سے اسلامی تاجروں کے ذریعہ خراسانی کاغذ ہندوستان میں داخل ہوا، اور جیسے جیسے اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، اس کاغذ کی تجارت بھی بڑھتی گئی،

چھٹی صدی کے وسط میں ہندوستان میں بھی کاغذ تیار ہونے لگ گیا، چنانچہ ابو حامد غرناطی الموجود ۵۵۵ھ لکھتا ہے:-

وفی سمرقند القراطیس التی عطلت قراطیس مصر لاهل المشرق

اور سمرقند کے کاغذ نے مصر کے کاغذ کو اہل مشرق کے لیے بیکار کر دیا جس طرح مصر نے

كغاطيس مصر دخل المغرب
في بلخ انها شبيهة بالعراق و
خراسان والهند (تحفۃ الالباب ص ۲۰۲)

کاغذ نے مغرب کے کاغذ کو بے کار کردیا تھا، اور
بلخ کا کاغذ عراق، خراسان اور ہندوستان
کے کاغذ کے مشابہ ہوتا ہے،

اس سے اس قدر معلوم ہوا کہ ہند میں کاغذ سازی شروع ہوگئی تھی، اور غالباً اس کی ابتدا لاہور یا دہلی سے ہوئی ہوگی، کیونکہ ابتدا میں یہی دونوں شہر پایہ تخت تھے،

۷۹۶ھ میں سلطان سکندر بت شکن تخت نشین ہوا، اس کے عہد میں کشمیر کو بڑی ترقی ہوئی، اس کی فیاضی اور قدر دانی نے دور دور تک شہرت حاصل کرلی، اور مختلف ملکوں کے باکمال اس کے دربار میں آکر فیضیاب ہوئے، فرشتہ لکھتا ہے،

سلطان سکندر بہ مرتبہ سخاوت داشت
کہ از شنیدن آوازہ آن دانشمندانِ عراق
و خراسان و ماوراءالنہر بہ ملازمتش آمدند
و علم و فضل و اسلام در مملکتِ کشمیر رواج
پیدا کردہ نمونہ عراق و خراسان گردید
(فرشتہ جلد دوم ص ۳۴۱ نولکشور)

سلطان سکندر کی سخاوت کی شہرت اس
درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ عراق و خراسان اور
ماوراءالنہر (بخارا وغیرہ) کے فضلا اس کے
دربار میں حاضر ہوئے، انکے باعث ملک
کشمیر میں علم و ہنر کا بہت زیادہ رواج ہوا،
اور اسلام کی خوب اشاعت ہوئی، یہانتک
کہ کشمیر ملک خراسان اور عراق کا ہم پلہ ہوگیا،

کشمیر| تاریخ کشمیر میں لکھا ہے کہ جب تیمور نے ۸۰۰ھ میں ہندوستان آیا تو سلطان سکندر نے سفارت بھیجکر دوستانہ تعلقات قائم کئے اور حسب ارشاد امیر تیمور اس سے ملنے کے لئے تیاری میں مصروف تھا کہ سیاسی امور کے سبب وہ جلد از جلد ہندوستان سے سمرقند روانہ ہوگیا، اور اس سبب سے سکندر کی اس سے ملاقات نہ ہوسکی، لیکن سکندر کا لڑکا شاہی خان، امیر تیمور گورگانی کے ہمرکاب تھا، اس لئے

اس کو وہ سمرقند لیتا گیا، امیر تیمور کی وفات تک وہ نظر بند کی حیثیت سے رہا، وفات کے بعد گو وہ آزاد ہو گیا تھا، لیکن پھر بھی اس نے اپنا قیام عرصہ تک سمرقند میں رکھا،

شاہی خان کشمیر کے ان بادشاہوں میں سے ہے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی، وہ بڑا عاقل اور مدبر شخص تھا، سمرقند میں رہ کر اس نے علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی، پھر ارباب کمال کی صحبت سے مستفید ہوتا رہا، جب کشمیر واپس ہونے لگا تو اس نے ارباب صنائع کو ساتھ لے لیا، تاکہ کشمیر میں ہر قسم کی صنعت اور کارگیری کا رواج ہو جائے، چنانچہ کاغذ گر، صحاف، قالین باف، زین ساز اور زبان قابلہ کو ساتھ لیتا آیا، اور یہاں پہنچکر اس نے اس کو خوب رواج دیا، تاریخ کشمیر میں ہے،

چندے در سمرقند ماندہ کسب علوم وآداب کرد	کچھ دن سمرقند میں قیام کر کے علوم وآداب
وجمعے از ارباب صنائع مثل کاغذ گر د	حاصل کئے، اور ایک جماعت کارگیروں
صحاف وقالین باف وزین ساز وزنانِ	کی جیسے کاغذ ساز، قالین باف، زین ساز
قابلہ کہ وقت وضع حمل خدمت عورات	اور دایہ جو وضع حمل کرانے میں ماہر تھیں
می کنند باخود بہ کشمیر آورد،	اپنے ساتھ کشمیر لایا،

یہی مصنف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے، جب کہ شاہی خان تخت نشین ہو کر سلطان زین العابدین ہو گیا ہے،

وسلطان بہ حسن نیت واہتمام تمام اوقات	سلطان نیک نیتی اور پوری کوشش سے
خود را مصروف عمارات وآبادی این شہر	اپنے اوقات کو شہر کی آبادی اور عمارتوں
شناخت وصنائع کہ ایران وتوران خصوصاً	کے بنوانے میں مصروف رکھتا تھا اور
خراسان کہ بکشمیر نزدیک تر است بجدت	کارگیروں کو ایران، توران اور خصوصاً

اہتمام فراوان طلبانید، ارباب حرفہ را از مجلد... و کاغذ گر وغیرہ کہ از ولایت با خود آوردہ بود وجہ مدد معاش دادہ بہ حرفہ خود سرگرم داشت

خراسان سے جو کشمیر سے بہت ہی نزدیک ہے، اپنے ملک میں طلب کیا، کاریگروں کو مثلاً جلد ساز کاغذ ساز وغیرہ کو جو دوسرے ملک سے اپنے ساتھ لایا تھا مدد معاش کے لئے دجاگیریں، دیکر اپنے پیشہ کو فروغ دینے میں معاون ہوا[1]

غالباً اسی زمانہ میں کشمیر میں کاغذ کا پہلا کارخانہ جاری کیا گیا کیونکہ اس سے قبل ہندوستان کے کسی صوبہ میں کوئی ایسا کارخانہ تاریخ کے صفحات میں نظر نہیں آتا، اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں کاغذ سازی کا سب سے پہلا کارخانہ کشمیر میں قائم ہوا،

کشمیری قدرتی طور پر ذہین ہوتے ہیں، (اور آج بھی کشمیری برہمن اس وصف میں شہرت رکھتے ہیں) انھوں نے اس صنعت کو بڑی تیزی سے ترقی دنیی شروع کی، یہاں تک کہ چند ہی سال میں یہاں کا کاغذ شہرۂ آفاق ہوگیا، یہ کاغذ اتنا عمدہ اور اعلیٰ ہوتا تھا، کہ بادشاہوں کے پاس بطور تحفہ کے بھیجا جاتا تھا، سلاطین کشمیر میں سلطان زین العابدین جو ۸۲۶ھ میں تخت نشین ہوا، اگلی سر سید تھا، اس کے عہد میں کشمیر اوج کمال کو پہنچ گیا، ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے بادشاہ اس کے ساتھ تبادلۂ ہدایا کرنا سیاسی لحاظ سے اپنا فرض سمجھتے تھے، اور اس کی دوستی کے خواہاں رہتے تھے، چنانچہ سلطان محمود بیگڑہ (گجرات) اور سلطان ابوسعید (خراسان) نے سلطان زین العابدین کو تحفے اور ہدیے بھیجے، سلطان نے بھی اسکے جواب میں کشمیر کے نوادر ارسال کیے، ان تحفوں میں سب سے زیادہ نمایاں کاغذ کا تحفہ تھا، کاغذ خراسان میں خود بنتا تھا

---

[1] واقعات کشمیر قلمی کتب خانہ حبیب گنج، علیگڑہ

اس لئے خراسان والون کے لئے یہ کوئی نادر چیز نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے سلطان ابوسعید والی خراسان کے پاس اس کو بطور تحفہ بھیجنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ کشمیری کاغذ خراسانی کاغذ سے زیادہ بہتر ہوتا تھا، اور اس کا شمار نوادرات میں ہوتا تھا

تاریخ فرشتہ میں ہے،

خاقان ابوسعید شاہ از خراسان اسپان	خاقان ابوسعید نے خراسان سے عمدہ عربی
تازی با پادشتران راہوار و اعلی و	گھوڑے، اور اعلی نسل کے قوی اونٹ
شتران قوی ہیکل بادیہ پیما برائے او	سلطان زین العابدین کو بطور تحفے
ہدیہ فرستاد،	کے بھیجے،
شاہ ازین معنی بسیار خوش حال شدہ	سلطان کو یہ بات بہت پسند ہوئی اس نے
در برابر آن خروارہائے زعفران، و قرطاس	بھی زعفران کے گٹھے، کاغذ، مشک، عطر،
و مشک و عطر و گلاب، و سرکہ و شالہائے	گلاب، سرکہ، خوشنما شالین، شیشے کے پیالے
خوب و کاسہ ہائے بلورین، و دیگر غرائب	اور دوسری نادر چیزین کشمیری صنعت
کشمیر بہ ملازمت خاقان سعید روانہ گردانید	کی خاقان کے پاس روانہ کین،

کشمیر سرد ملک ہے، اس لئے قدرتی طور پر یہان کی ہر چیز میں انجماد کا مادہ موجود رہتا ہے، اور اس انجماد کی وجہ سے کوٹائی کا کام خوب ہوسکتا ہے، غالباً اسی سبب سے یہان کا کاغذ عمدگی میں مشہور تھا، اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ پائدار اور بے حد مضبوط ہوتا تھا،

گجرات نوین صدی کے شروع میں گجرات کا پایہ تخت "احمد آباد" آباد کیا گیا، اور پچاس برس میں اس قدر ترقی کر گیا کہ ہندوستان میں کوئی شہر اس کا مقابل نہین سمجھا جاتا تھا، سلطان

لہ فرشتہ جلد دوم ص ۳۴۴، نول کشور

محمود بیگڑہ کو خصوصیت سے اس کی ترقی کا بڑا خیال تھا، اس کے عہد میں ہر قسم کے اہلِ کمال یہاں جمع ہو گئے تھے، تاریخ کے تتبع سے جہاں تک پتہ چلتا ہے اسی وقت سے یہاں کاغذ کے کارخانے قائم ہوئے اور رفتہ رفتہ اس قدر ترقی ہوئی کہ خاص احمد آباد کے علاوہ پٹن اور کھنبایت میں اس کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے، پٹن (نہروالہ) کے کاغذ کا نام ہی "پٹنی" ہو گیا تھا، جوناگڑھ کی پبلک لائبریری میں تاریخ بنگالہ کی جو قلمی کتاب موجود ہے، وہ اسی پٹنی کاغذ پر لکھی گئی ہے جیسا کہ اس کی آخری تحریر سے ظاہر ہوتا ہے،

کھنبایت میں بھی اس کے متعدد کارخانے تھے، اور ابھی تک وہ محلہ موجود ہے، جہاں کاغذ تیار ہوتا تھا، احمد آباد کاغذ سازی کا مرکز تھا، وہاں اس کثرت سے مال تیار ہوتا تھا کہ ہندوستان کے علاوہ دوسرے دور دراز ملکوں میں بھی جاتا تھا، کاغذ سفیدی اور چکنے پن میں بے مثل ہوتا تھا اور ہندوستان کے کسی صوبہ میں ایسا کاغذ نہ تیار ہوتا تھا، موٹے باریک مختلف سائز کے کاغذ تیار کئے جاتے تھے، رنگین کاغذ بھی مختلف اقسام کے بنتے تھے، بادامی رنگ کے کاغذ کا استعمال زیادہ تر تجارتی روزنامچوں اور آمد و خرچ کے حساب میں کیا جاتا تھا، گو یورپ کی ارزان تجارت نے اس صنعت کو فنا کر دیا، مگر گجراتی بنیوں اور تاجروں کی بدولت بادامی کاغذ کی صنعت آج بھی زندہ ہے، اور اس کے متعدد کارخانے احمد آباد میں موجود ہیں، ان کارخانہ والوں کو "کاغذی" کہتے ہیں، اس لفظ نے اتنی شہرت حاصل کی کہ متعدد خاندانوں کے نام ہی کاغذی ہو گئے، اور اب وہ اسی اَنک (خاندانی نام) سے شناخت کئے جاتے ہیں، ان کا ایک خاص محلہ احمد آباد میں آباد تھا، جو کاغذی ہی کے نام سے مشہور تھا، زرافشان کاغذ بھی احمد آباد میں بنایا جاتا تھا، اس کے نمونے اب بھی ملتے ہیں، احمد آباد کی پیر محمد شاہ لائبریری میں بعض چھوٹی تقطیع کی کتابیں اسی

کاغذ پر لکھی ہوئی موجود ہیں، اس وقت تک قدیم زرافشان کاغذ کے جس قدر نمونے میری نظر سے گذرے افسوس ہے کہ ان میں کوئی خاص خوبی مجھے نظر نہ آئی، یا اس فن کا ماہر نہ ہونے کے سبب خوبی معلوم نہ کرسکا،

احمد آباد کے کاغذ کی خاص خوبی اس کی سپیدی اور چکناپن ہے، مراۃ احمدی میں ہے!

کارخانہ قرطاس، ہرچند کہ کاغذ	کاغذ سازی کے کارخانے اگرچہ دولت آبادی
دولت آبادی وکشمیری خوش قماش	اور کشمیری کاغذ بہت ہی عمدہ ہوتا ہے
نیکو وارد، امابہ سفیدی وبیاض	لیکن سفیدی اور چمک میں احمد آبادی
ساخت احمد آبادنمی رسد، وچندیں نوع	کاغذ کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اور یہ مختلف
ازاں بہ عمل می آوند[1]	قسم کے تیار کیے جاتے ہیں،

لیکن بڑا عیب اس کاغذ میں یہ ہوتا ہے کہ بننے کی حالت میں اس میں غیر محسوس طور سے چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں، اس کا سبب احمد آباد کی جائے وقوع ہے، جو ریگستان میں آباد ہے، مصنف مراۃ احمدی لکھتا ہے،

ازانجاکہ این دیار ریگ بوم شدہ درہنگام	چونکہ یہ ملک ریگستان میں آباد ہے؛
ساختن ذرات رملی کہ بہ خمیرش درمی آید	اس لئے کاغذ بناتے وقت ریت کے
وقت مہرہ کشی بیروں می رود، وسوراخہائے	ذرے اس کے خمیر میں گھس جاتے ہیں، اور
نامحسوس بہم می رسد معیوب است[2]	پھر چکنا کرتے وقت خشک ہو کر باہر نکل آتے
	اور غیر محسوس سوراخ ہو جاتے ہیں، جو معیوب ہے

اس عیب کے باوجود اس کی سفیدی، خوشنمائی اور چکنے پن کی وجہ سے اس کی مانگ

---

[1] مراۃ احمدی ص۱۱ بمبئی [2] ایضاً،

بہت بڑھی ہوئی تھی، اور عرب و روم تک جاتا تھا، اور اس سے تاجر معقول فائدہ اٹھاتے تھے. مرأۃ احمدی میں ہے کہ،

و ہر سالہ بنا بر سفیدی نوشش مبلغہا از اطراف بلاد ہند و عرب و روم وغیرہ چون کاغذ زر می برند.[1]

اور کاغذ کی سفیدی کے سبب ہر سال رون روپئے کے کاغذ ہند و عرب اور روم میں نوٹ کی طرح تاجر برآمد کرتے ہیں،

دولت آباد عہد مغلیہ میں عمدہ کاغذ کا ایک اور بڑا مرکز دولت آباد ہو گیا.[2] یہاں کا کاغذ بھی پائداری میں کشمیر ہی کی طرح مشہور تھا اور غالباً تمام جنوبی ہند میں اسی جگہ سے تاجر کاغذ لے جاتے تھے، اس کا مفصل ذکر آگے آتا ہے،

بہار صوبہ بہار میں بھی اس کا کارخانہ موجود تھا، پایہ تخت عظیم آباد اس کی منڈی تھی، اور اس منڈی سے یہ مال صوبہ کے دوسرے حصوں میں جاتا تھا.

سجان رائے صوبہ بہار کے متعلق بعض تفصیلات کے ضمن میں لکھتا ہے،

کاغذ خوب می شود،

پٹنہ میں کاغذ اچھا ہوتا ہے[3]

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ کاغذ خاص عظیم آباد میں تیار نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس سے تھوڑے فاصلہ پر قصبہ بہار میں بنایا جاتا. چنانچہ احمد آباد کی طرح وہاں بھی کاغذی محلہ آج تک موجود ہے، اور اس محلہ کے اصلی باشندوں کو اس وقت بھی کاغذی کہتے ہیں، یہاں سے کاغذ تیار ہو کر پٹنہ جاتا تھا اور چونکہ عظیم آباد (پٹنہ) کاغذ کی منڈی تھی اس لیئے اس کی نسبت پٹنہ کی طرف ہو گئی، اس قسم کی مثالیں ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں بکثرت موجود ہیں، لاہوری نمک کی نسبت لاہور کی طرف ہے، حالانکہ دراصل وہ کوہِ سلیمان سے نکلتا ہے، لاہور منڈی

---

[1] مرات احمدی ص ۸۰ ایجنی [2] مملکت بیجاپور ص ۲۹۱ حصہ سوم [3] خلاصۃ التواریخ بیان صوبہ بہار در مقدمہ علمی ادارۃ المصنفین

ہونے کی وجہ سے اس کی نسبت لاہور کی طرف کر دی گئی،

پٹنہ عظیم آباد (بہار) کا کاغذ سبحان رائے کی تحریر کے بموجب اچھا ہوتا تھا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی تھی یہی سبب ہے کہ اس کے متعلق کسی خاص وصف کا ذکر کہیں نہیں ملتا،

گیا پٹنہ کی طرح ضلع گیا میں بھی کاغذ تیار ہوتا تھا، "اروَل" میں جو جہان آباد سے مغرب جانب تقریباً بیس میل پر واقع ہے، کاغذ بنانے کے بے شمار کارخانے تھے،

ایسٹ انڈیا کمپنی نے صوبہ بہار پر قبضہ کرنے کے بعد کاغذ کا ٹھیکہ ان ہی کارخانہ داروں کو دیا تھا، ان کی نسل آج بھی موجود ہے[1]، غلام حسین خان طباطبائی لکھتے ہیں کہ

"و کاغذ در موضع اروَل و بہار خوب بہم می رسد اکنون ہم می سازند، و اگر کار فرمائی بہم رسد و زرے خرچ کنند، شاید کہ بہتر از آن می ساختہ آید"[2]

بنگال زمانہ گذشتہ میں بنگال بھی اس صنعت کا اہم ترین مرکز تھا، اور وہاں کاغذ سازوں کی پوری جماعت آباد تھی، جو آج بھی کاغذیوں کے نام سے مشہور رہے، اور اب انھوں نے اپنے موروثی پیشہ کو ترک کر کے کسبِ معیشت کے دوسرے ذرائع اختیار کر لئے ہیں، لیکن اب بھی کچھ لوگ اچھے قسم کا دستی کاغذ تیار کرتے رہتے ہیں، اگرچہ اس کی مالیت سال میں چند سو روپیے سے زیادہ نہیں ہوتی،

مرشد آباد بنگال میں ہوگلی اور مرشد آباد کے اضلاع میں کاغذیوں کی تعداد زیادہ رہی ہے، ہوگلی کے کاغذیون کے برخلاف مرشد آباد کے کاغذی کاغذ بنانے کے لئے زیادہ تر ردی کاغذ استعمال کرتے تھے، اور اس کے لئے دفتری کی دوکانوں کے کاغذ کی کترن بہترین

---

[1] اس واقفیت کیلئے محبی مولوی ریاست علی صاحب ندوی سابق رفیق دار المصنفین کا شکر گذار ہون، [2] سیر المتاخرین جلد اول صـ۱۲ نولکشور،

مصالحہ ثابت ہوتی ہے کبھی کبھی جوٹ اور ٹاٹ وغیرہ کے بوسیدہ ٹکڑے بھی استعمال ہوتے ہیں،

کاغذ سازی کی ترکیب بنگال میں اس صنعت کو لوگ اب بھی بطور پیشہ کے اختیار کرتے ہیں، کاشتکاری سے فراغت کے زمانہ میں ان کا جو وقت بچتا ہے، اسے وہ کاغذ سازی میں صرف کرتے ہیں، احمد آباد کی طرح ان کا تیار کردہ کاغذ زیادہ تر تاجر بہی کھاتوں کے مصرف میں لاتے ہیں اس طرح ایک کاغذی خاندان سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پیدا کر لیتا ہے، مرشد آبادی کاغذی، کاغذ اسطرح تیار کرتے ہیں کہ کاغذ کی تقریباً دس سیر کترن ایک حوض میں ڈال کر سڑاتے ہیں جس کو "ڈابہ" کہتے ہیں، اور اس کو گلانے کے لئے اس میں چونے کی تھوڑی مقدار ملا دیتے ہیں چند دنوں کے بعد نچوڑ کر اس کا پانی نکال دیتے ہیں، اور "ڈھیکی" سے خوب کوٹ کر ایک مسطح اور کھردرے طباق پر پھیلا دیتے ہیں جس کو "مجلس" کہتے ہیں، اور پھر اس کو دبا کر اس کا پانی نکال لیتے ہیں، اس کے بعد سوجی ملا کر چونے کے سلوشن میں دو تین دن رکھتے ہیں، پھر کینوس کی چادر پر ڈال کر صاف پانی سے خوب دھوتے ہیں، گودے کو پانی سے بھری ہوئی ناند میں ڈال کر ہاتھوں سے ملتے ہیں اور ایک بہت باریک کھپاچوں کی چھلنی جو لکڑی کے فریم میں ہوتی ہے ناند میں ڈال دیتے ہیں، گودے کے ذرے اس کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں جمع ہو کر ان کی ایک پتلی سطح چھلنی پر جم جاتی ہے پھر چھلنی کو ناند سے نکال کر فریم سے جدا کرتے ہیں، اور اسے کاغذ کے ایک تختہ پر رکھ کر آہستہ آہستہ دباتے ہیں، اس کے بعد چھلنی کو احتیاط سے اٹھا لیتے ہیں، اور کاغذ کا نیا بنا ہوا تختہ جم جاتا ہے، اب اس تختہ کو احتیاط سے اٹھا کر دھوپ میں چٹائی پر خشک کرتے ہیں، خشک ہو جانے پر اس کے کنارے تراشتے ہیں، اور نشاستہ کا سلوشن یعنی مانڈی لگا کر دوبارہ اچھی طرح خشک ہونے کے لئے رکھ دیتے ہیں، خشک ہو جانے پر کاغذ کو لکڑی کے ایک تختہ پر پھیلا کر پتھر کی گول بٹیوں سے خوب رگڑ کر جلا دیتے ہیں جس سے کاغذ چکنا ہو کر ہموار ہے

فروخت کے لائق ہو جاتا ہے[1]

جون پور | صوبہ اودھ میں جون پور سے متصل ظفر آباد ایک مشہور قصبہ ہے جو کسی زمانہ میں بجائے جون پور کے حاکم نشین جگہ تھی، اس کو لوگ کاغذی شہر کہتے تھے، یہاں بانس کا کاغذ بہت عمدہ پائدار اور چکنا ہوتا تھا، عموماً یہاں کاغذ دو قسم کا بنتا تھا، ایک آہار دیا ہوا بہت چکنا، دوسرے بغیر آہار کے (غیر مہرشدہ) کتابوں کی نقل اور تصنیف عموماً قسم اول کے کاغذ پر ہوتی یہ پائدار سفیدی مائل ہوتا تھا تاجروں کا بہی کھاتہ آج سے پچاس برس قبل تک اسی کاغذ پر ہوتا[2]، بغیر آہار والا کاغذ ذرا سبز ہوتا، اس کو بنارس کے ریشم فروش تھانوں کی حفاظت کے لئے بکثرت استعمال کرتے تھے، اس وقت بھی ظفر آباد میں ایک محلہ "کاغذی محلہ" کے نام سے مشہور ہے، جونپور کے لوگ ابھی تک اس شہر کو "کاغذی شہر" کہتے ہیں، یہاں سے کاغذ کی برآمد بہت ہوتی تھی، اور اسی لئے اس تجارت میں بہت زیادہ نفع سمجھ کر بکثرت لوگ مشغول ہو گئے تھے،

پنجاب | اس صنعت میں پنجاب بھی کسی صوبہ سے پیچھے نہ رہا، سیالکوٹ میں کاغذ سازی کے متعدد کارخانے تھے، اور اس میں مختلف قسم کے کاغذ تیار کئے جاتے تھے، جن کے علحدہ علحدہ نام تھے،

یہ کاغذ سفید اور مضبوط ہوتا تھا، اور غالباً پنجاب کے پورے صوبہ میں یہیں کا کاغذ استعمال کیا جاتا تھا، کیونکہ سیالکوٹ کے علاوہ پنجاب میں اور کسی دوسرے کارخانہ کا وجود کسی تاریخ میں نظر نہیں آتا،

---

[1] ملخص از رسالہ ریاست دہلی ۹ نومبر ۱۹۳۶ء [2] ان معلومات کے لئے میں مولانا ابو بکر شیث صاحب جونپوری مرحوم سابق ناظم دینیات علی گڈھ یونیورسٹی کا ممنون ہوں،

کاغذ کے نامون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کارخانہ جہانگیر کے عہد یا اس سے قبل ہی قائم ہو چکا تھا سجان رائے سیالکوٹ کے حالات میں تحریر کرتا ہے،

و درین شہر کاغذ نیکو می شود خصوص کاغذ	اور یہان کاغذ اچھا ہوتا ہے، خاص کر
مانسنگھی، و نیم حریری، و خاصۂ جہانگیری	مانسنگھی نیم حریری، اور خاصۂ جہانگیری
بس نیک تر قماش و سفید و صاف و	بہت ہی عمدہ، سفید، صاف، اور مضبوط
دیرپا می سازند[1]	بناتے ہیں،

امراے اکبری میں راجہ مانسنگھ ایک ممتاز شخص تھا، غالباً اسی کے نام سے یہ کاغذ منسوب کیا گیا تھا، اسی طرح خاصۂ جہانگیری، جہانگیر بادشاہ کے نام سے روشناس عالم ہوا،

افسوس ہے کہ اس مورخ نے ان مختلف قسم کے کاغذون کے علٰحدہ اوصاف نہیں لکھے، لیکن جہانگیر کی رنگینی اور جدت پسندی کو دیکھتے ہوئے یہ خیال گذرتا ہے کہ خاصۂ جہانگیری، خاص قسم کا کوئی اعلیٰ درجہ کا کاغذ ہوگا،

جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا ہے، ہندوستان میں بجائے کاغذ کے جہان بھوج پتر اور تاڑ کے پتے استعمال میں لائے جاتے تھے، وہان بعض جگہ سپید ریشمی کپڑے بھی مستعمل تھے، اس وقت کاغذ کا کوئی کارخانہ نہ تھا، اب جب کہ متعدد کارخانے کاغذ سازی کے قائم ہو گئے، تو قدرتی طور پر ہندوستانیون کا ذہن اس ریشم کی طرف منتقل ہوا ہوگا، اور میرے خیال میں اسی کا نتیجہ "نیم حریری" کاغذ ہے، نیم (نصف) کے لفظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سوتی اور ریشمی ملا ہوا کپڑا بنایا جاتا ہے اسی طرح ریشم اور روئی کی ملاوٹ سے یہ کاغذ تیار کیا جاتا تھا، یہ کاغذ ریشم کے سبب سے نرم، چکنا، اور مضبوط ہوتا ہوگا، جیسا کہ مراکو کا چمڑے کا

---

[1] خلاصۃ التواریخ قلمی دار المصنفین در مقدمہ

بنا ہوا کاغذ مشہور ہے، اور یہ ریشم ہی کے سبب سے بہت ہی پتلا کاغذ بھی آجکل کے نوٹون سے زیادہ پائدار اور مضبوط رہتا ہوگا، ٹیپو سلطان کے عہد میں میسور مین بھی کاغذ سازی کا کارخانہ تھا، جہان خاص طور سے کاغذ پر سونا چڑھایا جاتا تھا، (تاریخ میسور ص ۳۲۰ مطبوعہ بنگلور)

کاغذ کے نمونے اور انکی قسمین | قدیم ہندوستانی کارخانون کے بنے ہوئے، کاغذون کے نمونون کو کسی ایک جگہ تلاش کرنا اور ان کا مل جانا بہت دشوار ہے لیکن خوش قسمتی سے نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کے کتب خانہ حبیب گنج مین مختلف قسم کے نمونے مجھے دستیاب ہوگئے، مولانا موصوف کی ذات تعارف سے بالاتر ہے، موصوف کو قدیم صنعت کے اعلیٰ نمونون کا شوق نہیں بلکہ عشق ہے، اسی لئے آپ کے پاس ہر قسم کے صنعتی نمونے موجود ہیں، کاغذون کے نمونے محفوظ طریقہ سے شیشہ مین بند ہیں، اور ہر نمونہ کے سامنے اُردو اور انگریزی میں اس کے مختصر اوصاف تحریر ہیں، راقم الحروف مزید اضافہ کے ساتھ ضبط تحریر میں لاتا ہے

احمد آبادی | اس کے بیشمار نمونے میری نظر سے گذرے، اس میں موٹے، دبیز، باریک اور بہت ہی باریک ہر قسم کے ہیں، بعض سنہرے اور زرافشان بھی نظر سے گذرے، یہان کے کاغذ کی خصوصیت جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، سفیدی اور چکنائی ہے، یہان کی جیسی سفیدی تمام ہندوستان کے کسی کارخانہ میں نہیں ہوتی تھی،

حبیب گنج کے کتب خانہ میں جو نمونہ احمد آبادی کاغذ کا نظر سے گذرا وہ ذرا دبیز اور معمولی سفیدی لئے ہوئے تھا، شاید زیادہ دنون کا ہو جانے کے سبب سے اس کی سفیدی کم ہوگئی ہے، یا قدرتی طور پر اسی رنگ و وضع کا کاغذ بنایا ہی گیا ہو،

کشمیری | کشمیری کاغذ بہت اعلیٰ ہوتا تھا، اس کے بھی مختلف اقسام تھے، بعض باریک،

بعض دبیز کچھ کارخانے ریشمی باریک تیار کرتے تھے، یہان کی اصلی خصوصیت چکنائی اور مضبوطی تھی، غیر ملکون میں بھی اس کی بڑی کھپت تھی، لوگ یہان سے بکثرت باہرے جاتے تھے، حبیب گنج کے کتب خانہ میں اس کاغذ پر لکھی ہوئی متعدد قلمی کتابیں موجود ہیں جس سے صحیح طور پر اس کا اندازہ ہوتا ہے،

حبیب گنج میں اس کے جو نمونے نظر سے گذرے وہ سادہ ریشمی گہرے اور ہلکے رنگین حنائی ہیں، لفظ ریشمی کے متعلق میں اوپر مفصل لکھ چکا ہون لیکن یہان اس سے مراد باریک ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں ریشم کی طرح نرم اور باریک کو "ریشمی" کہنے لگے تھے، کیونکہ ریشمی کے جس قدر نمونے نظر سے گذرے کسی میں بھی ریشم کا جز بظاہر نظر نہیں آیا، اس لئے خیال گذرتا ہے کہ محض مشابہت کی بنا پر اس کو ریشمی کہنے لگے تھے،

جہانگیری | غالبًا یہ صرف سیالکوٹ میں تیار ہوتا تھا، جیسا کہ سجان (سجن رائے) رائے نے لکھا ہے، کیونکہ اور کسی صوبہ میں اس نام کا کاغذ بنایا جانا کسی تاریخ میں نظر سے نہین گذرا، اس کا نمونہ جو حبیب گنج میں دیکھا وہ چکنا، باریک، مہرہ شدہ، سفید خفیف نیلاپن لیے ہوئے تھا، اسی قسم کا ایک دوسرا نمونہ خاکی رنگ کا تھا جس میں خفیف سفیدی تھی،

حیدرآبادی | حیدرآباد میں بھی کاغذ تیار کیا جاتا تھا، ایک محلہ میان مشک میں، اور دوسرا کاغذی گوڑا میں، اس کے جو نمونے میری نظر سے گذرے مجھے ان دونون میں کوئی فرق نظر نہ آیا، شاید ارباب فن کے نزدیک اس میں کوئی فرق ہو، دبیز اور باریک دونون قسم کے ہیں، رنگ کے اعتبار سے ایک خاکی اور دوسرا سفیدی مائل ہے، اور دونون غیر مہرہ شدہ ہیں اسی قسم کے کاغذون کے سات نمونے دیکھے، جو قطب شاہی سلاطین کے عہد میں تیار کئے گئے تھے، اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر بادشاہ کے عہد میں جو کاغذ تیار ہوا

اس کا علٰحدہ علٰحدہ نمونہ دکھایا ہے لیکن ان میں باہم ایک ماہر فن ہی امتیاز کر سکتا ہے، ان میں سے بعض بھورے رنگ کے مہرہ شدہ ہیں، اور کچھ احمد آبادی کاغذ کے مثل ہیں،

فیض آبادی | کسی کتاب میں فیض آباد کے متعلق نظر سے نہیں گذرا کہ وہاں کاغذ کا کارخانہ تھا لیکن حبیب گنج کے کتب خانہ میں جو نمونہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہاں بھی یہ کام ہوتا تھا، نمونہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مہرہ کئے ہوے اوسط درجہ کا زردی مائل کاغذ بنتا تھا، اور بعض مہرہ شدہ گہرا پن لئے ہوئے تیار کیا جاتا تھا

کانپوری | یہ معمولی کاغذ بانس سے تیار کیا جاتا تھا، اپنے ماقبل سے بھورے پن میں کم ہوتا تھا، بلکہ اس کو خاکی رنگ لئے ہوئے تو زیادہ مناسب ہوگا،

دولت آبادی | دولت آباد میں کاغذ کے بے شمار کارخانے تھے، اور اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ یہاں کے کاغذوں کے اقسام بہت ہیں، جو زیادہ تر مخصوص ناموں سے شہرت پذیر ہیں، غالبًا کتابوں اور عوام میں صرف اُن ہی کی یاد باقی رہ گئی جو کسی خاص وجہ سے بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے، یہاں کے کاغذ میں خاص وصف تو چکنائی اور پائداری ہے لیکن تنوع کے لحاظ سے بھی یہ مختلف قسم کے تھے،

بہادر خانی | اس نام کا کاغذ خاص دولت آباد میں تیار کیا جاتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کاغذ اس وقت سے تیار ہونا شروع ہوا، جب کہ "بہادر خان" گجراتی نے دولت آباد پر قبضہ کیا، (۹۳۹ھ) اور بعض کارخانہ والوں نے اس کے نام سے فائدہ اٹھانے کے لئے، اس قسم کا کاغذ تیار کیا، یا بہت ممکن ہے کہ خود بہادر شاہ نے ہی اس کا حکم دیا ہو، کیونکہ اس کو اس قسم کے کاموں کا خاص شوق تھا، چنانچہ اس نے ایک توپ تیار کرائی جس کا نام بہادر شاہی رکھا، ایک خاص قسم کے کپڑے کا نام بھی بہادر شاہی ہے لیکن یہ صرف میرا قیاس ہے،

ورنہ ہو سکتا ہے کہ "بہادر خان" اس کارخانہ کے مالک کا نام ہو، اور اس نے اپنے نام سے اس کاغذ کو شہرت دی ہو، یہ کاغذ معمولی اوسط درجہ کا ذرا دبیز ہے، اور مضبوطی میں کسی دوسرے سے کم نہیں،

صاحب خانی | دولت آبادی میں اس کا کارخانہ تھا، اور غالباً صاحب خان اس کے موجد تھے، اسی لئے اس کو صاحب خانی کہا گیا، اوسط درجہ کا دبیز کاغذ ہے،

مراد شاہی | اس کا بھی یہی حال ہے، دبیز قسم کا اچھا کاغذ ہے، دولت آباد ہی میں اس کا کارخانہ تھا، غالباً مراد شاہ بن اکبر بادشاہ کے نام پر جب کہ وہ دکن میں مقیم تھا، یہ کاغذ تیار کیا گیا، یا ممکن ہے کہ خود مالک کارخانہ کا نام "مراد شاہ" ہو اور اپنے نام سے اس نے کارخانہ کو رونق دی ہو، جیسا کہ آج کل بھی ہوتا ہے،

شربتی | دولت آباد میں ایک اور قسم کا کاغذ بنتا تھا، اس کا نام "شربتی" کاغذ ہے، یہ بھی دبیز اور اچھے قسم کا کاغذ ہے، جو نمونہ مین نے دیکھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کاغذ اپنے ماقبل سے کسی اور خصوصیت میں تو ممتاز نہیں ہے، بجز اس کے کہ اس کا رنگ شربتی ہے،

قاسم بیگی | دولت آباد میں ایک صاحب قاسم بیگ تھے جنھوں نے اپنے کارخانہ میں ایک خاص قسم کا کاغذ بنوانا شروع کیا، یہ دبیز اور سرخ رنگ کا ہوتا، لوگون نے غالباً اس کا نام ہی قاسم بیگی رکھ دیا، یہ کاغذ مختلف قسم کا ہوتا تھا، بعض معمولی دبیز اور بعض باریک اور بعض موٹا مگر رنگ غالباً سب کا سرخ ہی ہوتا تھا، جو نمونہ میری نظر سے گذرا اس میں ہلکی سرخی تھی، سرخی کا ہلکاپن یا تو اس کا اصلی رنگ ہے، اور یا امتداد زمانہ سے ہلکا پڑ گیا ہو،

ان کے علاوہ قاسم بیگی کاغذ کے تین اور نمونے بھی علحدہ علحدہ نظر سے گذرے جن میں بظاہر مجھے کوئی فرق نظر نہ آیا، بہت ممکن ہے کہ ماہرانِ فن ان سب میں فرق محسوس کرتے ہوں،

بالاپوری | یہ کاغذ چار پانچ قسم کا تیار ہوتا تھا بھورے رنگ کا سفید رنگ کا جو معمولی ہوتا اس سے زیادہ سفید رنگ کا اور ایک خاص قسم کا تیار ہوتا، جو بہت ہی سفید اور صاف ہوتا لیکن احمد آباد کے کاغذ کی طرح اس میں چکنا پن نہ ہوتا تھا،

معلوم نہیں کہ بالاپور دولت آباد کے کسی محلہ کا نام تھا، یا کسی دوسری جگہ کا نام تھا، اغلب یہی ہے کہ دولت آباد کے متصل ہی کوئی جگہ ہوگی، جہاں اس قسم کے کاغذ تیار ہوتے ہونگے،

روبکاری | اس نام کا بھی کارخانہ غالباً دولت آباد ہی میں تھا، جہاں بھی اس نام کا کاغذ چار پانچ طرح کا تیار ہوتا تھا، غالباً دفاتر میں اس کی زیادہ کھپت تھی، اسی لئے اس کا نام "روبکاری" رکھا گیا،

غیر ملکی | اکثر کتب خانوں میں دو تین قسم کے اور کاغذ نظر سے گذرے گو وہ ہندوستانی کارخانوں کے نہیں ہیں، لیکن صرف اس لئے میں ان کو تحریر کر دیتا ہوں تاکہ ان کی شناخت ہو جائے اور ملکی اور غیر ملکی کاغذ میں ناظرین فرق معلوم کر سکیں،

سمرقندی | یہ کاغذ ملگجی رنگ کا کافی دبیز ہوتا تھا، اس قدر دبیز کہ ہاتھ میں لینے کے ساتھ ہی اس کی دبازت محسوس ہوتی ہے، ان میں سے زیادہ غیر مہرہ شدہ ہیں، اسی لئے اس میں خفیف سا کھردرا پن رہ جاتا ہے، ہندوستان میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم ہونے سے پہلے غالباً یہی کاغذ زیادہ تر یہاں آتا تھا، اسی لئے اس کاغذ کے جس قدر نمونے نظر سے گذرے ان میں سے اکثر قدیم کتابوں کے ہیں، یہاں کے کاغذ کی دوسری قسم دبیز، چکنا، سفید بادامی رنگ لئے ہوئے ہے،

اصفہانی | یہ کاغذ مختلف قسم کے ہوتے تھے بعض باریک، اس کا اصلی رنگ حنائی ہے، زیادہ تر اسی رنگ کا تیار ہوتا تھا لیکن اور مختلف رنگوں کے نمونے بھی نظر سے گذرے، ایران کے

پایہ تخت اصفہان میں اس کے کارخانے غالبًا دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں تھے، جب کہ صفوی خاندان برسرحکومت تھا، اور ایران کی صنعت وحرفت عروج پر تھی،

خان بالغ | اس لفظ کی تشریح یہ ہے کہ قبلائی خان نے جو چنگیز کا پوتا تھا، جب چین مکمل طور پر فتح کرلیا تو یہاں ایک نیا شہر بساکر پایہ تخت قرار دیا، اور اس کا نام خان بالغ رکھا، اسی کو آج پیکن کہتے ہیں[۱]، اسی کے نام سے یہ کاغذ مشہور ہوگیا جب سے معلوم ہوا کہ اس قسم کا کاغذ خالص چینی تھا، یہ کاغذ دو قسم کا ہوتا تھا، ایک دبیز جس کا رنگ زیادہ تر حنائی ہوتا، اس کی دبازت اس قدر زیادہ ہوتی کہ ہاتھ میں لینے سے بالکل مشق حروف کی وصلی معلوم ہوتی، اسی لئے اس قسم کے کاغذ کی کتاب ذرا وزنی ہوتی ہے،

اس کاغذ کی دوسری قسم حریری یعنی باریک ہے، یہ نرم اور مہرہ شدہ ہوتا، اس لئے اس میں ذرا چکنا پن رہتا، باریک ہونے کے باعث وزن میں ہلکا ہوتا،

---

[۱] صحیفہ چین ص۱۱۳، دہلی،

کتب خانے

از مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مؤلف تاریخ گجرات وغیرہ

دوسری قوموں کی طرح ابتدا میں ہندوؤں میں بھی لکھنے کی رسم نہ تھی، بھوج پتر کی ایجاد اور چینیوں کے ریشمی کپڑے کی آمد کے بعد یہاں لکھنے کا رواج شروع ہوا، ابتدا میں وید، مہابھارت، گیتا وغیرہ مذہبی کتابیں لکھی گئیں، لکھنے پڑھنے والوں کا خاص فرقہ برہمنوں کا تھا، جس کا بڑا وقت پوجا پاٹ، قربانی اور تعلیم میں صرف ہوتا، اور یہ سب کام مندروں یا مندر سے متعلق عمارتوں میں انجام پاتے، چنانچہ ان کی لکھی ہوئی کتابیں بھی انہی مقامات میں ہوتیں،

برہمنوں کے بعد جب بدھوں کا دور آیا، تو انھوں نے مندروں کے علاوہ خاص قسم کی خانقاہیں تعمیر کرائیں، تعلیم و تربیت، طالب علموں اور معلموں کا قیام انہی میں ہوتا، اور انہی کے ایک حصہ میں کتب خانہ ہوتا جس کو "پستک بھنڈار" کہتے تھے،

مشہور چینی سیاح ہونگ شیانگ جب ہندوستان آیا ہے، (۶۲۳ھ) تو اس نے ہر خانقاہ میں ایک کتب خانہ دیکھا، راج گڑھ کے پاس مشہور دار العلوم نالندہ میں جو کتب خانہ تھا، اس سے بہت سی کتابیں نقل کر کے وہ اپنے وطن چین ساتھ لے گیا،[1] یہ کتب خانہ عرصۂ دراز تک قائم رہا،

---

[1] سفر نامہ ہونگ شیانگ سوانالندہ ص، ۵ لاہور،

یہان تک کہ محمد بن بختیار خلجی نے راج گڑھ فتح کرلیا[1]، اس وقت برہمنون کی نادانی سے یہ کتب خانہ ضائع ہوگیا، اس کے علاوہ پاٹلی پتر (پٹنہ)، اجین (مالوہ) بھروچ (گجرات)، متھرا اور بنارس وغیرہ میں بھی بہت سے کتب خانے تھے، مندرون میں جو کتب خانے تھے، ان میں سے بعض فیروز شاہ تغلق کے عہد میں مسلمانون کو دست یاب ہوئے، چنانچہ جوالہ مکھی کے مندر میں ایک ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں جن میں سے بعض کا ترجمہ بھی فیروز شاہ تغلق نے کرایا تھا[2]،

تغلق کے زمانہ میں کتب خانہ سلطان محمد شاہ تغلق متوفی ۷۵۲ھ ہندوستان کے ان بادشاہون میں سے ہے جس کا حال ملکی اور غیر ملکی دونون مورخون نے لکھا ہے، اس کا دربار علماء، فضلاء، شعراء اور ادیبون سے معمور تھا، سعد منطقی، عبید اور بدر چاچی شاعر، ضیاء برنی مورخ، مولانا عضد الدین، مولانا ناصر الدین، ملک غازی فقیہ شاعر، قاضی نغر ہین، مولانا رکن عالم، مولانا نصیر الدین چراغ دہلوی، جیسے یگانۂ روزگار اس کے دربار کے روشن ستارے تھے قلقشندی نے لکھا ہے کہ محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے[3]،

خود محمد تغلق کی نسبت مورخین لکھتے ہیں کہ تقریر فصیح اور کلام شیرین کرتا تھا، عربی اور فارسی میں مراسلات فی البدیہہ لکھتا، نہایت خوشخط اور بڑا طباع اور ذہین تھا، ابتدائی باتون سے لوگون کا مافی الضمیر سمجھ لیتا، حافظہ اس قدر قوی تھا کہ ایک بار جو سن لیتا عمر بھر نہ بھولتا، فن تاریخ کا ماہر تھا، فلسفہ سے خاص رغبت تھی، طب، نجوم، ریاضی منطق میں کمال رکھتا تھا[4]، یہ ظاہر ہے کہ جو بادشاہ زیور علم سے اسقدر آراستہ اور علم کا ایسا قدردان ہو اس کے پاس کتب خانہ بھی ضرور ہوگا، لیکن مورخون کی ستم ظریفی دیکھیے کہ انھون نے اس کی ۲۵ سالہ سلطنت کے ایک ایک خط و خال کا نقشہ کھینچا ہے، مگر کتب خانہ کا نام تک نہین لکھا، اس کی وجہ یہ ہے، کہ اس زمانہ

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۴۸ کلکتہ [2] فرشتہ ج اول ص ۱۴۳ نولکشور، [3] صبح الاعشی ج ۵ ص ۶۹ [4] فرشتہ اول حالات محمد تغلق،

میں کتب خانے مسجدوں اور خانقاہوں میں ہوتے تھے ،

نظام الدین اولیاء کا کتب خانہ | چنانچہ اسی زمانہ میں یعنی علاؤ الدین خلجی سے لیکر سلطان محمد تغلق کے عہد تک ، دہلی کے مشہور بزرگ نظام الاولیاء حضرت نظام الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۷۲۵ھ کی خانقاہ میں ایک بڑا کتب خانہ تھا ، آپ کی خانقاہ دہلی (قدیم) کے محلہ غیاث پور میں تھی ، (اور آج بھی وہیں ہے ، مگر اب اس محلہ بلکہ کل آبادی کو جو اس جگہ ہے بستی نظام الدین کہتے ہیں ،

آپ کی خانقاہ کا کتب خانہ وقف تھا ، اور ہر صاحب علم بلا امتیاز اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایک جگہ شیخ سراج الدین عثمان کے حالات میں لکھتے ہیں ،

وبعد ازان پیش مولانا رکن الدین کافیہ ومفصل وقدوری ومجمع البحرین تحقیق کردہ وبعد از نقل شیخ نظام الدین تس سہ سال دیگر تعلیم کرد وبعضے کتب از کتب خانہ شیخ کہ وقف بود وجامہ وخلافت نامہ کہ از خدمت شیخ یافتہ بود با خود برد[۱]،

فیروز شاہی کتب خانہ | سلطان محمد کی طرح سلطان فیروز شاہ تغلق متوفی ۷۹۰ھ بھی صاحب علم اور صاحب تصنیف تھا فتوحات فیروزی اس کی مشہور تصنیف ہے ، علم کا بڑا قدردان تھا ، اور اس کا دربار علماء ، فضلاء ، شعراء ، اور دوسرے اصحاب کمال سے بھرا رہتا ، ضیاء برنی اور عفیف سراج جیسے مورخ اور ادیب مطہر ہندی جیسے شاعر ، تاتار خان جیسے عالم اور مفسر علماء سے اسکا دربار آراستہ تھا ، اس نے اپنے زمانہ میں بڑی بڑی مسجدیں اور مدرسے بنوائے ، اور ان کے مصارف کے لئے ہزاروں روپیہ کے اوقاف مقرر کیے ، اس کے شاہی کتب خانہ کا ذکر تاریخوں میں نہیں ملتا ، لیکن ظاہر ہے کہ جو شخص خود صاحب تصنیف اور علم کا قدردان ہو اس کا قصر شاہی کتب خانہ کے وجود سے کیونکر خالی رہ سکتا ہے ، پھر جوالا مکھی کے مندر سے جو کتابیں ہاتھ لگیں جن کی تعداد ایک ہزار تین سو تھی ، وہ آخر کہاں گئیں[۲]،

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۰۲ ، [۲] فرشتہ ج اول ص ۱۴۰ وطبقات اکبری ص ۲۳۳

تاریخی تتبع سے یہ بھی پتہ لگتا ہے، اس زمانہ میں محکمۂ تراجم بھی قائم تھا، چنانچہ فرشتہ نے ایک جگہ لکھا ہے،

بادشاہ علمائے آن طائفہ را طلب کردہ بعضے ازان کتب را ترجمہ فرمود،

ازان جملہ اعزالدین خالد خانی کہ شعرائے آن عصر بود، کتابے در حکمت طبعی وشگون وتفاولات در سلک نظم کشیدہ "دلائل فیروز شاہی" نام کردہ والحق آن کتابیست متضمن اقسام حکمت عملی و علمی[1]،

تاتار خانی کتب خانہ | اس زمانہ میں علمی مذاق عام ہو گیا تھا، دربار کے امرار صاحب علم اور علم کے قدردان تھے، چنانچہ اسی دربار کا امیر تاتار خان بڑا فاضل شخص تھا، کلام مجید پر اس کو بڑا عبور تھا، اس نے ایک تفسیر لکھی تھی جس میں خلافیات کو بہ تفصیل بیان کیا تھا، عفیف سراج لکھتا ہے:

تاتار خان کی صحبت میں ہمیشہ علماء اور مشائخ رہتے، تفسیر تاتار خانی جو دنیا میں مشہور ہے، وہ اسی کی لکھی ہوئی ہے، لوگوں کا بیان ہے کہ جب اس نے تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا، تو اس کے لئے ہر قسم کی تفسیریں جمع کیں اور علمار کے سامنے مفسرون کے اختلافات کو جمع کر کے یکجا کیا، اور بڑی تندہی سے یہ تفسیر مرتب کی، جابجا تفسیروں کا حوالہ بھی دیا، کتاب مکمل ہونے کے بعد اس کا نام "تفسیر تاتار خانی" رکھا[2]،

اسی طرح درمختار اور شامی کی مثل ایک فتویٰ کی کتاب بھی ترتیب دینے کا ارادہ کیا، جس میں تمام مختلف فیہ مسائل درج ہوں، چنانچہ مورخ مذکور اس کی نسبت لکھتا ہے،

اسی طرح خان اعظم (تاتار خان) نے فتاویٰ کی ایک کتاب مرتب کی، اس کی ترتیب اس طرح کی کہ دہلی کے تمام فتاویٰ کو جمع کر کے ہر مختلف فیہ مسئلہ کو اپنی کتاب میں درج کیا، اور اختلاف کرنے والے مفتی کے نام کا حوالہ بھی دیا، بڑی کاوش اور محنت کے بعد تیس (یا تین جلدوں) میں یہ کتاب مکمل ہوئی، تکمیل کے بعد اس کا نام "فتاویٰ تاتار خانی" رکھا[3]،

---

[1] فرشتہ ج اول ص۱۴۸ و طبقات اکبری ص۲۳۴، [2] تاریخ فیروز شاہی کلکتہ ص۳۹۲ [3] ایضاً
[4] ایضاً،

اس بیان کے بعد اس کا کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ تاتار خان کے پاس کوئی بڑا کتب خانہ نہ رہا ہوگا، اس طرح کا علمی کام بغیر کتب خانہ کی معاونت کے ہو ہی نہیں سکتا تھا،

غازی خان کا کتب خانہ | تغلق کے بعد ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی، ہر صوبہ دار خود مختار بادشاہ بن گیا، اس وقت پایہ تخت دہلی الوالعزم اشخاص کا سیاسی مرکز تھا، اس لئے اس پر مغل (تیمور) سادات اور لودی یکے بادیگرے قابض ہوئے، لیکن ان کو کبھی اطمینان سے سلطنت کرنا نصیب نہ ہوا، کیونکہ ان کو ہر وقت کسی نہ کسی دعویدار سلطنت کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا، پھر بھی علمی ذوق امراتک عام ہو چکا تھا، اور وہ اپنے محلوں میں کتب خانہ کا قیام ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ غازی خان جو سلطان ابراہیم لودی کے دربار کا ایک بڑا معزز امیر تھا، اس کا ایک خاص کتب خانہ قلعہ کے اندر تھا، ۹۳۲ھ میں جب بابر نے اس کو فتح کیا تو یہ کتب خانہ بھی اس کے قبضہ میں آیا، تزک بابری میں ہے،

دوشنبہ کے دن قلعہ میں سیر کرتا ہوا، غازی خان کے کتب خانہ میں پہنچا، چند اچھی کتابیں اس میں سے نکال کر کچھ ہمایون کو دین اور کچھ کامران مرزا کو کابل بھجوا دین، دینی کتابیں اس میں زیادہ ہیں، اور میرے خیال کے بموجب عمدہ کتابیں اس میں کم نکلیں[1]،

اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسی طرح دوسرے امرار کے ذاتی کتب خانے بھی موجود ہوں گے جن کے ذکر سے تاریخین خالی ہیں،

بابر کا کتب خانہ | بابر، شاعر، ادیب، مصنف اور صاحب علم فرمانروا تھا، زمانہ نے اس کو اطمینان سے ایک جگہ بیٹھنے نہ دیا، آخر عمر میں جب کابل اور دہلی پر اس کا قبضہ ہوا تو ایک گونہ اطمینان سے زندگی بسر ہونے لگی، اس وقت امور سلطنت سے جب اس کو فرصت ملتی

---

[1] تزک بابری قلمی دار المصنفین فارسی،

تو علمی مشاغل کی طرف توجہ کرتا، شاہی کتب خانہ کے علاوہ اس کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جہاں اپنے مذاق کی چیدہ کتابیں رکھتا تھا[1]، چنانچہ جب اس کو زہر دیا گیا، تو اسی کتب خانہ میں اس نے آکر تھوڑی دیر آرام لیا تھا،

ہمایون کا کتب خانہ | الولد سر لابیہ کے مطابق ہمایون بھی علمی مذاق میں اپنے باپ سے پیچھے نہ تھا، اس کو ادب، شاعری، اور علم ہیئت سے خاص دلچسپی تھی، اور اس کی خاص مجلسون میں ہمیشہ علمی چرچے رہتے، مشہور امیر البحر سید علی ترکی نے اپنے سفرنامہ میں متعدد جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے کہ "القصہ ان دنون نظم اور مشاعروں کا بڑا زور تھا، اس لئے مجھے ہمیشہ بادشاہ کے حضور میں رہنا پڑتا تھا[2]"

ہمایون کے دربار میں جب کوئی ماہر فن آجاتا تو اس سے اس فن میں کام لینے کی کوشش کرتا، سید علی ترکی شاعری کے علاوہ علم ہیئت سے بھی پوری واقفیت رکھتا تھا، ہمایون نے پہلے اس کو ایک ضلع کی حکومت دیکر ملازم رکھنا چاہا، مگر جب اس نے ہندوستان میں رہنا منظور نہ کیا تو اس سے کہا گیا کہ کم از کم تین مہینے دہلی میں قیام کرنا پڑے گا، کیونکہ برسات کے باعث تمام سڑکین زیر آب ہیں؛ اس درمیان میں سورج گرہن کے حساب کی جانچ کا کام اس کے سپرد ہوا، چنانچہ وہ ہندوستانی علماے ہیئت کے ساتھ ہمایون کے مرنے تک برابر اس کام میں مصروف رہا، ایک جگہ لکھتا ہے،

بادشاہ نے درخواست منظور کی، مگر فرمایا کہ برسات کے باعث سڑکین اچھی حالت میں نہیں ہیں، اس لیے تین ماہ کے بعد سفر کے لائق ہون گی، اس مدت میں چاند اور سورج گرہن کا حساب کرے اور علماے ہیئت کو آفتاب کی گردش اور خط استوا کے

---

[1] تزک بابری قلمی مذکور و ترجمہ اردو ص ۳۳۶ مطبوعہ دہلی [2] سفرنامہ ص ۴۸ وطن لاہور،

کے نکات پڑھنے میں مدد دے، یہ سب باتین متانت کے ساتھ مجھے سمجھائی گئیں، لہذا میں مجبور ہوا.... اور فوراً کام میں مصروف ہوگیا، اور بغیر آرام کیے رات دن مشغول رہ کر فلکی مشاہدات کا کام ختم کیا۔[1]

ایسے صاحب ذوق بادشاہ کی نسبت یہ کہنا کہ اس کے عہد میں متعدد کتب خانے ہو گئے غیر موزون ہوگا، صدر جہان (یعنی قاضی القضاۃ) کے محکمہ میں جہان سے تمام دینی اور دنیاوی معاملات کے فتوے جاری ہوتے تھے کسی کتب خانہ کا نہ ہونا عقل سے بعید ہے، پھر شاہی کتب خانہ جو ہر بادشاہ کے عہد میں رہا ہے، دہلی میں موجود ہوگا، اس کے علاوہ بابر کا ذاتی کتب خانہ بھی اس کے مرنے کے بعد ہمایون کے قبضہ میں آیا، اس لیے کہا جا سکتا ہے، کہ بابر کی طرح ہمایون کے پاس بھی ذاتی کتب خانہ موجود تھا، چنانچہ اس کی موت بھی اسی کتب خانہ کی چھت سے اترتے وقت ہوئی، طبقات اکبری میں ہے:۔

عجیب باتون میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ، ربیع الاول کو غروب آفتاب کے وقت جنت آشیانی (ہمایون بادشاہ) کتب خانہ کی چھت پر گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد وہان سے اترنے لگے، جب دوسری سیڑھی پر پہنچے تو موذن نے اذان دی، کمال ادب سے بیٹھ گئے، پھر جب اٹھنے لگے تو پیر پھسل گیا، اور زینہ سے زمین پر آگئے،[2]

اس کتب خانہ کی نسبت "ذاتی کتب خانہ" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ راقم الحروف نے اس کتب خانہ کی عمارت خود دیکھی ہے، جو قدیم قلعہ کے اندر محکمہ آثار قدیمہ کی بدولت اب تک موجود ہے، جو قلعہ پرانی دلی سے فاصلہ پر ہے، اور غالباً اس زمانہ میں اس کی آبادی قلعہ تک ہوگی، قلعہ کے اندر جو عمارتین ہوتی ہیں، ان کا تعلق عوام سے نہیں ہوتا، بلکہ بادشا

---

[1] سفرنامہ ترکی امیر البحر (مرآۃ الممالک) اردو ص ۴۳ لاہور، [2] طبقات اکبری ص ۱۴۴، کلکتہ،

یا محکمۂ جنگ سے ہوتا ہے، اس لیے اس کتب خانہ کی عمارت کا قلعہ کے اندر رہنا ہی اس کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ کا ذاتی کتب خانہ تھا، یہ عمارت دراصل شیرشاہ کی بنوائی ہوئی ہے، اب اس کا نام شیر منڈل ہے، عمارت میں سنگ سرخ زیادہ استعمال کیا گیا ہے، وسط میں ایک کمرہ ہے، اور اس کے گرد غلام گردش، عمارت کے اوپر ایک برج ہے، شیرشاہ نے محض تفریح کے لیئے یہ بلند مقام بنوایا تھا، اس لیے اس کا اصلی نام "شیر گاہ" ہے، سید علی ترکی نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ہمایون شیر گاہ کی سیڑھی سے گر کر مر گیا[۱]، ہمایون نے جب ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کیا، تو اس کو اپنا کتب خانہ بنایا، وہ کبھی کبھی علم ہیئت کے تجربات یہیں کیا کرتا تھا، اس کتب خانہ کا ناظم نظام نامی شخص تھا جس کی شہرت باز بہادر کے نام سے زیادہ تھی،

سوری خاندان میں صرف شیرشاہ اور سلیم شاہ ایسے بادشاہ گذرے ہیں جو علم اور اہل علم کے قدردان تھے، ان کو فتوحات اور خانہ جنگی سے اتنی فرصت نہ ملی کہ اس طرف زیادہ توجہ کرتے پھر بھی جس قدر موقع مل سکا رفاہ عام کے کام بھی انجام دے

تاریخ میں صاف طور سے تو کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ ان کے زمانہ میں کوئی کتب خانہ قائم کیا گیا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کا عہد اس سے خالی رہا ہوگا، بلکہ جہاں جہاں مدرسے، جامع مسجدیں، اور خانقاہیں یقیناً ان کے ساتھ کتب خانہ کا ہونا لازمی تھا، یہی حال محکمہ قضاء کا تھا،

اکبر کا کتب خانہ ہمایون کے بعد اکبر تخت نشین ہوا، اکبر ان خوش نصیب بادشاہوں میں سے ہے جس کے عہد میں بڑی علمی ترقی ہوئی، اس کا دربار بڑے بڑے علماء، ادباء، حکماء، شعراء اور ہر فن کے اصحاب کمال کا مرکز تھا، اس کے دربار کے نورتن کی شہرت آج تک ہے،

---

[۱] سفرنامہ سید علی ص ۳۴ لاہور،

اکبر اگرچہ معمولی لکھا پڑھا تھا، لیکن علمی ذوق میں وہ اپنے اسلاف سے کسی طرح کم نہ تھا، اس نے محکمہ تراجم بھی قائم کیا تھا جس کے ذریعہ سنسکرت کی کتابون کا فارسی میں ترجمہ ہوا، اور مستقل تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا جس میں تاریخ کے علاوہ تقریبًا ہر فن پر کتابیں لکھی گیئں، اکبر خود بھی کتابون کا بڑا شائق تھا، اس کو جب کوئی نئی کتاب مل جاتی تو اس کو ضرور کتاب دار سے منگوا کر سنتا، اور ایک رات میں جہان تک سنتا وہان نشان لگا دیتا، دوسرے دن پھر اسی جگہ سے شروع کراتا، یہان تک کہ کتاب ختم ہو جاتی[1]

اس کے پاس ایک بڑا عظیم الشان کتب خانہ تھا، اپنے بزرگون سے ورثہ میں جو کتب خانہ پایا تھا، اس کے علاوہ گجرات، جونپور، بہار، کشمیر، بنگالہ اور دکن کی فتوحات میں یہان کے کتب خانون سے جو کتابیں اس کو دستیاب ہوئیں، ان کی بڑی تعداد اس نے اپنے کتب خانہ میں داخل کی، اسطرح اسکا کتب خانہ نوادر کتابون کا بیش بہا خزانہ بن گیا، اسی میں نصیر الدین ہمایون شاہ کا فارسی دیوان بھی تھا جس کی چند رباعیان ابو الفضل نے اکبر نامہ میں نقل کی ہیں[2]، قلعہ آگرہ میں ثمن برج کے بغل میں جو لمبا کمرہ تھا، وہی شاہی کتب خانہ تھا، کیونکہ موجودہ ثمن برج شاہجہان کا بنوایا ہوا ہے، نظر بندی کے زمانہ میں وہ اسی جگہ رہتا تھا[3]،

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اس عہد میں بادشاہ کی قدر دانی سے علم و فن کا بڑا چرچا ہو گیا تھا، دربار میں بکثرت علماء و ماہرین فن جمع ہو گئے تھے، اور جن کی رسائی دربار شاہی تک نہ ہو سکی وہ ان امرائے دولت سے وابستہ ہو گئے، جو علم و فن کے قدر دان اور مربی تھے، ابو الفضل فیضی، مولانا فتح اللہ شیرازی، حکیم ابو علی گیلانی، حکیم ابو الفتح گیلانی، حکیم ہمام عبد الرحیم خان خانان، مولانا عبد الحق محدث دہلوی، ملا عبد القادر بدایونی، ملا مبارک نام

---

[1] اکبر نامہ جلد اول ص ۲۰۲ نولکشور [2] اکبر نامہ ج ۱ ص ۲۰۲ [3] تاریخ آگرہ ص ۵۰، مطبوعہ آگرہ،

نظام الدین بخشی، ان میں سے ہر شخص خود ماہر علوم وفنون، صاحب ذوق اور علم کا قدردان تھا، ہر شخص کے پاس اپنا ذاتی کتب خانہ موجود تھا،

کتب خانہ، خان خاناں خان خاناں مرزا عبدالرحیم بن بیرم خان ممکن ہے علمی قابلیت میں اپنے ہم عصروں سے کم رہا ہو، لیکن علم کی قدردانی میں ان سے بہت آگے تھا، اس کا کتب خانہ شروع میں احمد آباد میں تھا جبکہ وہ وہاں کا حاکم تھا، یہ بہت اعلی درجہ کا کتب خانہ تھا، کتابوں کی مرمت اصلاح اور حفاظت کے لیے بہت سے ملازمین مقرر تھے، کاتب، جلد ساز، وراق، صحاف، نقاش اکثر وہ ہوتے جو اپنے فن مین اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، مولانا ابراہیم نقاش اسی کتب خانہ میں ملازم تھے، یہ خوشنویس، طلاکار، صحاب، اور حکاک بھی تھے، علمی استعداد بھی ان کی اچھی تھی طبع موزون بھی رکھتے تھے،

ان کی نسبت مآثر رحیمی میں ہے،

وہ ایک مدت تک اس کتاب خانہ میں کتاب داری کے عہدہ پر ممتاز رہے، انکے ہاتھ کی لکھی ہوئی چیزیں تصویریں، اور طلاکاری کے نمونے بکثرت ہیں[1]،

اس کے بعد غالباً ان ہی کی جگہ مشفق نقاش کا تقرر ہوا، جو فن نقاشی میں یکتا ے روزگار تھا،

خوشنویس بہبود مرزا مشہور خوشنویش تھا، جو میر علی خوشنویش کا بھائی تھا نقاشی اور خوشنویسی میں اس کو کمال حاصل تھا، خانخانان کے کتب خانہ میں اسی کام پر ملازم تھا،

شجاع شیرازی اس کو خط ثلث اور نسخ میں بڑی مہارت تھی، ۹۹۹ھ میں اس نے مقام ٹھٹھ میں شرف ملازمت حاصل کیا، پھر کچھ دنون کے بعد کتب خانہ کی خدمت اسکے

---

[1] مآثر رحیمی ص ۱۶۸۶ ج ۳ حصہ ۲ کلکتہ،

سپرد ہوئی،

ملا عبد الرحیم ہروی، ان کا خطاب "عنبریں قلم" تھا خط نسخ اور نستعلیق میں ان کو کمال حاصل تھا، محمد حسین کشمیری، (خوشنویس) کے سوا کوئی ان کا حریف نہ تھا. اس کتب خانہ کی اکثر کتابیں اسی کے قلم کی مرہون منت ہیں،

مصور و شبیہ ساز | میان ندیم، میان فہیم کے بھائی تھے، یہ دونوں آبود (گجرات) کے راجپوت راجہ کے لڑکے تھے، خانخانان نے ان کی تربیت اپنے بچوں کی طرح کی تھی فن منصوری میں اس زمانہ مین ان کا کوئی حریف نہ تھا. اسی کتب خانہ سے ان کا تعلق تھا،

مادھو، فن مصوری کے علاوہ شبیہ سازی مین بے مثل تھا. اس کتب خانہ کی اکثر کتابون کی تصویرین اسی کی بنائی ہوئی ہیں،

جلد ساز | محمد امین خراسانی، ایک مشہور جلد ساز اور رنگ طلائی کا ماہر تھا، اس نے مشہد کے کتب خانہ میں بہت دنون تک کام کیا تھا، چارسو روپیہ ماہانہ اس کی تنخواہ تھی، اسی کتب خانہ میں ملازم تھا. یہ محمد امین خراسانی وہی ہے جس نے ابری کاغذ کی ایجاد سے شہرت دوام حاصل کی،

ملا محمد حسین جلد ساز اپنے فن میں ماہر تھے مصوری کا کام بھی خوب جانتے تھے، ۳۵ سال تک اس کتب خانہ میں ملازم رہے، کتب خانہ میں سب سے زیادہ معتمد یہی تھے،

داروغہ کتب خانہ | شیخ برہمی، بہرایچ کے باشندے اور ہندی (بھاکھا) زبان کے بڑے اچھے شاعر تھے. اسی کتب خانہ سے ان کا تعلق تھا. جب وہ حج کو جانے لگے تو اپنے لڑکے شیخ عبد السلام کو داروغہ بناگئے جس نے خانخانان کے زیر تربیت رفتہ رفتہ اعلیٰ لیاقت حاصل کر لی،

مترجم | ملا محمد علی کشمیری، عربی اور فارسی میں بڑے صاحبِ استعداد تھے، ان کو ترجمہ کرنے

میں خاص مہارت تھی، ۱۰۲۵ھ میں خواجہ صائن الدین کی ایک عربی کتاب کا فارسی میں ترجمہ ان ہی نے کیا تھا،

مصحح | مولانا صوفی ایک متبحر عالم تھے، غالباً یہ تصحیح کا کام کرتے تھے، ملا شکیبی بھی اسی کتب خانہ سے وابستہ تھے، لیکن ان کے ذمہ کیا کام تھا، اس کی تصریح نہیں ملتی، شاید تصحیح کے بعد مقابلہ کا کام انجام دیتے تھے،

جدول ساز | ملا محمد امین جلد ساز اپنے فن کے کامل تھے، ان ہی کے ساتھ محمد حسین کامی، بقائی اور غنی ہمدانی بھی اس کتب خانہ میں کام کرتے تھے،

ناظم | میر باقی اس کتب خانہ کے افسر اعلیٰ، بڑے صاحب علم واستعداد تھے، ترکستان کے باشندے، اور خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے، اس کتب خانہ کے عملے کی کل تعداد ۹۵ تھی، اسی سے اس کی عظمت معلوم کر سکتے ہیں،

خصوصیات | اس کتاب خانہ میں خاص بات یہ تھی کہ اس عہد کے اکثر مصنفین کی تصنیفیں خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود تھیں، بعض مصنفوں نے خود ہی اپنی تصانیف پیش کی تھیں، ان میں سے بعض یہ ہیں،

(۱) دیوان نظیری نیشاپوری جس نے ۱۰۲۲ھ میں آگرہ کی ملاقات میں دیوان نذر گزرانا،

(۲) خواجہ حسین ثنائی خراسانی کے کلام کا مسودہ جو ملا عبدالرحیم خوشنویس کا لکھا ہوا تھا، خاص کتب خانہ کے لیے بھیجا،

(۳) محتشم کاشی کی مثنوی، جو امیر معز الدین محمد کاشی خوشنویس کی لکھی ہوئی تھی، اور جس کی نقل میں ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا، اس کتب خانہ میں موجود تھی،

(۴) مشہور شاعر عرفی شیرازی کے دیوان کا مسودہ اسی کتب خانہ میں موجود تھا،

جس سے اس کے موجودہ دیوان کو مرتب کیا گیا،

(۵) ملا نورالدین ظہوری کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشعار بھی اس کتب خانہ کی زینت تھے،

(۶) محمد وقوعی نیشاپوری متوفی ۱۰۱۳ھ ایک بلند پایہ شاعر تھا، اس کے خود نوشتہ قصائد اس کتب خانہ میں موجود تھے،

(۷،۸) ساد جی صرفی، اور ملا شکیبی کے بھی خود نوشتہ قصائد کتب خانہ میں تھے،

خانخانان کے کتب خانہ کی بعض کتابیں، اسوقت ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، ان میں سے ایک کتاب تصوف میں خواجہ عبداللہ انصاری کی ہے، اس کو ۹۲۱ھ میں سلطان علی مشہدی نے لکھا، اور خانخانان نے اس کو ۱۰۲۳ھ میں جہانگیر کی نذر کیا، اس پر جہانگیر کے قلم سے اس کا نام مع سنہ تحریر ہے، پھر ۱۰۳۷ھ میں شاہجہان کے کتب خانہ میں داخل ہوئی، شاہجہان نے بھی اپنے قلم سے نام اور سنہ لکھا، آجکل یہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے،

دوسری کتاب تصوف میں مجالس العشاق ہے، جو امیر تیمور کے پوتے سلطان حسین کی تالیف ہے، اس میں ۵۲ ایرانی آرٹ کی تصویریں ہیں، ۹۹۹ھ میں داخل کتب خانہ ہوئی ۱۲۲۳ھ میں فرخ آباد کے حاکم شجاع الملک سعادتمند خان کے قبضہ میں آئی، یہ بھی رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے،

ایک کتاب تعبیر رویا میں تھی جس میں قرآن پاک سے خواب کی تعبیر نکالنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، یہ کتاب اکبر نے ۲۴ سنہ جلوس میں خانخانان کو مرحمت کی، یہ کتاب کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے،

شش رسالہ سعدی، ۹۸۶ھ میں بمقام اودے پور اس کے ہاتھ لگا، پھر شاہجہان

کے کتب خانہ میں آیا، اس پر شاہجہان کی تحریر ہے، اس کے بعد عالمگیر کے کتب خانہ میں داخل ہوا، اب بانکی پور پٹنہ کے کتب خانہ میں ہے،

یوسف زلیخا ۹۳۰ھ میں میر علی نے ہرات میں لکھی، ۱۰۱۹ھ میں جہانگیر کو خانخانان نے تحفہ میں دی، جہانگیر نے اپنے قلم سے اس میں اس واقعہ کو لکھا ہے، اس کی قیمت ایک ہزار اشرفی تھی، یہ مصوری اور طلا کاری کا بہترین نمونہ ہے[۱]، یہ بھی بانکی پور پٹنہ کے کتب خانہ میں اسوقت موجود ہے،

قرآن پاک، طول (۱۱) انچ اور عرض (۷) انچ ہے، بین السطور ۱۲ ہیں، شنگرف سے نشانات رکوع، ربع، نصف، ثلث بنے ہیں، اور آیات کے نشانات لاجوردی ہنگون ہنرے ہیں، شروع کے دو عنوان مرصع اور مزین ہیں، تمام سورتوں کے عنوان زرافشان ہیں، کاتب کا نام نہیں ہے، مگر نہایت پختہ نسخ میں ہے، یہ قرآن ۱۰۳۲ھ میں خانخانان کے پاس تھا، اس پر اس کی تحریر موجود ہے، پھر اللہ وردی کے کتب خانہ میں داخل ہوا، ۱۹۱۹ء سے رائل ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے[۲]،

سلیمہ سلطانہ کا کتب خانہ | اسی عہد میں سلیمہ سلطانہ بیگم بھی تھین، یہ ہمایون کی بھانجی یعنی ان کی بہن گلرخ بیگم کی صاحبزادی ہیں، عالمہ اور شاعرہ تھین، ۹۶۱ھ میں پیدا ہوئیں، ساٹھ برس کی عمر پاکر ۱۰۲۱ھ مین وفات پائی، جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں ان کی قابلیت اور فضیلت کی تعریف کی ہے، ان کو کتب بینی کا بڑا شوق تھا، ان کے پاس ایک ذاتی

---

[۱] یوسف زلیخا قلمی مصور طلائی جدول پاکیزہ خط نسخ چھوٹی تقطیع کا نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے، جو ۱۲۰۰ھ کا لکھا ہوا ہی، جو خاص کابل سے تحفۃً لایا گیا ہی[۲] یہ تمام حالات مولوی حافظ نذیر احمد صاحب محقق آثار قدیمہ عجائب خانہ کلکتہ کے ایک لکچر سے ماخوذ ہیں جو ۱۹۲۶ء میں مشرقی کانفرنس میں آپ نے دیا تھا، (بحوالہ معارف جلد ۱۴)

کتب خانہ بھی تھا،[1]

منعم خان کا کتب خانہ

اکبر ہی کے زمانہ میں سپہ سالار منعم خان خانخانان جونپور کا حاکم تھا، عمر رسیدہ تجربہ کار اور علم کا قدردان تھا، اسی نے دریائے گومتی پر جونپور میں پل تیار کرایا تھا، جو آج تک موجود ہے، اس کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، وہ کتابوں کا بڑا شائق تھا، جہاں کہیں سے اس کو کتاب دستیاب ہوسکتی حاصل کرنے کی کوشش کرتا، احباب بھی اس کے اس شوق سے واقف تھے، جو کتاب نایاب سمجھتے، فوراً اس کے پاس روانہ کر دیتے، اور اس کے صلہ میں وہ گران قدر عطیے دیتا، جب وہ جونپور کا حاکم تھا تو اس کے ایک دوست بہادر خان ازبک نے کلیات سعدی کا ایک نسخہ اس کو تحفۃً ارسال کیا تھا، اس کتاب کی پشت پر منعم خان نے جو کتابی چہرہ تحریر کیا ہے، وہ حسب ذیل ہے،

> این کلیات حضرت شیخ سعدی قدس سرہ، را آن عزیز بہادر خان در بلدۂ پرسر در جونپور بدین فقیر فرستادہ بود، پانصد روپیہ انعام شد، در تاریخ نہصد ہفتاد و شش (۹۷۶ھ) عدد اوراق این کتاب سی صد و نود و چہار است، عدد ابیات و سطور ش از متن و حاشیہ نوزدہ ہزار و ہفتصد حاشیہ چہار ہزار و ہفت صد و بست و ہشت است مشتمل بر دو دسمہ و دیباچہ مصور و چہار لوح شیرازی، العبد منعم بن بیرم غفر اللہ ذنوبہما و ستر عیوبہما،[2]

اسی طرح اس کے کتب خانہ کی ایک اور کتاب اس وقت تک خوش قسمتی سے محفوظ ہے، یہ مرزا کامران کا دیوان ہے، جو ایک عرصہ تک اس کے کتب خانہ کی زینت رہا اس نے اپنے قلم سے اس پر جو عبارت لکھی تھی وہ یہ ہے،

> اللہ اکبر، دیوان مرزا کامران بخط خواجہ محمود اسحاق شہابی ... منعم خانخانان ۲۴ فروری قیمت مہرۂ

---

[1] محکمہ آثار قدیمہ کلکتہ بحوالہ معارف ج ۱۴ - [2] ایضاً

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی اس نے خرید کر داخل کتب خانہ کی تھی[1]

نورجہان کا کتب خانہ | علوم و فنون کی قدردانی میں نورجہان بیگم بھی اپنے مرد ہم عصروں میں کسی سے کم نہیں تھی، اس کے پاس بھی ایک ذاتی کتب خانہ تھا، اور وہ کتابیں خرید کر اس میں اضافہ کرتی رہتی تھی، چنانچہ مرزا کامراں کا دیوان اس نے تین مہر میں خرید کر داخل کتب خانہ کیا تھا، دیوان کے اول صفحہ پر یہ عبارت درج ہے[2]،

تین مہر قیمت اموال، نواب نورالنساء بیگم،

اس سے معلوم ہوا کہ نورجہان کے خطاب ملنے سے قبل یہ کتاب دستیاب ہوئی تھی، اور کتب بینی کا شوق شاہی محل میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس میں موجود تھا،

شیخ فرید کا کتب خانہ | شیخ فرید بخاری جہانگیر کے ان امیروں میں سے تھے جس پر بادشاہ کی خاص نظر عنایت رہتی تھی، لاہور اور احمد آباد میں عرصہ تک ناظم (صوبہ دار) رہا تھا، غیر متعصب فیاض اور صاحب علم تھا، اس کے پاس بھی ایک کتب خانہ ذاتی تھا، چنانچہ دیوان حسن دہلوی کا جو نسخہ اس نے اپنے کتب خانہ کے لئے خرید کیا تھا، وہ آج بھی خدا بخش خان لائبریری میں موجود ہے[3]،

فیضی کا کتب خانہ | فیضی فیاضی ان لوگوں میں ہے جن کا علمی ذوق بہت بلند ہے، وہ اپنے یگانہ روزگار باپ کا خلف الصدق تھا، اس نے اپنے کتب خانہ میں بڑی نایاب اور نادر کتابیں جمع کی تھیں ان میں بڑی تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو خود مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں، یا ان کے قریب زمانہ کی تھیں، اور بڑی محنت سے ان کی تصحیح کی گئی تھی،

ان کتابوں کی بڑی نفیس جلدیں تھیں، خود فیضی کی ایک سو ایک تصانیف اس میں تھیں،

---

[1] دیوان کامران کا پہلا صفحہ کتب خانہ بانکی پور پٹنہ [2] ایضاً [3] اورینٹل لائبریری بانکی پور پٹنہ کی فہرست جلد اول ص ۲۴۵ ۲

کتب خانہ کی کتابوں کی مجموعی تعداد چار ہزار چھ سو تھی، فیضی کے انتقال کے بعد یہ سب کتابیں شاہی کتب خانہ میں داخل کی گئیں[1]، فنون کے لحاظ سے ادب، طب، نجوم، موسیقی، حکمت، تصوف، ہیئت، ہندسہ، تفسیر، فقہ و حدیث کی کتابیں اس کتب خانہ میں تھیں،

جہانگیر کا کتب خانہ سلاطین مغلیہ میں شہنشاہ جہانگیر اپنی خوش مذاقی اور علمی ذوق کے لئے بہت مشہور ہے، اس کی تزک پڑھنے سے اس کے علمی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے پاس شاہی کتب خانہ کے علاوہ اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جو سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہتا تھا، جس کا مہتمم مکتوب خان تھا، چنانچہ جب وہ گجرات گیا ہے، تو وہاں کے علماء کو اس نے اس کتب خانہ سے متعدد کتابیں تحفۃً دیں، جہانگیر لکھتا ہے،

۱۶ر تاریخ سہ شنبہ کے دن گجرات کے مشائخ میرے پاس دوبارہ آے، میں نے پھر انکو خلعت، زاد راہ اور آراضی دیکر رخصت کیا، اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے خاص کتب خانہ سے ایک ایک کتاب مثل تفسیر کشاف تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب کے مرحمت کی اور ان سب کی پشت پر اپنی گجرات کی آمد اور عطیہ کی تاریخ تحریر کر دی[2]،

کتب خانہ کے داروغگی (مہتمم) کے عہدہ پر ۱۰۰۵ھ تک عبدالرحمن رشیدائی خوش نویس تھا، اس کے بعد میر صالح ولد عبداللہ مشکین رقم متوفی ۱۰۱۶ھ اس عہدہ پر مامور رہا[3]، ۱۰۶۳ھ میں کتب خانہ کا داروغہ محمد شفیع تھا، جیسا کہ ایک کلام مجید کی مہر سے معلوم ہوتا ہے، جو اسوقت رایل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہے[4]،

ایک جرمن سیاح جو ۱۶۳۶ء میں سورت آیا تھا، اور یہاں عرصہ تک قیام کر کے واپس گیا، نے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ شاہجہان کے کتب خانہ میں ۲۴ ہزار کتابیں اعلیٰ قسم کی جلد بندھی ہوئی موجود تھیں[5]

---

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳۰۵ کلکتہ [2] تزک جہانگیری ص ۲۱۸ علی گڈھ [3] شاہجہان نامہ ص ۵۰۵ جلد دوم [4] معارف جلد ۱۴ ص ۴۲۲

[5] سفرنامہ مرتبہ مین ڈسلو ص ۱۱۰

شاہجہان کا کتب خانہ

شاہجہان بادشاہ کے عہد ۱۰۶۲ھ میں اس کتب خانہ کے ناظم کچھ دنون کے لئے سید علی ابن سید جلال مقصود عالم بن سید محمد مقبول عالم تھے، وہ گجرات کے شہر احمد آباد میں پیدا ہوے، اور اپنے بھائی سید جعفر بدر عالم کی سفارش سے اس عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہوئے، ان کا سلسلۂ نسب احمد آباد گجرات کے مشہور بخاری خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت شاہ عالم سے ملتا ہے، نہایت لائق اور صاحبِ علم لوگون میں سے تھے، اورنگ زیب عالمگیر سے لے کر محمد شاہ کے زمانہ تک شاہی کتب خانہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہا، اس کے بعد اس کتب خانے کی جانب سے سلاطینِ مغلیہ بے پروائی برتنے لگے جس کے سبب سے اکثر قابو یافتہ امرا نے کتب خانہ سے کتابین منتقل کرنی شروع کر دین، چنانچہ شاہ اودھ کے کتب خانہ مین بے شمار کتابین، یہان کی موجود تھین[1]،

۱۸۵۷ء کے بعد اس کتب خانے کے اجزاء مختلف مقامات میں منتشر ہو گئے، اس کا کچھ حصہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے قبضہ میں آیا، اور کچھ رایل ایشیاٹک سوسائٹی آف لندن کی نذر ہوا، بقیہ کتابیں لندن کے شاہی کتب خانہ مین داخل کی گئیں، پھر بھی ہزارون کتابین ایسی تھین، جو ہندوستان ہی مین رہیں، چنانچہ ہندوستان کے متعدد کتب خانون میں ایسی کتابیں میری نظر سے گذرین جن پر شاہانِ مغلیہ اور ناظم کتب خانہ کی مہرین موجود ہیں، اسی طرح بہت سے ذاتی کتب خانون میں بھی یہ کتابیں پائی جاتی ہیں،

عالمگیر کا کتب خانہ

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں اس کتب خانہ کو اور زیادہ ترقی ہوئی، اس وقت اس کا ناظم محمد صالح تھا جو عیسیٰ خان ترخان (سندھ) کا دوسرا لڑکا ہے اور مہتمم مہابت خان کا پوتا محمد منصور مقرر ہوا، اس کو مکرمت خان کا خطاب بادشاہ نے

---

[1] تحفۃ العالم ص ۳۵۰

عطا فرمایا تھا، ۱۰۶۹ھ میں اس کے مہتمم سید علی الحسینی ہوئے، جیسا کہ ایک کتاب (قرآن شریف) کی مہر سے ظاہر ہوتا ہے، جو اس وقت رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے[1]۔

قطب الملک کا کتب خانہ | امراء دولت کو کتب خانوں کا شوق تھا، اور اپنا ذاتی کتب خانہ خاص اہتمام سے رکھتے تھے، قطب الملک کا کتب خانہ انہی میں سے ایک تھا، اس کتب خانہ میں نادر کتابیں بھی موجود تھیں جن کو خاص طور پر مہیا کرتا تھا،

تزک جہانگیری اس عہد میں بہت کمیاب تھی، لیکن اس نے اپنے کتب خانہ کیلئے اس کو بہم پہنچایا، پھر اسی کتب خانہ سے شاہزادہ محمد سلطان بن عالمگیر نے اس کو حاصل کیا، یہ کتاب آج بھی خدا بخش خان لائبریری میں موجود ہے[2]۔

نواب ابراہیم خان بہادر نصرت جنگ ۱۱۵۷ھ میں دہلی کے ذی اثر امراء میں شمار کئے جاتے تھے، اس زمانہ کے علمی ذوق کے مطابق ان کے پاس ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں کتابیں خرید کر کے داخل کی جاتی تھیں، چنانچہ ایک کتاب "مہندس" شاعر کا دیوان مصنفہ ۱۱۱۵ھ خرید کر کے کتب خانہ میں داخل کیا گیا، شاعر مہندس کا اصلی نام لطف اللہ ہے، جس کا باپ نادر العصر استاد احمد معمار عہد شاہجہانی کا مشہور انجینیر ہے، جس نے تاج محل آگرہ اور لال قلعہ دہلی تعمیر کیا،

اس کتاب کے خاتمہ پر یہ عبارت درج ہے:۔

- بتاریخ بستم رمضان المبارک ۱۱۵۷ھ دیوان مہندس خرید شد بسرکار نواب ابراہیم خان بہادر

اور ابتدا میں ہے۔

---

[1] بحوالہ معارف جلد ۴۸ ص ۳۲۲، [2] اورنٹیل لائبریری پٹنہ کی فہرست جلد اول ص ۲۴۴۔

"این کتاب سرکار نواب ابرہیم خان بہادر سبز جنگ بکتاب خانہ داخل شد"[1]

نواب لوہارو کا کتب خانہ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں نواب لوہارو بہت باندا ق اور علم دوست رئیس تھے، عموماً ان کے دربار میں اہلِ علم جمع رہتے، دہلی کے مشہور شاعر غالب سے ان کی بڑی دوستی تھی، نواب صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے، نواب صاحب کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں مختلف فنون کی کتابیں تھیں، نوادر کا بڑا شوق تھا، اسی لئے نقاشی اور مصوری کے بہترین نمونے اس میں تھے، بقول غالب کے اس میں کم از کم بیس ہزار کی مالیت کی کتابیں تھیں[2]، افسوس ۱۸۵۷ء کی بادِ خزاں نے کتب خانہ کا ورق الٹ دیا،

گجرات کا شاہی کتب خانہ گجرات میں ممکن ہے کہ کتب خانہ کا رواج اسلامی حکومت سے پہلے آباد شدہ مسلمانوں میں رہا ہو، جیسا کہ مولانا یعقوب الموجود ۵۷۶ھ کے قیام جامع مسجد پٹن سے معلوم ہوتا ہے، لیکن تاریخ میں صریح طور پر اس کا کوئی ذکر نہیں[3]،

جب گجرات میں خود مختار حکومت قائم ہوئی، تو سلطان احمد متوفی ۸۴۶ھ کے دربار میں ہر قسم کے علوم و فنون کے ماہر جمع ہو گئے، اور ان لوگوں کے فیض صحبت سے اس نے مدرسوں، مسجدوں، سراؤں اور رفاہ عام کے دوسرے کاموں کی بنیاد رکھی، ان میں کتب خانہ بھی تھا، اس کتب خانہ کا تذکرہ تاریخ میں اس طرح آتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے محمد شاہ متوفی ۸۵۵ھ نے شاہی کتب خانہ سے کتابیں نکال کر مدرسہ شمع برہانی کے طلبہ کے پڑھنے کے لئے وقف کیں[4]، یہ کتب خانہ ۹۸۰ھ تک قائم رہا، اکبر نے جب گجرات فتح کیا، تو اس کی کتابیں کچھ تقسیم کر دیں، اس میں سے کچھ کتابیں

[1] معارف نمبر ۱ جلد ۱۳، [2] عود ہندی ص ۲۹، ۱۵۱، [3] خاتمہ مراۃ احمدی بمبئی ص ۱۲، ۲۴۳،

[4] ظفرالوالہ ص ۳۲، لندن جلد اول،

شیخ عبدالحق محدث اور کچھ ملا عبدالقادر بدایونی اور فیضی کے حصہ میں آئین، باقی شاہی کتب خانہ میں داخل ہوئیں،[1]

عثمان پورہ کا کتب خانہ شیخ محمد عثمان الملقب بہ شیخ برہانی، خلیفہ حضرت قطب عالم متوفی ٨٥٧ھ (احمد آباد) بڑے پایہ کے بزرگ تھے، آپ نے سابرمتی ندی کے اس پار ایک گاؤن بساکر اس کا نام عثمان پورہ رکھا، اسی میں ایک مسجد اور ایک مدرسہ سلطان محمد شاہ گجراتی کے ذریعہ تعمیر کرایا جس کا نام مدرسہ شمع برہانی تھا، اس مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں دوسری کتابون کے علاوہ شاہی کتب خانہ کی وقف شدہ کتابیں بھی تھین، ١٠٣١ھ تک تو وہ خود نگران رہے، اس کے بعد بھی عرصہ دراز تک یہ سب یادگارین قائم رہیں، پھر مرہٹون کی لوٹ مار میں تباہ ہوگئین، اب صرف مسجد اور مقبرہ یادگار باقی ہے،

خانقاہ سرخیز کا کتب خانہ حضرت شیخ احمد کھٹوی متوفی ٨٤٩ھ نے سرخیز (احمد اباد) میں مسجد تالاب، اور خانقاہ خود تعمیر کرائی، آپ کے بعد سلطان محمد شاہ گجراتی نے مقبرہ اور یہ مدرسہ بنوایا، غالب گمان ہے کہ اس مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ ضرور ہوگا، لیکن ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ شیخ احمد اپنی خانقاہ میں ذاتی کتب خانہ بھی رکھتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر حدیث کی کتاب مصابیح کو اپنے کتب خانے سے نکال کر حاضرین میں سے ایک شخص کو ایک حدیث سنائی، جس نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا،[2]

شاہ عالم کا کتب خانہ گجرات (احمد آباد) کے مشہور بزرگ حضرت سید محمد شاہ عالم متوفی ٨٨٠ھ ایک باعمل عالم تھے، مطالعہ کتب کا آپ کو بڑا شوق تھا، کثرت مطالعہ کی

---

[1] تاریخ بدایونی جلد دوم ص ٣٠٢ کلکتہ [2] خاتمہ مراۃ احمدی ص ٣٤٦،

بنا پر آپ کی دونون ہاتھون میں ٹیک لگانے سے نشان پڑ گئے تھے، آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں عام کتابون کے علاوہ نایاب کتابیں بھی تھین، چنانچہ مولانا صدر جہان جب آپ سے ملنے گئے تھے، تو آپ نے امام رازی کا ایک ایسا نایاب نسخہ ان کو دکھایا جس کی خبر مولانا صدر جہان کو نہ تھی[1]۔

آپ کے جانشین بھی اس کو برابر ترقی دیتے رہے، سید جعفر بدر عالم متوفی ۱۰۸۵ھ کے وقت میں یہ کتب خانہ عروج پر تھا[2]، آپنے خود بھی سیکڑون کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر داخل کتب خانہ کین، ایک دفعہ رات کے وقت راستہ میں ایک سائل نے قرآن کا نسخہ طلب کیا، آپنے کہا کہ آج کتب خانہ سے دیکھکر دین گے، اس نے کہا کہ جو آپکے پاس اس وقت موجود ہے، وہ کیون نہیں دیتے، آپ ہمیشہ اپنے ساتھ ایک قرآن مجید رکھتے تھے مجبورًا وہی دیدیا، مرہٹون کی یورش کے زمانہ میں ان کی لوٹ مار کے خوف سے آپ کی اولاد شہر پناہ کے اندر چلی آئی تھی جس کی بنا پر کتب خانہ کی کافی حفاظت نہ ہوسکی جس سے آہستہ آہستہ کتب خانہ تباہ ہوگیا لیکن کچھ بچی ہوئی کتابیں آج بھی اُن کے سجادہ نشین اولاد کے قبضہ میں ہیں،

نہروالہ پٹن کے مشہور معروف محدث علامہ محمد بن طاہر پٹنی گجرات کے پاس بڑا نایاب کتب خانہ تھا، اس میں علامہ ممدوح نے عرب و عجم سے لاکر کتابیں جمع کی تھین، جب تک اس خاندان میں علم رہا کتابیں محفوظ رہیں، پھر آہستہ آہستہ کتابیں ضائع ہوگئیں، مگر اسکا کچھ حصہ اُن کے وارثون کے پاس آج بھی موجود ہے، راقم الحروف نے اس کتب خانہ کو ۱۹۳۲ء میں جب دیکھا، تو اس کی حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا، اگر یہی حال رہا تو کچھ

---

[1] خاتمہ مراۃ احمدی بمبئی ص ۳، [2] خاتمہ مراۃ احمدی اردو ص ۱۶۱ لاہور،

کے بعد یہ بھی تلف ہو جائے گا، اس میں کتاب مجمع البحار کے ایک نسخہ کے متعلق بتایا گیا، کہ وہ مصنف کے قلم کا ہے، مگر اس کی کوئی شہادت اندرونی نہ ملی، جو اس کی تصدیق کرتی،

شاہ وجیہ الدین کا کتب خانہ علامہ شاہ وجیہ الدین گجراتی متوفی ۹۹۸ھ کی احمد آباد میں بڑی مقدس ہستی تھی، ۹۳۴ھ میں آپنے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جو آپ کی وفات کے بعد ۱۲۳۶ھ تک قائم رہا، اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا، یہ کتب خانہ بہت بڑا تھا، اور ہر فن کی کتابیں اس میں موجود تھیں، بزرگوں کا بیان ہے کہ دو بڑے کمروں میں بے ترتیبی سے کتابیں بھری تھیں لیکن جب خاندان میں علم کے قدردان نہ رہے، تو کتابیں بھی ضائع گئیں، اس صدی کی ابتدا میں مولوی عبدالمنعم صاحب باغلطہ خطیب جامع مسجد بمبئی، اور یوسف صاحب بی۔اے کھٹ کھٹے مرحوم (بمبئی) بہت سی کتابیں اٹھالے گئے، راقم الحروف نے ۱۹۲۱ء میں اس کتبخانہ کو دیکھا، تو صرف چند صندوق کتابیں تھیں لیکن اب وہاں کچھ نہیں ہے، کچھ کتابیں تو احباب کے نذر ہوئیں اور کچھ دریائے سابرمتی میں بہ گئیں، کچھ تھوڑی سی کتابیں ہمارے دوست پیر حسینی صاحب اور بڑے میاں صاحب موجودہ متولی درگاہ کے پاس ہیں،

مدرسہ پٹن کا کتب خانہ ۱۰۹۲ھ میں بمقام نہر والہ پٹن (گجرات) میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا جس کا نام فیض صفا تھا، اس کے ساتھ مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی جس پر مندرجہ ذیل تاریخی شعر درج ہے،

بنا شد مدرسہ و مسجد بہ فیض صفا   در ہزار و نود و دو، ز عنایات خدا

اس مسجد میں ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، راقم الحروف نے ۱۹۳۱ء میں جب اس کو دیکھا ہے تو وہ نہایت بُرے حال میں تھا، نایاب کتابیں اس میں کم رہ گئی تھیں تاہم قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا،

مخدوم ابراہیم کا کتب خانہ کاٹھیاواڑ میں کتیانہ ایک مشہور قصبہ ہے، ۱۰۹۹ھ میں یہاں ایک بڑا مدرسہ قائم ہوا تھا، اس کے بانی مخدوم شیخ ابراہیم بن سلیمان تھے، ان کی وفات ۱۱۲۱ھ میں ہوئی،

ان کا مدرسہ پچھلی صدی تک قائم تھا، اس کے ساتھ ایک کتبخانہ بھی تھا، مدرسہ بند ہو جانے کے بعد بھی یہ کتب خانہ عرصہ تک قائم رہا، راقم الحروف نے جب ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں اس کو دیکھا ہے، تو متوسط درجہ کا کتب خانہ تھا جس میں قلمی کتابوں کے علاوہ مطبوعات بھی تھیں، متولی صاحب فرماتے تھے کہ اس میں سے بڑا حصہ جوناگڈھ والے اٹھالے گئے،

مدرسہ ہدایت بخش کا کتب خانہ

احمد آباد میں مولانا شیخ نور الدین یگانۂ روزگار عالم اور متقی صوفی تھے، فلسفہ، منطق، ریاضی کی تعلیم مولانا احمد بن سلیمان متوفی ۱۱۰۶ھ سے حاصل کی تھی، جو مخدوم شیخ ابراہیم بن سلیمان کے حقیقی بھائی تھے، ان کے لئے شیخ الاسلام نے ایک عمارت مدرسہ ہدایت بخش کے نام سے تیار کرا دی تھی، اس کی تعمیر میں ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیہ خرچ ہوئے تھے، ۱۱۱۱ھ میں مدرسہ کی عمارت مسجد اور دار الاقامہ کی عمارتیں بن کر تیار ہوئیں[1]، اسی کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جس میں ہر فن کی کتابیں موجود تھیں، خواص کے سوا عوام بھی اس کتب خانے سے فیضیاب ہوتے تھے، افسوس کہ مرہٹہ گردی میں یہ کتب خانہ تباہ ہو گیا، اس کی متعدد کتابیں کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ حیدرآباد میں موجود ہیں، محلہ والوں کی دیکھ بھال سے مسجد البتہ اب تک قائم ہے،

مدرسہ ولی اللہ کا کتب خانہ

احمد آباد میں تلیا مل کے متصل جو مسجد ہے، اسی کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ تھا، ۱۱۵۵ھ میں مولانا عماد الدین اس کے ناظم تھے، اس کے متعلق ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں تقریباً ہر فن کی کتابیں موجود تھیں، اور بہت سی فن کی منتخب کتابیں تھیں، مرہٹہ گردی میں اس مدرسہ اور کتب خانہ کا حال بھی ابتر ہو گیا، اس خاندان میں جب علمی چرچا کم ہو گیا، تو کتب خانہ کی حفاظت کا خیال بھی جاتا رہا، اہلِ خاندان نے شایقین کو خود بہت سی کتابیں دیدیں،

---

[1] خاتمہ مراۃ احمدی کلکتہ، ص ۵،

کچھ کیڑوں کی تواضع میں صرف ہوئیں، غرض اس طرح تمام کتب خانہ منتشر ہوگیا، بقیہ کتابیں جو اس وقت موجود ہیں، ان سے قیاس ہوتا ہے کہ کتب خانہ بہت بڑا اور گوہر ہائے نایاب کا بیش بہار خزانہ ہوگا، کیونکہ اس علمی خزانہ کے لٹ جانے کے باوجود آج بھی اس میں بہت سی نایاب اور بیش بہا کتابیں موجود ہیں، جو احمد آباد کی درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانہ میں وقف کردی گئی ہیں،

شیعہ بوہروں کا کتب خانہ احمد آباد گیارہیں صدی ہجری کے وسط تک شیعہ اسماعیلی بوہروں کا مرکز رہا ہے، ان کا والی یا داعی یہیں رہتا تھا، اور ان کے مدارس بھی زیادہ تر یہیں قائم تھے، داعی کے زیر نگرانی ایک بڑا عالیشان کتب خانہ بھی تھا جس میں ہر فن کی کتابیں تھیں، ۱۰۶۵ھ کے بعد کتب خانہ جام نگر (کاٹھیاواڑ) میں منتقل کردیا گیا[1]، یہ کتب خانہ آج بھی داعی وقت سیدنا طاہر سیف الدین کی نگرانی میں بمقام سورت اچھی حالت میں ہے، قوم کے مخصوص علماء اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ۱۰۰۰ھ (دسویں صدی) کے آخر میں یہاں ایک اور کتب خانہ سلیمانی بوہروں کی طرف سے قائم کیا گیا تھا جس میں زیادہ تر مذہبی کتابیں تھیں، یہ کتب خانہ بھی آج تک ان کے داعی کے پاس موجود ہے،

کھنبایت کے کتب خانے کھنبایت ایک چھوٹی سی مسلمان ریاست ہے، اس زمانہ میں اس کی آبادی بارہ لاکھ تھی، اس لئے اس کے حکمران مومن خان اول کے وقت سے یہاں ہمیشہ عربی، ایرانی اور ہندوستانی علماء اور فضلاء کا مجمع رہا، اور یہاں متعدد کتب خانے موجود تھے لیکن جب ریاست پر زوال آیا تو یہ علمی شیرازہ بھی بکھر گیا، اور کتب خانہ برباد ہوگیا، کھنبایت کے بعض خاندانوں میں اس کا بقیہ حصہ موجود ہے، چنانچہ سید غلام عباس

---

[1] موسم بہار جلد سوم صفدری بمبئی / بیان سیدنا داؤد

محمد علی صاحب کے یہاں سنہ ۱۹۲۱ئہ میں راقم الحروف نے اس کتب خانہ کی بعض کتابیں دیکھیں، اس میں ایک قرآن پاک بھی بخط نستعلیق تھا، جسے لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کی تحریر سمجھ کر بڑی غوت کرتے تھے، محکمۂ قضاۃ کا بھی ایک کتب خانہ تھا، جو ضائع گیا، اور موجودہ قاضی صاحب کے پاس چند معمولی کتابیں رہ گئی ہیں،

ایک دوسرا کتب خانہ عبد اللطیف دیوان صاحب کا تھا، جس کو ان کے وارث نہ سنبھال سکے اور آخر میں وہ برباد ہو گیا، باقی کچھ کتابیں ایک بقّال نے قرض میں لے لیں، اس بقّال نے راقم الحروف کو یہ کتابیں دکھائیں لیکن افسوس کہ ان میں کوئی کام کی کتاب نہ تھی، سب معمولی فارسی کی تھیں،

احمد آباد کے محکمۂ قضاۃ کا کتب خانہ

اسلامی عہد میں احمد آباد کے قاضی شہر کا درجہ بہت بلند ہوتا تھا، وہ پورے ضلع کے محکمۂ قضاۃ کا نگران بھی ہوتا تھا، اس لئے اس کے پاس کتب خانہ بھی ضروری تھا، چنانچہ احمد آباد کے قاضی شہر کے پاس اس وقت بھی ایک کتب خانہ موجود ہے، جو اسلامی سلطنت کے زمانہ سے عہدہ قضاۃ کے ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے، لیکن اولاد بے علم ہونے کے سبب سے اس کا بیشتر حصہ ضائع گیا ہے، اب سنا ہے کہ کچھ حفاظت کا خیال پیدا ہوا ہے، اور کتابیں، صندوقوں سے نکال کر الماریوں میں رکھی گئی ہیں،

راقم الحروف تین بار اس کو دیکھنے کے لئے گیا، لیکن نامعلوم مصالح کی بنا پر قاضی صاحب نے دیکھنے کی اجازت نہ دی، اور بہ لطائف الحیل ٹال دیا،

شیخ حضرمی کا کتب خانہ

احمد آباد میں شیخ عبد القادر حضرمی متوفی ۱۰۳۸ھ ایک مشہور بزرگ گذرے ہیں[1] ان کی تصنیفات میں سے النور السافر فی اعیان القرن العاشر بڑی مشہور کتاب ہے، خیال آتا ہے، کہ سول اسپتال سے مشرق کو جو گلی گئی ہے، اس کے اختتام کے بعد محلہ جوہری باڑہ میں ان کی

---

[1] خلاصۃ الاثر جلد ثانی ص ۴۴۰۔

قبر ہے، اُن کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا[۱] لیکن اب بجز مقبرہ کچھ نہیں ہے، شیخ عبدالقادر بڑے مورخ، محدث اور صوفی تھے، اس لئے غالباً تصوف، تاریخ اور حدیث کی کتابیں اس میں زیادہ رہی ہونگی،

چانپانیر (گجرات)، ایک زمانہ تک پایہ تخت رہا ہے، سلطان محمود اول کے زمانہ میں مولانا نصراللہ یہاں کے قاضی شہر بڑے عالم اور متقی مانے جاتے ہشتبہ مال سے ہمیشہ بچتے تھے، ان کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جس کا تعلق محکمۂ قضاۃ سے تھا،

بھڑوچ کے محکمہ قضاۃ کا کتب خانہ بھڑوچ (گجرات)، میں بڑا قدیم شہر ہے، یونانی فوجیں جب ہندوستان میں آئی تھیں، اس وقت بھی یہ شہر موجود تھا، اسلامی عہد میں اپنے ضلع کا مرکز تھا، اس لئے یہاں ہمیشہ قاضی کا محکمہ قائم رہا، آخری دور میں یہ عہدہ مولانا سید احمد شیرازی کے خاندان میں منتقل ہوا، اُن کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس کا بقیہ حصہ اب تک ان کی اولاد میں موجود ہے،

۱۹۳۲ء میں راقم الحروف نے اس کو دیکھا تھا، اب بھی اس میں بعض نایاب قلمی کتابیں موجود ہیں، قاضی نورالدین صاحب فرماتے تھے[۲] کہ میں خردسال تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا، اس لئے میرے ہوش سنبھالنے تک اس کتب خانہ کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا، اس کتاب خانہ کی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں،

مثنوی مولوی روم مکتوبہ ۱۰۹۰ھ جلد پنجم، جدید طرز سے ایڈٹ کی ہوئی محیط سرخسی جلد ثانی مکتوبہ ۹۰۵ھ حدیث میں کتاب المخازن المعروف بطرز جدید جلد ثانی، کتاب الخلاصہ فی الفتاوی مولفہ طاہر ابن احمد بن عبدالرشید البخاری، مجمع البحرین، ترجمہ اُپن کھت، پرم ہنس از اتھرن وید وغیرہ،

شیخ مہائمی کا کتب خانہ شیخ علاء الدین علی بن احمد مہائمی، (بمبئی) کے رہنے والے تھے، ۸۳۵ھ وفات پائی اور وہی مدفون ہوے، ان کا مقبرہ آج تک زیارت گاہ خلائق ہے، شیخ اپنے وقت کے

---

[۱] یاد ایام ص ۸۰ علی گڈھ، [۲] قاضی صاحب موصوف اسی خاندان کے ممتاز فرد ہیں، اور فی الحال اپنے آبائی عہدہ قضاۃ پر مامور ہیں، علمی ذوق بھی رکھتے ہیں،

بہت بڑے عالم صوفی اور بہت سی مفید کتابوں کے مصنف تھے،

آپ کے پاس بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا جو عرصہ تک قائم رہا لیکن پھر متولیوں کی بے توجہی سے اصلی کتب خانہ ضائع ہوگیا، ۱۹۳۲ء میں جب راقم الحروف وہاں گیا، تو دیکھا کہ ایک جدید کتب خانہ درگاہ شریف میں قائم ہے جس میں عربی فارسی، اردو کی کتابیں تھیں، ناظم کتب خانہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قدیم کتب خانہ کی بقیہ کتابیں، اسی میں شامل کر دی گئی ہیں، یاد آتا ہے کہ شیخ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی کتاب مجھے دکھائی گئی تھی، لیکن عجلت کے باعث میں اس کو نوٹ نہ کرسکا،

سورت کے نواب صاحب کا کتب خانہ	سورت کے نواب صاحب کے پاس بھی ایک کتب خانہ قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے، یہ غالباً سورت کا سرکاری کتب خانہ ہے، جو وراثت میں

نواب صاحب کو ملا ہے، راقم الحروف اس کو دیکھنے کے لئے دو بار گیا لیکن نواب صاحب سورت سے باہر تشریف لے گئے تھے، اس لئے ناکامیاب رہا،

خاندان عیدروس کا کتب خانہ	سورت کے شرفا میں عیدروس صاحب کا خاندان مشہور خاندان ہے، یہ خاندان سلطان محمود بن لطیف خان کے عہد ۹۵۸ھ میں حضرموت سے احمد آباد میں

آیا، پھر ان کے لڑکے بھروچ میں اور پوتے سورت میں ۹۷۵ھ میں وارد ہوئے، جاء الجواد الفیاض اس آمد کی تاریخ ہے[1]،

یہ خاندان ہمیشہ سے صاحب علم رہا ہے، اور اس نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رکھا، اس کے پاس ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جو سلسلہ بسلسلہ اس وقت تک خاندان میں چلا آرہا ہے ۱۹۳۲ء میں راقم الحروف نے اس کتب خانہ کو دیکھا تھا، اب بھی بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے،

[1] کتاب مزارات سورت و بھروچ مولفہ عبد الحکیم متوفی ۱۲۶۱ھ قلمی کتب خانہ عیدروس سورت،

حدیث، تصوف، ادب، تاریخ کی کتابیں زیادہ ہیں،

سید قمر الدین کا کتب خانہ سورت ہی میں ایک اور کتب خانہ سید قمر الدین مرحوم کا ہے، ضائع ہوتے ہوتے جس کی اب تین الماریاں رہ گئی ہیں، راقم الحروف ۱۹۳۲ء میں اس کو دیکھنے کیلئے گیا، تو اسوقت گھر میں کوئی مرد نہ تھا، پردہ کرا کے اس کتب خانہ کی سیر کی،

افسوس ہے کہ اس میں کوئی نایاب کتاب نہ ملی، صرف ایک کتاب جس کا نام اللہ خدائی ہے، قابل ذکر نظر آئی، یہ خالق باری کے طرز کی تھی،

اس کے دو ابتدائی شعر یہ ہیں،

ہے حمد پاک اور احد یکہ | جان ام القریٰ کو تو مکہ
اب، پدر، باپ، والدہ مائی | ہست اقوی برادرا بھائی

یہ کتاب ۱۲۸۰ھ میں بمقام بمبئی اسماعیل شیرازی کے ذریعہ طبع ہوئی ہے،

دوسری کتاب کلام اقدس" ہے، اس کے مصنف حضرت پیر محمد شاہ بیجاپوری ہیں، جو چالیس برس تک احمد آباد کی جامع مسجد میں معتکف رہے، یہ شاعر بھی تھے، تخلص اقدس، تھا، اردو کے مشہور شاعر ولی گجراتی کے ہمعصر تھے، متعدد نظمیں اردو میں لکھی ہیں، ان کا دیوان بہت نایاب ہے، راقم الحروف نے ایک مکمل نسخہ احمد آباد میں دیکھا ہے، اور یہ دوسرا نسخہ ہے، یہ دیوان ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، معتقدین اس کو آنکھوں سے لگاتے ہیں، مگر طبع کرنے کے خلاف ہیں،

خانقاہ شاہ عبد العلیم کا کتب خانہ بھروچ سے متصل ایک قصبہ انکلیشور ہے، یہاں شاہ عبد العلیم صاحب کی خانقاہ اور درگاہ و مسجد ہے، یہاں بھی قدیم زمانہ میں بڑا کتب خانہ تھا، اور چونکہ سورت کے راستہ میں پڑتا تھا، اور قافلوں کا پڑاو یہاں ہوتا تھا، اس لئے یہ قصبہ بڑا آباد ہو گیا تھا، اہل علم اس کتب خانہ سے فائدہ اٹھاتے تھے، اب یادگار کے طور پر تھوڑی

کتابیں رہ گئی ہیں،

میسور کا شاہی کتب خانہ

مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانہ میں جب میسور میں نواب حیدر علی نے اپنی خود مختار سلطنت قائم کی، تو یہاں بھی شمع علم کے پروانے ادھر ادھر سے آکر جمع ہونے لگے،

پھر ٹیپو سلطان کی قدر دانی نے میسور میں اہل کمال کا بڑا گروہ جمع کر لیا، جو افسوس ہے کہ اس کے بعد پھر کبھی نظر نہ آیا ٹیپو سلطان کے پاس جو صاحب علم خصوصًا اہل کمال پہنچتا تو وہ اپنی جوہر شناسی سے اس کو اسی کام میں لگا دیتا، جس کا وہ اہل ہوتا، چنانچہ اس نے کسی کو محکمہ جنگ میں، کسی کو توپ خانہ میں، اور کسی کو بحری بیڑہ میں جگہ دی، اسی طرح علماء میں سے کسی کو تعلیم، کسی کو تصنیف اور کسی کو ترجمہ پر مقرر کیا تھا،

اس نے ایک یونیورسٹی بھی قائم کی تھی، جس کے ماتحت مختلف علوم و فنون کے شعبے کھولے جا رہے تھے، اس سے متعلق ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا، جس میں تمام علوم و فنون کی کتابیں تھیں،

۱۲۱۳ھ (۱۷۹۹ء) میں جب سلطان شہید ہوا، اور سرنگاپٹن پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو قلعہ اور محلات شاہی کے ساتھ کتب خانہ بھی انگریزوں کے قبضہ میں آگیا، اور قصر شاہی کی دوسری چیزوں کی طرح کتب خانہ بھی تاراج ہو گیا، اس لوٹ کے بعد جو کتابیں بچیں وہ چھ سال تک کس مپرسی کے عالم میں پڑی رہیں، اس کتب خانہ کی کتابیں کچھ تو رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور باقی لندن روانہ کر دی گئیں،

۱۸۰۸ء میں میجر اسٹورٹ نے ان باقی ماندہ کتابوں کی جو فہرست شائع کی تھی، اس میں فنون کے لحاظ سے کتابوں کی تعداد مندرجۂ ذیل تھی،

قرآن مجید	۴۴	ریاضی	۷۵	حدیث	۴۲
تصوف	۵۶	ہندی نظم	۲۳	آرٹس	۱۹

نجوم	۲۰	وظائف	۳۵	زبان	۴۵
نظم	۱۹	فقہ	۹۵	ترکی	۲
تفسیر	۴۱	طب	۶۲	الہیات	۴۶
اخلاق	۲۴	دکھنی	۴	فلسفہ	۵۴
قصص	۱۸	لغات	۲۹		

رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ میں جتنی کتابیں داخل ہوئیں ان میں مخصوص کتابیں یہ تھیں،

رسالہ پدکھا	روزنامۂ وکلاے حیدرآباد
منتخب ضوابط سلطانی	اتالیق شاہزادہ
رسالہ کچہری	مجموعۂ سندات
ضابطۂ اشتمال	حکمنامہ
راہ فتن دسوار	فرمان
فتح المجاہدین	فرامین کا مجموعہ
وقائع منازل	

صرف اردو زبان کی کتابیں انڈیا آفس لندن میں جو داخل کی گئیں۔ ان میں سے مخصوص نایاب کتابیں مندرجۂ ذیل ہیں،

تذکرۂ شعراے ہندی	مؤلفہ فتح علی حسین خان	قصۂ ماہ پیکر	مولفہ
علی نامہ	" ملا نصرتی	قصہ بہرام وگل اندام (کرم)	" طبعی مکتوبہ ۱۰۸۷ھ
گلشنِ عشق	"	دیوان رفیع سودا	" مرزا سودا

کلیات قطب شاہ	مولفہ قطب شاہ	قصائد رفیع سودا،	مولفہ مرزا سودا
روح افزا (قصہ رضوان شاہ)	فائز	سری گینش	ترجمہ سنسکرت
قصہ ماہ پیکر	″	سندر سنگھار ہندی	″
قصہ بہرام و گل اندام	″ طبعی گول کنڈوی	دھوری ہندی	شاہ درویش گجراتی تصوف
پھول بن	″ ابن نشاطی	روضۃ الشہداء	سیوا گل برگوی
طوطی نامہ	″	رسالہ سرود و راگ یعنی }	. . . . .
قصہ پدماوت دکھنی	″	مجموعہ قدیم دکھنی غزلیات }	
قصہ لعل و گہر	عارف الدین خان عاجز	نشاط العشق شرح غوثیہ	ترجمہ
دیوان یقین	″ انعام اللہ خان یقین	ترجمہ مفتاح الصلاۃ	فتح محمد برہان پوری
بھوگ بل	″ مترجمہ شہاب الدین	خلاصہ سلطانی	سید امام الدین و محمد صمد قاضی
مفرح القلوب	″ حسین علی		سرنگاپٹن،
قصہ رضوان شاہ	مولفہ فائز	کلیدِ زبان تلنگی	. . . . .

اسی طرح ونڈسر کیسل کے کتب خانہ میں قرآن مجید کا وہ نسخہ بھی موجود ہے، جو خاص شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، بہترین خط نسخ میں اعلیٰ نقش و نگار سے مزین ہے،

کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت نوے ہزار تک آنکی گئی ہے یہ نسخہ بھی اسی ٹیپو سلطان کے کتب خانہ کی نادر چیز تھی[۱]،

مدرسہ عربیہ خانقاہ کا کتب خانہ | صوبہ بہار میں سہسرام مشہور جگہ ہے، جس کو شیر شاہ کی ولادت گاہ

---

[۱] تاریخ میسور ص ۳۵۵ مطبوعہ بنگلور

ہونے کا فخر حاصل ہے، یہاں بارہویں صدی کی ابتدا میں ایک بزرگ شاہ کبیر درویش رہتے تھے، ١١٢٩ھ میں فرخ سیر بادشاہ نے ایک لاکھ درہم آمدنی کے اٹھارہ مواضع شاہ صاحب کو نذر کئے جن پر اُن کے جانشین شاہ خلیل اللہ صاحب نے قبضہ کیا، اس کے بعد ١١٧٥ھ میں شاہ عالم ثانی نے بھی ١٤ مواضعات التمغا کے طور پر عنایت کئے،[1]

اس خانقاہ کے متعلق ایک مدرسہ بھی قائم ہوا تھا، جو آج تک موجود ہے، مدرسہ کا نام مدرسہ عربیہ خانقاہ ہے، غالبًا خانقاہ کی بنیاد ہی سے اس میں کتب خانہ قائم کیا گیا ہوگا، جیسا کہ عام طور سے دوسری خانقاہوں میں دستور تھا، لیکن مدرسہ عربیہ کے قیام کے بعد اس کا تعلق مدرسے کر دیا گیا،

یہ کتب خانہ بہت بڑا اور بہت بیش قیمت تھا، اس کی قیمت کا اندازہ تقریبًا ایک لاکھ کیا جاتا ہے، غالبًا مدرسہ کے ساتھ یہ کتب خانہ آج بھی موجود ہے،

راجہ شتاب رائے کا کتب خانہ

سلطنت مغلیہ کے آخر زمانہ میں پٹنہ (بہار) کا ناظم شتاب رائے تھا، جو علوم وفنون کا مربی، اور اہل علم کا بڑا قدردان تھا، اس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا راجہ کلیان سنگھ ناظم ہوا، یہ خود کئی کتابوں کا مصنف اور شاعر تھا، اس کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جس میں زیادہ تر فارسی ادب کی اور کچھ تاریخ کی کتابیں تھیں، زمانہ کے ساتھ ساتھ جس طرح اس کی اولاد فارسی سے نابلد ہوتی گئی، اسی طرح آہستہ آہستہ کتب خانہ بھی غفلت کی نذر ہوتا گیا،

ابھی چند سال ہوئے ایک نمائش کے موقع پر چند اہل علم نے اس خاندان کے ایک معزز ممبر سے اس کتب خانہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے ازراہ لطف وکرم کتابیں دکھائیں جو صندوقون

[1] تاریخ سہسرام ص ٩ مطبوعہ دیوبند، [2] تاریخ مذکور ص ١٠٢،

میں رومی کاغذون کی طرح بھری ہوئی تھیں، فی الحال اس میں کوئی نایاب نسخہ دستیاب نہ ہوا،

راجہ رام نرائن کا کتب خانہ

اسی طرح راجہ رام نرائن کے پاس بھی جو شتاب رائے سے پہلے وہان کا دیوان تھا، ایک کتب خانہ تھا جس کی کتابیں اس کے اخلاف کے پاس اب تک موجود ہیں،

صادق پور پٹنہ کے کتبخانے

اس کے علاوہ مولوی احمد اللہ صاحب بن مولوی الٰہی بخش صاحب جعفری اور مولوی ولایت علی صاحب بن حکیم ارادت حسین صاحب محلہ صادق پور پٹنہ میں بڑے صاحب علم اصحاب تھے، ان کے پاس بھی اپنا ذاتی کتب خانہ تھا، غدر ۱۸۵۷ھ میں حکومت نے ان کی تمام جائداد و املاک ضبط کرلی، اسی میں کتب خانہ بھی تھا، اس طرح اس کتب خانہ کا بڑا حصہ تو لندن پہنچ گیا، اور کچھ خدا بخش خان کی لائبریری میں آج بھی موجود ہے، بعض کتابیں ان کے اعزہ کے پاس بھی ہیں، مثلاً شمس العلوم، علم لغت میں تبرکاً اس خاندان میں چلی آرہی ہے، عظیم آباد کے محلہ کیوان شکوہ، حاجی گنج، شاد منزل، تیڑھی گھاٹ دھولپورہ وغیرہ میں اکثر امرائکے پاس ذاتی کتب خانے موجود تھے، جیساکہ عظیم آباد کے بزرگوں سے معلوم ہوا، لیکن اسلاف کے علمی شوق کی اخلاف نے کوئی قدر نہ کی کتابین، ضائع ہوگئین یا بُرے حال میں ہیں،

خانقاہ عباسی کا کتب خانہ

صوبہ بہار میں بھاگلپور کی خانقاہ عباسی محلہ مشہور خانقاہ ہے، یہان بھی ایک کتب خانہ تھا، اسی طرح پھلواری شریف کی خانقاہ بھی قدیم ہے، اور ہمیشہ سے ارباب علم و فضل کا مرکز رہی ہے، اور اب تک یہان رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا ہے، یہان بھی کتب خانہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے،

سلاطین فاروقیہ کا کتب خانہ

سلطان فیروز شاہ تغلق کے آخری عہد میں بڑے بڑے صوبون پر

جن لوگوں کو ناظم بنایا گیا تھا، وہ اس کی وفات کے بعد خود مختار ہو گئے، ان ہی میں سے ملک راجہ بھی تھا جس نے اپنا نسب حضرت فاروق اعظمؓ سے ملایا تھا اسی لیے اس سلطنت کا نام فاروقی ہے، سلطنت فاروقی ساتوین صدی کے آخر سے شروع ہوئی، اور ۱۰۰۸ھ میں اکبر اعظم کے ہاتھون اس کا خاتمہ ہوا، یہ خاندان بھی علما، فضلا، شعرا اور صوفیون کا قدردان تھا، اسکے پاس بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا، فرشتہ کا بیان ہے کہ خواجہ مرزا علی اسفرائنی نے اس کتب خانہ کو دیکھا تھا، خود فرشتہ نے جب وہ ۱۰۱۳ھ میں برہان پور گیا ہے، اس کتب خانہ کی سیر کی، اس میں اس کو ایک کتاب ایسی ملی جس میں شاہان فاروقی کے سنین جلوس و وفات تحریر تھے جس سے فرشتہ نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے[1]،

برطانوی عجائب خانہ میں ایلیٹ صاحب کے کاغذات کے ساتھ ملک الشعرا فیضی کا ایک رقعہ بنام راجہ علی خان فاروقی والی خاندیس محفوظ ہے، اس رقعہ میں اس نے والی خاندیس سے استدعا کی ہے کہ تغلق نامہ کا جو نسخہ اس کے پاس ہے، اسکے اوّل اور آخر کے چند اوراق ضائع ہو گئے ہیں اس لیے وہ اپنے نسخہ سے ان کو نقل کرا کے بھیجدے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"از کتاب تغلق نامہ کہ از انفاس مقدسۂ امیر خسرو ہست چند ورق از اول و چندے از آخر رفتہ التفات فرمودہ دو جز از اول و ہمین قدر از آخر بہ یکے از خدمت گاران امر فرمایند کہ بہ خطے مسودہ نمودہ بصحبت بندہ مصحوب حاملان عریضہ فرستند[2]"

اس تحریر سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ والی خاندیس کے پاس کوئی بڑا کتب خانہ تھا، لیکن اشارۃً اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے، کہ والی خاندیس کو علمی اور ادبی ذوق ضرور تھا، اس لیے وہ اپنے مذاق کی منتخب پسندیدہ کتابون کا مجموعہ اپنے پاس رکھتا تھا،

---

[1] فرشتہ ص ۲۷۷، نولکشور ج ۲ [2] معارف نمبرہ ۵ جلد ۳۶ ص ۳۴۶،

شاہان اودھ کا کتب خانہ مغلیہ سلطنت کے کمزور ہو جانے پر بارہویں صدی ہجری کے وسط میں برہان الملک سعادت علی خان کو اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا، کچھ دنوں کے بعد اس نے خود مختار ہو کر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی، اس کی آٹھ پشتوں نے ۱۸۵۶ء تک اودھ کے پایہ تخت لکھنؤ میں حکومت کی دہلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ کا شباب تھا، نواب آصف الدولہ کی بدولت اہل علم و صاحب کمال لکھنؤ میں جمع اور مختلف علوم و فنون کے لیے مدرسے قائم ہو گئے، ان کے ساتھ ساتھ کتب خانے بھی قائم ہوئے ہوں گے، چنانچہ لکھنؤ میں متعدد مشہور کتب خانے تھے، ان میں شاہی کتب خانہ کا حال ایک انگریز اسپرنگر نے جو ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ آیا تھا، لکھا ہے،

شاہی کتب خانہ قدیم دولت خانہ میں تھا، یہ دولت خانہ رومی دروازہ کے پاس لوہے کے پل کے پیچھے گومتی کے نزدیک تھا، افسوس ہے کہ اس دولت خانہ کا اب کوئی نام و نشان بھی نہیں رہا، غالباً وکٹوریہ پارک اور لوہے کے پل کے درمیان کسی جگہ رہا ہوگا، اس میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں، غازی الدین حیدر نے اس کو زیادہ ترقی دی،

ایک دوسرا کتب خانہ موتی باغ کے محل میں تھا، اس میں زیادہ تر ادبی کتابیں تھیں، یہ محل آج بھی گومتی کے کنارے قیصر باغ سے تھوڑے فاصلہ پر موجود ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد سلیمان قدر اس میں رہتے تھے، اب اسکا نام موتی محل، ہو گیا ہے، اس محل میں تین ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں، جو زیادہ تر چیدہ اور منتخب تھیں،

ایک اور کتب خانہ فرح بخش محل میں تھا، اس میں کتابیں گو ایک ہزار سے کم تھیں، لیکن قیمت کے لحاظ سے یہ بڑا بیش بہا کتب خانہ تھا، اس کتبخانہ کی ہر کتاب مطلا و مذہب تھی، اور یہ کتب خانہ نقاشی اور طلاکاری کا بہترین نمونہ تھا، واجد علی شاہ کے حکم سے یہ خاص کتبخانہ عام شاہی کتب سے علٰحدہ جمع کیا گیا تھا، اس لئے اگر اس کو واجد علی شاہ کا ذاتی کتبخانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا،

ان سب کتب خانوں کی حفاظت کا معقول انتظام تھا، اور ایک گونہ اچھی حالت میں تھے،

لیکن سلطنت کی سیاسی بدنظمی کا ان پر بھی کافی اثر پڑا، اور کتب خانہ کے ناظمون کی جلد جلد تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ناظم کو اس کے ترتیب دینے کا موقع نہ مل سکا، دیواری الماریون میں یہ کتابیں بھری تھین، اور چونکہ ان میں کوئی ترتیب نہ تھی، اس لئے افسران کتب خانہ جائزہ لیتے اور دیتے وقت محض جلدون کا شمار کرا دیتے تھے، اس کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی نایاب اور قابل قدر کتابیں کتب خانہ سے نکل گئین اور جلد شماری کے لیے اس کی جگہ معمولی کتابین رکھ دی گئین، چنانچہ اسپرنگر لکھتا ہے کہ ناظم کتب خانہ نے دس ہزار قیمت کی کتابیں فروخت کر کے اپنے لڑکون کی شادی کی، راقم الحروف نے بھی شاہی کتب خانہ کی مہر شدہ کتابیں ہندوستان کے متعدد کتب خانون میں دیکھی ہیں جس سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے، راجہ صاحب سلیم پور کے کتب خانہ میں ایسی متعدد کتابین آج بھی موجود ہیں، شاہی کتب خانہ کی بقیہ کتابیں ۱۸۵۷ء کے بعد لندن بھیج دی گئین،

زبان کے لحاظ سے ان کتب خانون میں عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت، ترکی، اور پشتو کی کتابین تھین، فنون کے لحاظ سے تصوف، تذکرہ، تاریخ کے ساتھ ادب کا بڑا ذخیرہ تھا جس میں دواوین کا حصہ سب سے زیادہ تھا،

اودھ کے شاہی کتب خانہ کی نسبت جو کچھ لکھا گیا، یہ اس وقت کا حال ہے، جب کہ سلطنت دم توڑ چکی تھی، کتب خانہ تباہ و برباد ہو چکا تھا، اور اسپرنگر صاحب نے محض بچی کھچی کتابون کی فہرست تیار کی تھی، ورنہ عبد اللطیف شوستری نے جو آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آیا تھا، اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ "علامی تفضل حسین خان کے ساتھ میں نے کتب خانہ کا معاینہ کیا، تقریباً تین لاکھ کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں، اور ہر سو جلد پر ایک آدمی مقرر ہے،

زبان کے اعتبار سے یہ کتب خانہ عربی، فارسی، اور انگریزی کی نظم و نثر کی کتابون پر مشتمل تھا، خوشنویسون کے قطعات کے علاوہ ایرانی ہندی، رومی اور یورپین مصوری کے بہترین نمونے اس کثرت

---

[1] فہرست کتب خانہ شاہان اودھ مطبوعہ لندن،

سے اس میں ہیں کہ ان سب کو دیکھنے کے لیے عمر نوح کی ضرورت ہی علمی کتابوں کے بے شمار نسخے دیکھنے میں آئے، جیسے شرآئع، مدارک، مسالک، مفاتیح کشکول، بحار الانوار وغیرہ

اس کتب خانہ میں مصنفون کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں بھی بہت ہیں، مہتم کتب خانہ نے بتایا کہ سات سو جلدیں خود مصنفون کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہیں۔ دہلی کی سلطنت جب تباہ ہوئی تو وہاں کے کتب خانہ کی کتابیں زیادہ تر لکھنؤ کے اس شاہی کتب خانہ میں منتقل ہوگئیں، حق یہ ہے کہ یہ کتب خانہ اس قدر نادر روزگار ہے، اور ایسا بیش بہا ہے کہ شاہی خزانہ کے جواہرات اس کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچتے۔[1]

اس بیان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بارہوین صدی کے آخر میں شاہان اودھ کا کتب خانہ کتنا عظیم الشان اور اس کا انتظام کس قدر بہتر تھا لکھنؤ میں ایک مشہور کتب خانہ مرزا سلیمان شکوہ کا تھا، مرزا سلیمان شکوہ دہلی کے بے بصر بادشاہ شاہ عالم کے تیسرے بیٹے تھے، ۱۲۰۵ھ میں قلعہ معلیٰ سے بھاگ کر لکھنؤ پہنچے لکھنؤ میں آصف الدولہ کی حکومت تھی، بڑی عزت کے ساتھ "ٹیڑھی کوٹھی" میں قیام کا انتظام کر دیا، اور چھ ہزار ماہوار ان کے اخراجات کے لیے مقرر کر دیے، مرزا سلیمان شکوہ بڑے علم دوست تھے، دہلی کے ارباب فن ان کے دربار میں آہستہ آہستہ جمع ہوگئے، خود بھی شاعر تھے، اور شاعروں کی قدر افزائی میں ہمیشہ ساعی رہے، ان کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، اسی کتب خانہ میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے متعدد دیوان مصنف کے زیر ہدایت لکھے گئے تھے جن کی پانچ جلدیں اس وقت بھی کتب خانہ رامپور میں موجود ہیں، اور مرزا سلیمان شکوہ کے کتب خانہ کی مہر اس پر لگی ہے۔[2]

لکھنؤ کے ضلع میں کاکوری شرفاء کا ایک مشہور قصبہ ہے، جہاں برٹش گورنمنٹ کے عہد میں بھی عرصہ تک علم کا چرچا رہا، وہاں صاحب ذوق امراء کے سبب سے بہت سے علماء، شعراء، اور ادیب رہتے تھے، اور ان ہی کے سبب سے مدارس، کتب خانے، اور علمی مجلسیں قائم تھیں، ان ہی میں سے ایک

---

[1] تحفۃ العالم ص ۳۴۹، ۳۵۰ مطبوعہ بمبئی [2] فہرست کتب خانہ رامپور

مقام "امیر محل تھا" جہان ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا گیا تھا، اس کتب خانہ میں ایک تذکرہ "بیاض نورِ ازل"، تھا جس کو شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ۱۲۰۹ھ میں تصنیف کیا تھا، اور اس کی نقل در نقل ۱۲۳۹ھ میں ہوئی، جو امیر محل کے کتب خانہ میں داخل ہوئی، اور اس وقت کاکوری کے مشہور علم دوست مشیر احمد صاحب علوی بی۔ اے کے پاس موجود ہے[1]۔

فرنگی محل کا کتب خانہ صوبہ اودھ کے مشہور قصبات میں سے ایک "سہالی" بھی ہے جہان شیخ نظام الدین انصاری مشہور عالم بزرگ سکونت پذیر تھے اور ان کا فیض جاری تھا،

اکبر کے زمانہ میں ان کے پوتے شیخ حافظ نے بڑی شہرت حاصل کی، ان کے علم کا غلغلہ سنکر بادشاہ نے ازراہ قدردانی ان کے لیے جاگیر مقرر کر دی، ان کی چوتھی پشت میں ملا قطب الدین ہوئے، یہ اس پایہ کے بزرگ تھے، کہ خود عالمگیر نے ان سے ملنے کی خواہش کی تھی، جب انکو دشمنون نے شہید کر دیا، تو ان کے لڑکے ملا نظام الدین لکھنؤ چلے آئے، بادشاہ نے ازراہ قدردانی فرنگی محل، جہان پہلے پرتگیز تاجرون کی کوٹھیان تھیں ان کے قیام کے لئے مرحمت کیا، ملا نظام الدین نے اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر وہ شہرت حاصل کی جو خاندان شاہ ولی اللہ کے سوا ہندوستان میں کم کسی کو نصیب ہوئی،

آپ نے جو مدرسہ فرنگی محل میں قائم کیا تھا، وہ آگے چل کر عربی و دینی علوم کی ایک بڑی عظیم الشان یونیورسٹی ہو گئی، اس کے لیے ایک کتب خانہ کا ہونا ضروری تھا، خود ملا نظام الدین کے زمانہ میں یہ کتب خانہ کس حیثیت کا تھا، اس کے متعلق تفصیلی حالات نہیں معلوم، لیکن اس قدر علم ہے کہ ملا صاحب کے بعد ان کے جانشینون نے اس کتب خانہ میں بڑا اضافہ کیا، یہان تک کہ مولانا عبدالحی کے زمانہ میں مطابع کے اجرا سے اس میں کتابون کا

---

[1] رسالہ نگار ص ۴۲ ، ۱ جنوری ۱۹۳۹ء

بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی وفات پر کتب خانہ کا نایاب حصہ تلف ہوگیا، راقم الحروف نے جب اس کتب خانہ کو دیکھا تو اس میں فقہ کی کتابیں زیادہ تھیں، یہ کتب خانہ فی الحال یوسفی پریس کی دو منزلہ عمارت کے مشرقی دالان میں ہے، بعض کھلی اور کچھ بند الماریون میں کتابین فن وار رکھی ہیں، غالباً یہ کتب خانہ اسی وقت کھلتا ہے جب کوئی صاحب علم اسکا مشتاق ہو،

مولانا عبدالباری صاحب کا کتب خانہ بھی نظر سے گذرا، اس میں زیادہ تر فقہ اور تصوف کی کتابیں ہیں، یہ کتابیں ان کے دیوان خانہ میں محراب کے طاقون اور دیواری تختوں پر ہیں، اور کچھ مخطوطات مدرسۂ نظامیہ کی دوسری منزل میں کھلی الماریون میں رکھے ہیں۔

لکھنؤ میں ایک اور مشہور کتب خانہ تھا، جو وہان کے مجتہد صاحب کے زیر اہتمام قائم ہوا تھا، یہ کتب خانہ ۵۷ء کے بعد بھی مجتہد صاحب کے پاس رہا، راقم الحروف نے ایام طالبعلمی میں جناب قبلہ علن صاحب مجتہد کے انتقال پر سنا تھا کہ ان کا کتب خانہ دوسرے مجتہد صاحب کو دیدیا گیا، اس کے بعد قبلہ ناصر حسین صاحب مجتہد قرار پائے، آپ کا کتب خانہ لکھنؤ میں بہت مشہور ہے، راقم الحروف نے جب اس کو دیکھا تو اس میں دو قسم کی کتابیں تھین، ایک وہ جو اصل کتب خانہ میں پہلے سے چلی آرہی ہیں، ان پر قدیم کا لفظ لکھا ہوا ہے، دوسری وہ جو خود مجتہد صاحب قبلہ نے اضافہ کی ہیں، ان پر جدید کا لفظ مرقوم ہے، قدیم کے لفظ سے خیال گذرتا ہے کہ شاید اس سے مراد وہ کتابیں ہون جو سلسلہ بہ سلسلہ مجتہدون کو کتب خانہ کی شکل میں ملتی چلی آئی ہیں،

راجہ سلیم پور کا کتب خانہ لکھنؤ کے قریب کے قصبون میں ایک قصبہ سلیم گڈھ بھی ہے جس کو آج کل سلیم پور کہتے ہیں، شاہان اودھ کے عہد سے یہان کے حکمران جو "راجہ" کے لقب سے مخاطب کیے جاتے ہیں، صاحب ذوق اور قدر دان علم و فن تھے، اور ان کو خیمون اور جواہرات کی طرح کتابون کا بھی شوق تھا، اس لیے ان کا لاجواب کتب خانہ قائم ہوگیا،

اس کتب خانہ میں تقریباً ہر فن کی کتابیں تھیں مخطوطات کا بھی بڑا ذخیرہ تھا بعض کتابیں مصوری کا نمونہ تھیں، فردوسی کے "شاہنامہ مصورہ" کی قیمت دس ہزار تک آنکی گئی تھی ہفظ الاعیان کا نسخہ تمام ہندوستان میں نادر کتاب کا حکم رکھتا ہے، حیدرآباد کے دیوانی کے کتب خانہ کے علاوہ دوسرا نسخہ اسی سلیم پور کے کتب خانہ میں ہے لیکن بہت برے حال میں ہے، راقم الحروف نے جب اس کو دیکھا، تو باوجود حفاظت کے اس کی حالت ابتر تھی جس عمارت میں یہ کتب خانہ ہے، وہ اس قدر شکستہ ہے کہ "اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند" کی مصداق ہو رہی ہے،

کتابیں بند الماریوں میں ہیں، اور ابھی تک بیشتر اچھی حالت میں ہیں، گو حفاظت کا کوئی سامان نہیں، اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں اور ہر فن کی کتابیں ہیں، فقہ، حدیث، تفسیر (شیعہ وسنی) اور ان کے اصول کی کتابیں زیادہ ہیں تاریخ اور ادب کا ذخیرہ بھی کافی ہے، مخطوطات کتب خانہ سے علاوہ توشہ خانہ میں کئی صندوقوں میں بھرے ہیں۔

بلگرام کے کتب خانے لکھنؤ کے مضافات میں ایک مردم خیز خطہ قصبہ "بلگرام" بھی ہے، جہاں قدیم عہد میں بڑے بڑے علماء، ادبا، حکماء اور صوفیہ پیدا ہوتے رہے شیخ عبدالواحد، شیخ نظام، قاضی محمود، قاضی کمال، میر عبدالواحد، مفتی امیر حیدر، سید غلام علی آزاد بلگرامی، میر عبدالجلیل بلگرامی، ڈاکٹر سید علی بلگرامی، نواب سید حسین بلگرامی جیسے اکابر اسی خاک کے درخشندہ ستارے تھے،

اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ بلگرام میں کیسے کیسے کتب خانے رہے ہوں گے، جو دست برد زمانہ سے برباد ہو گئے، تاریخ کے مطالعہ سے چند کتب خانوں کا حال معلوم ہوتا ہے،

(۱) قاضی ابوالفتح شیخ کمال فرشوری بلگرام کے اہل کمال میں تھے، ۹۱۷ھ میں پیدا ہوئے اکبر اعظم کے عہد میں قاضی مقرر کیے گئے، اس دولت و وجاہت کے باوجود تمام عمر خدمتِ علم میں

مصروف رہے، آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس میں صرف، نحو، منطق، حکمت، معانی، بیان، فقہ، اصول فقہ، تفسیر کا بڑا ذخیرہ تھا،

قاضی صاحب خوشنویس اور خطاط بھی تھے، اس لئے بڑی تعداد کتابوں کی خود ان ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اکثر کتابوں پر ایسے سیر حاصل حاشیے لکھے کہ پھر شرح کی ضرورت نہ رہی، کتابت میں صحت کا اتنا اہتمام رکھتے تھے، کہ ایک نقطہ کی بھی غلطی نہ ہوتی تھی، آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں آپ کی تحریروں کو کمال صحت کے سبب صحف آسمانی کا خطاب دیا ہے، شیخ کمال نے جو اسی برس کی عمر میں ۱۰۱۰ھ میں وفات پائی، "شیخ کمال" تاریخ وفات ہے، ان کے انتقال کے بعد کتب خانہ برباد ہوگیا، اور اکثر نادر کتابیں بلگرام سے باہر چلی گئیں[۵۱]،

(۲) بلگرام میں ایک دوسرا کتب خانہ سید عبدالواحد بلگرامی کا تھا، یہ بھی بڑے خوشنویس تھے، مختلف فنون کی کتابیں جمع کی تھیں، اس کتب خانہ میں بے شمار نسخے کلام مجید کے تھے،

(۳) سید عبداللہ بلگرامی اپنے زمانہ کے مشہور فضلا میں تھے ان کو خوشنویسی میں بھی کمال حاصل تھا، کاغذ کے پھول اچھے تراشتے تھے، طبع موزون رکھتے تھے، قابل تخلص تھا، ۱۱۳۲ھ میں وفات پائی، سید صاحب نے ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا، اس میں بڑی نادر اور عمدہ کتابیں تھیں، افسوس کہ انکے بعد کتب خانہ نااہلوں کے ہاتھ لگا، اس لیے کتابیں متفرق اور منتشر ہوگئیں، اور یہ گوہر نایاب برباد ہوگیا،

(۴) علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی کی ذات علمی حیثیت سے بہت بلند تھی، شہنشاہ عالمگیر کے بعد وہ حکومت کے مختلف عہدوں پر ممتاز تھے جہاں جاتے، علمی مشغلہ ساتھ لے جاتے، کتابوں کے بے حد قدردان اور شائق تھے، سفر میں اپنے ساتھ صرف ضروری کتابیں رکھتے،

---

[۵۱] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۸

باقی کتب خانہ بلگرام میں تھا، کتابیں زیادہ تر اس عہد کے دستور کے مطابق صندوقوں میں تھیں، ایک خط میں سید محمد کو لکھتے ہیں، کہ برخوردار! کتاب روضۃ الناظر اس صندوق میں رکھی ہے جو میں گجرات سے گھر پر لے آیا تھا"

کتابوں کی حفاظت کے متعلق لکھتے ہیں، کتابوں کی احتیاط کے بارہ میں کیا لکھوں آپ پر ظاہر ہے کہ میں کتابوں کو کس قدر عزیز رکھتا ہوں، اور کتنی محنت اور تلاش سے ان کو فراہم کیا ہے، کبھی کبھی دھوپ بھی دکھایا کریں، اس کتاب خانہ میں اردو، فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کی کتابیں تھیں، فنون کے اعتبار سے ادب، ادعیہ، حدیث، طب، لغت، فقہ، صرف ونحو، وغیرہ کی کتابیں دوسرے فنون کے مقابلہ میں زیادہ تھیں، میر عبدالجلیل نے تقریبا ۷۰ سال کی عمر میں بمقام دہلی ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی[۱]،

میر صاحب کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ تک ان کی اولاد نے کتب خانہ کی حفاظت کی، لیکن پھر اس خاندان سے علمی ذوق گھٹتا گیا، تو آہستہ آہستہ کتابیں فروخت کردیں اور آج اس کا ایک ورق بھی بلگرام میں نہیں ہے، لیکن یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان کتابوں کا بڑا حصہ خصوصاً میر صاحب کی تصنیفات بلگرام سے منتقل ہو کر حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ میں داخل ہو گئیں،

(۵) علمائے بلگرام میں شاہ طیب متوفی ۱۱۵۲ھ بھی مشہور لوگوں میں تھے، وہ عرصۂ دراز تک بہ سلسلۂ ملازمت احمد آباد گجرات میں رہے، اپنے والد کے انتقال کے بعد خانہ نشین ہو گئے، ان کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، خود بھی بڑے زود نویس اور اعلیٰ پایہ کے خوشنویس تھے، اس کتب خانہ میں خوشنویسی کے اعلیٰ نمونے بکثرت تھے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں،

---

[۱] حیات جلیل ص ۲۶۱

"وکتب خانۂ عظیمے از خط خوش ہمہ خود یادگار گذاشت"[1]

(۳) نواب شیخ میر عالمگیری صاحب ثروت ہونے کے ساتھ صاحب دل بزرگ تھے، بلگرام کے سید واڑہ سے نکل کر شہر کے مشرقی جانب ایک محلہ آباد کیا، اور اس میں ضروریات کی تمام چیزیں مہیا کین کتابون کے بھی شائق تھے، چنانچہ ایک کتب خانہ بھی ان کے پاس موجود تھا، اسی محلہ میں مسجد تعمیر کرا رہے تھے کہ خود ان کی حیات مستعار کی تکمیل ہوگئی، مرتے وقت وصیت کر گئے کہ کتابون کو فروخت کر کے مسجد کی تکمیل کی جائے[2]،

والی فرخ آباد کا کتب خانہ | مغلیہ سلطنت کے آخری زمانہ میں روہیلون کی ایک ریاست فرخ آباد میں بھی قائم ہوئی تھی، یہاں کے حکمران علم کے شائق اور اہل کمال کے بڑے قدردان تھے، چنانچہ جو بڑے بڑے اصحاب کمال دہلی سے نکلتے تو ان کی پہلی منزل فرخ آباد ہوتی،

۱۲۶۳ھ میں یہاں کا حکمران بدرالدولہ شجاع الملک محمد سعادتمند خان بہادر اسد جنگ تھا، جو سخاوت، شجاعت اور علوم و فنون کی قدردانی میں اپنے بزرگون کا خلف الصدق تھا، اس کے پاس بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا، چنانچہ ایک کتاب پر اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی ہے:-

تبتاریخ دوازدہم ذی الحجہ ۱۲۶۳ھ مقدسہ روز جمعہ نسخہ مجالس العشاق ملکتب خانہ نیازمند درگاہ بدرالدولہ شجاع الملک محمد سعادت خان بہادر اسد جنگ بن نواب امین الدولہ محمد خرومند خان بہادر ببر جنگ خلف الرشید نواب شمس الدولہ محمد خدا بندہ خان بہادر غضنفر جنگ والی فرخ آباد داخل گردید"

یہ کتاب آج کل ریاست رامپور کے کتب خانہ میں ہے[3]،

نواب روہیلہ کا کتب خانہ | محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں روہیلہ پٹھانون نے بڑی قوت پیدا

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۵۳ [2] ایضاً ص ۹۰ [3] تحقیق آثار قدیمہ کلکتہ حافظ نذیر احمد صاحب بحوالہ معارف ج ۱۴۷،

کر لی، اور آہستہ آہستہ روہیل کھنڈ پر قابض ہو گئے، اس کے حکمرانوں میں حافظ رحمت خان بڑا شجاع، بہادر، صاحب علم اور اہل کمال کا قدردان تھا، اس نے اپنے مختصر عہد حکومت میں بہت سے مدرسے قائم کیے، اور رفاہ عام کے دوسرے کام انجام دیئے،

وہ سادات، علماء اور فضلا کا بڑا قدردان تھا، اس کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا، ۱۷۷۴ء میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خان کو قتل کر کے اس کی ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اور شاہی محل کو لوٹ کر تباہ کر دیا[1]،

اس لوٹ میں کتب خانہ بھی ہاتھ آیا جس کو لکھنؤ لا کر توپ خانہ کی عمارت میں رکھا گیا، لکھنؤ میں عام طور پر اس کو توپخانہ لائبریری کہتے تھے، یہ توپ خانہ برٹش ریزیڈنسی کے قریب تھا، (جس کو آجکل بیلی گارد کہتے ہیں، جو دراصل بیلی گارڈن کا بگڑا ہوا نام ہے، میجر بیلی صاحب نواب سعادت علی خان کے عہد میں مشہور ریزیڈنٹ تھے)، غالباً یہ وہ مقام ہے، جہاں آجکل بلرامپور ہسپتال ہے، اور بیلی گارد کے سامنے جو بڑا میدان نظر آتا ہے، وہ اس میں شامل تھا، اس میدان میں ایک بڑی دو منزلہ عمارت تھی، اس کے تین حصے فوجی ضروریات میں استعمال ہوتے تھے، اور چوتھے حصہ کی بالائی منزل میں یہ کتب خانہ تھا،

یہ کتابیں صندوقوں میں بڑی بے ترتیبی سے بھری ہوئی تھیں، اسپرنگر صاحب نے انکو کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر بہت افسوس کیا ہے، ان صندوقوں میں مستقل طور پر چوہوں نے سکونت اختیار کر لی تھی، اور ڈنڈوں سے کھٹکھٹائے بغیر ان صندوقوں میں ہاتھ ڈالنا بڑا خطرناک کام سمجھا جاتا تھا،

کیڑوں نے بھی کافی نقصان پہنچایا تھا، اچھی اچھی کتابیں کیڑوں کی ستم آرائی سے

---

[1] گل رحمت ص ۱۰۳، بمبئی،

چھلنی ہو کر رہ گئیں. ہفت قلزم اور تاج اللغات دونوں جو اس عہد میں نایاب اور نوادر میں شمار ہوتی تھیں برباد ہو گئیں. اور اس قسم کی بے شمار کتابیں جو ہون اور کیڑوں کے نذر ہو گئیں. اس کا سبب غالبًا یہ ہے کہ شجاع الدولہ کو روہیلوں کے ملک، ان کی دولت اور ہیرے جواہرات کی ضرورت تھی جو بعد فتح حاصل ہو گئے تھے. فوجی سرداروں نے ان تمام کتابوں کو بیکار سمجھ کر ایک کونہ میں ڈال دیا، جو بلا حفاظت اسپرنگر صاحب کے وقت تک پڑی رہیں،

رام پور کا کتب خانہ

سلطنت مغلیہ کے اختتام پر روہیل کھنڈ میں جو ریاستیں قائم ہو گئی تھیں ان میں سے ایک رام پور کی ریاست بھی ہے. اس کے فرمانروا ہمیشہ سے علوم و فنون کے سرپرست رہے ہیں،

دہلی اور لکھنؤ کے اجڑ جانے پر اکثر اہل کمال رام پور آ گئے تھے. جن کی نواب صاحب نے بھی پوری قدر دانی کی. اور علمی کاموں کا دروازہ کھول دیا. اور ایک بڑا عربی مدرسہ قائم کیا گیا جس کے صدر مدرس (پرنسپل)، علامۂ زمان مولانا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی تھے، اسی کے ساتھ تصنیف اور ترجمے کا کام بھی شروع کیا گیا،

تاریخی تحقیقات سے جہاں تک پتہ لگتا ہے، باقاعدہ طور پر کتب خانہ کی ابتدا نواب محمد فیض اللہ خان والی رامپور کے عہد میں ہوئی. اور تصنیف و تالیف و ترجمے اور نذر کے ذریعہ جتنی کتابیں حاصل ہوئیں وہ سب اس کتب خانہ میں جمع ہوئیں،

نواب سید محمد سعید خان صاحب کے عہد (۱۸۴۳ء / ۱۲۵۹ھ) میں ایک ہزار چار سو نواسی روپے آٹھ آنے کی کتابیں خریدی گئیں. اس وقت کتب خانہ میں ہمایوں نامہ، اکبر نامہ، خزانۃ العلم، تاریخ نادری، خلاصۃ التواریخ، تاریخ جہان خانی، تاریخ مجمع محفل جیسی کتابیں جو اس عہد میں نایاب تھیں، اس کتب خانہ میں موجود تھیں،

نواب سید محمد یوسف صاحب کے زمانہ (۱۸۵۵ء) میں دو ہزار سات سو ستاون روپے ساڑھے دس آنے کی کتابیں خرید کر کے داخل کتب خانہ کی گئیں،

اس کے بعد نواب کلب علی خان کے عہد میں کتب خانہ کو بڑی ترقی ہوئی، اور تینتالیس ہزار چھ سو آٹھ روپے ۱۳ آنے ۹ پائی کی کتابیں خرید کی گئیں، اس کے علاوہ دوران سال میں جو نایاب کتابیں خریدی گئیں، ان کی قیمت اس میں شامل نہیں ہے، جیسے تاریخ غازانی مصور جس کی قیمت دو ہزار تھی، یا عجائب المخلوقات کا مصور نادر نسخہ وغیرہ،

نواب کلب علی خان کے بعد نواب حامد علی خان کے عہد میں چار لاکھ اٹھائیس ہزار ایک سو چھتیس روپے چودہ آنے، دس پائی کتب خانہ پر صرف ہوئے، جس میں سے چالیس ہزار کی رقم کتب خانہ کی عمارت پر خرچ ہوئی، بقیہ میں کتابوں کی خریداری اور کتب خانہ کے عملہ کی سال بھر کی تنخواہ شامل ہے،

عملہ میں ناظم مہتمم، رجسٹرار، نائب رجسٹرار، تحویل دار، خوش نویس، نقاش، وراق صحاف، پاسبان، فراش وغیرہ ہوتے تھے، یہ کتب خانہ آج بھی موجود ہے، اس میں مندرجہ ذیل فنون کی کتابیں ہیں،

تفسیر، حدیث، اسماء الرجال، فقہ، اصول فقہ، کلام، سلوک، اخلاق، حکمت، ہیئت، منطق، طب، لغت، نحو، بلاغت، ادب، تاریخ، سیر، مناقب، الحرب، کیمیا، اعمال متفرق،

مندرجہ ذیل زبانوں کی کتابیں اس میں موجود ہیں:-

عربی، فارسی، اردو، انگریزی، ترکی، پشتو، بھاشا، سنسکرت، ناگری، اور پنجابی کی کتابیں ہیں،

قدامت کے لحاظ سے سب سے زیادہ قدیم کتاب ابوالحسن علی بن محمد ماوردی شافعی

متوفی ۴۵۰ھ کی النکت والعیون ہے، جو ۵۵۰ھ کی لکھی ہوئی ہے، کتابت کے اعتبار سے سب سے زیادہ قدیم کتاب امام ابو القاسم عبدالکریم بن ہوازن نیشاپوری متوفی ۴۶۵ھ کی التیسیر فی علم التفسیر ہے، جو جعفر بن عمر الصیرفی الحدادی کے ہاتھ کی ۶۰۹ھ کی لکھی ہوئی ہے،

خطاطی کے نمونوں میں دنیاے اسلام کے مشہور خطاط یاقوت مستعصمی کے لکھے ہوے کتبے بھی اس کتب خانہ میں موجود ہیں، ایک کتاب دیوان الحادرہ بھی اسی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے،

اس کتب خانہ کے ابتدائی دور کی کوئی ایسی شہادت دستیاب نہیں ہوئی جس سے اُس بات کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے کہ اس زمانہ میں کتابون کی تعداد کیا تھی سب سے پہلی تحریر نواب کلب علی خان کے عہد کی مشہور شاعر منشی امیر احمد صاحب مینائی کی ملتی ہے، جو غالباً اس زمانہ میں کتب خانہ کے ناظم تھے، اس وقت (۱۸۹۹ء) کل کتابون کی تعداد ۹۳۴۴ تھی، اس کے بعد حکیم محمد اجمل خان اس کے ناظم مقرر ہوئے، انھون نے عربی کتابون کی ایک مفصل فہرست (جلد اول) مرتب کرائی، جس میں کتابوں کی کل تعداد ۱۲۴۵۱ ہے، ۱۹۲۷ء میں اس کی دوسری جلد شائع ہوئی، اس زمانہ میں اس کتب خانہ کے ناظم حافظ احمد علی خان صاحب تھے، ان کی تحریر کے بموجب کتابون کی تعداد ۲۴۱۱۵ ہے[۱]،

جونپور کے کتب خانے | خاندان تغلق کے زوال کے زمانہ میں جب ہندوستان کا ہر صوبہ دار خود مختار ہوگیا، تو جونپور کے نائب حکومت خواجہ جہان نے بھی ملک الشرق کا لقب اختیار کر کے شرقی خاندان کی بنیاد رکھی، اس کے جانشینون نے قنوج سے لیکر بنگال تک کا خراج وصول کیا، یہ بڑا زرخیز خطہ تھا، اس لئے بہت جلد یہاں کے حکمران طاقتور ہو گئے، اور بہت جلد

---

[۱] رام پور کے کتب خانہ کے متعلق تمام معلومات فہرست کتب خانہ رامپور جلد اول اور جلد دوم سے ماخوذ ہیں،

ترقی کر کے تمدن کے تمام لوازم جونپور میں جمع کر دئے، بڑی بڑی مسجدیں، خانقاہیں، سرائیں، مدرسے، حمام اور عالیشان محلات تعمیر کرائے،

گو اس سلطنت کی عمر بہت تھوڑی یعنی صرف اسی برس رہی، مگر شاہانِ شرقی کی قدردانی اور جوہر شناسی سے ہر قسم کے اہل کمال جونپور میں جمع ہو گئے تھے، علماء کی قدردانی کا یہ حال تھا کہ خود بادشاہ ہر وقت ان سے ملنے جایا کرتے تھے، مدارس اور خانقاہوں کے لئے لاکھوں روپیہ کی جائدادیں وقف کیں اور علماء کے لئے بڑے بڑے وظائف مقرر کئے۔

سلطنت کے انقلاب کے بعد جب مغلوں کا دور آیا تو ان کی قدرافزائی کی وجہ سے پرانی سرگرمی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا، شاہجہان فخریہ طور پر کہا کرتا تھا کہ "شرق ماشیراز ما ست"۔ برہان الملک جب اودھ کا صوبہ دار ہو کر آیا، تو اس نے اصحاب کمال کی تمام جاگیریں چھین لیں اور وہ لوگ پریشان حال ہو کر منتشر ہو گئے، اور یہ علمی بزم درہم برہم ہو گئی،

سلاطین شرق نے اپنے عہد میں بے شمار مدرسے قائم کیے، اور یہ سلسلہ عہد مغلیہ تک قائم رہا، تاریخوں سے مندرجۂ ذیل مدارس کا خاص طور پر پتہ چلتا ہے،

(۱) مدرسۂ قاضی شہاب الدین دولت آبادی (۲) مدرسۂ عادل (۳) مدرسہ استاد الملک (۴) مدرسۂ ملا معمور (۵) مدرسۂ شیخ رکن الدین (۶) مدرسۂ ملا حضرمی (۷) مدرسۂ مداریہ (۸) مدرسۂ ملا شمس نور، (۹) مدرسۂ صادقیہ (۱۰) مدرسۂ خلیلیہ (۱۱) مدرسۂ جمبلیہ (۱۲) مدرسۂ ملا باب اللہ (۱۳) مدرسۂ صدجہان (۱۴) مدرسۂ شمس الدین،

یہ وہ مدارس ہیں جن کا درجہ آجکل کے کالجوں کے برابر تھا، ان میں بڑے بڑے مشہور ماہر فن تعلیم دیتے، ان مدارس کی اپنی اپنی عمارت ہوتی تھی، طلبہ کیلئے دارالاقامے اور ان کے ساتھ مسجدیں اور کتب خانے تھے، غرض تعلیم کی تمام ضروریات ان میں مہیا تھیں،

ان کے علاوہ بے شمار ذاتی کتب خانے بھی تھے، مولوی معشوق علی مرحوم ۱۲۶۲ھ کا کتبخانہ جونپور میں خاص شہرت رکھتا تھا، اس کتبخانہ میں پانچ ہزار کتابیں تھیں[1] وہ خود درس تدریس کا ذوق رکھتے تھے، اور ان کے درس میں ہر فن کے طلبہ رہتے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کتبخانہ میں ہر قسم کی کتابیں رہی ہوں گی، آپ نے ایک کتاب تحفۂ طفیفہ کے نام سے اخلاق میں اور دوسری فرائض میں تالیف کی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اخلاق اور فقہ سے خاص دلچسپی تھی،

ایک اور کتب خانہ مفتی سید ابو البقا متوفی ۱۰۴۰ھ کا تھا، وہ شاہجہان بادشاہ کے عہد میں جونپور کے مفتی تھے، آپ کی ذہانت اور حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کتاب پڑھ لینے کے بعد زبانی یاد ہو جاتی تھی، ایک مرتبہ شاہجہان نے ایک ایسی کتاب اصلاح کیلئے بھیجی جو متعدد جگہ سے خراب ہو گئی تھی، انھوں نے اس کو ایک مرتبہ پڑھ کر کتب خانہ میں رکھدیا، اور بھول گئے، چھ مہینے کے بعد جب بادشاہ کی طرف سے تقاضا شروع ہوا تو آپ کو خیال آیا، اتفاق سے کتب خانہ میں ہر چند تلاش کیا مگر نہ ملی مجبوراً خود اپنے قلم سے مکمل کتاب لکھکر بادشاہ کے پاس بھیجدی، بادشاہ بہت خوش ہوا، اور انعام و جاگیر سے سرفراز فرمایا[2]،

عادل شاہی کتب خانے سلطنت بہمنی کے خاتمہ کے بعد دکن میں پانچ نئی سلطنتیں قائم ہوئیں، بریدشاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی اور عادل شاہی، ان میں سے عادل شاہی سلطنت سب سے زیادہ طاقتور تھی، اس کے تعلقات ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی بہت دوستانہ تھے، ایران اور روم کے سفیر ایک دوسرے کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے، اور نادر تحائف کے ذریعہ محبت کے رشتہ کو مضبوط کرتے تھے،

عادل شاہی سلاطین جس طرح سیاسی معاملات میں بہت ذی ہوش تھے، اسی طرح علوم وفنون

---

[1] تذکرہ علمائے جونپور ج ۲ ص ۱۱۶، [2] تذکرہ علمائے جونپور جلد دوم ص ۶۴

کی سرپرستی میں بھی ممتاز تھے۔ ان کا دربار شعراء، فضلاء، حکمار سے بھرا رہتا تھا، ملا ظہوری، ملا ملک قمی، ملا فتح اللہ شیرازی، خواجہ عنایت اللہ شیرازی، قاسم فرشتہ سب اسی دربار سے متعلق تھے،

اس قدر دانی کے سبب فارس، عراق، آذربیجان اور رعب سے اہل کمال کھنچ کھنچ کر یہاں آگئے تھے، رفیع الدین شیرازی جو خان سالار اور خزانچی تھا، اس کا بیان ہے کہ شیراز میرا وطن ہی اس لیے میں صحیح طور پر جانتا ہوں کہ دس ہزار اشخاص بادشاہ کی قدردانی سے فیضیاب ہوئے[۵]،

تصنیف و تالیف و ترجمہ کا جس قدر کام اس سلطنت کے زیر سایہ ہوا، اتنا اس کی حریف سلطنتوں میں سے کسی نے انجام نہیں دیا، اس عہد میں بکثرت مساجد، مدارس، سرائیں، پل اور خانقاہیں بنوائی گئیں،

کتابوں کا بھی اس خاندان کو خاص ذوق تھا، اور ایک بڑا شاہی کتبخانہ بیجاپور میں قائم تھا، خود علی عادل شاہ متوفی ۹۸۸ھ کتابوں کا بڑا دلدادہ تھا، اکثر اس کے مطالعہ میں کتابیں رہتی تھیں شاہی کتبخانہ کے علاوہ اسکا ذاتی کتبخانہ بھی تھا جو سفر و حضر میں ہمیشہ اسکے ساتھ رہتا تھا، تاریخوں میں عادل شاہ کی نسبت لکھا ہے کہ "کتابوں کی طرف اس کو بڑی رغبت تھی، ہر قسم کے کتابیں مہیا کر کے کتب خانہ میں داخل کی تھیں۔ اس کتب خانہ میں ساٹھ آدمی کام کرتے تھے جس میں کاتب، خوشنویس، مذہب، (طلاکار) جدول بنانے والے، جلد ساز، نقاش ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتے،

چار صندوق منتخب کتابیں ہمیشہ اس کے ساتھ سفر و حضر میں رہتی تھیں، ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سفر کا آخری دن تھا، بارش بہت سخت ہوئی لشکر منتشر ہو گیا، بادشاہ بھی ایک جگہ خیمہ زن ہوا، اور مطالعہ کے لیے کتابیں مانگیں، معلوم ہوا کہ اس پریشانی میں کتابیں کسی دوسرے گاؤں میں لشکر کے ساتھ چلی گئی ہیں، علی عادل شاہ بہت برہم ہوا، اور کہا بارہا میں نے تاکید کی کہ کتابیں ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہا کریں، لیکن تم لوگ خیال نہیں کرتے، اور اسی وقت ایک امیر خاص کتابیں لانے کیلئے

---

[۵] بساتین السلاطین ص ۱۴۴،

مقرر متعین کیا گیا، اور جب تک کتابیں نہ آگئیں وہ بے قرار رہا[۱]۔

کتب خانون کا انتظام موجودہ زمانہ کی طرح قدیم زمانہ میں بھی کتب خانہ کے انتظام کیلئے ایک خاص محکمہ ہوتا تھا جس کے ماتحت بہت سے چھوٹے بڑے عہدہ دار ہوتے، خانقاہ، مدارس، مساجد، اور ذاتی کتب خانون کو چھوڑ کر جو کتب خانے سلاطین یا امراے ملک قائم کرتے انکے لیے ایک خاص عمارت علحدہ بنواتے، اس میں ہوا اور روشنی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، اور اسکا لحاظ بھی رکھا جاتا تھا کہ زمین ایسی ہو جہاں دیمک یا اس قسم کے دوسرے کیڑے نہ پیدا ہون، فرش ایسا ہو جس پر نمی کا اثر نہ ہو سکے کہ اس سے کتابیں جلد خراب ہو جاتی ہیں، جیسا کہ ہمایون اور اکبر کے کتب خانون کی عمارت سے ظاہر ہوتا ہے[۲]۔

ناظم کتب خانہ کا سب سے بڑا عہدہ دار ناظم ہوتا تھا جس کو معتمد بھی کہتے تھے[۳]، اس کو آمد و خرچ تقرری اور برطرفی ہر قسم کے اختیارات حاصل ہوتے تھے، شاہی کتبخانہ کا یہ عہدہ عموماً ارکین دولت کے لئے مخصوص تھا، جیسا کہ عموماً شاہی کتابون کے مہروں سے معلوم ہوتا ہے،

داروغہ یا مہتمم اس کے بعد دوسرا درجہ مہتمم کتب خانہ کا تھا[۴] جو ناظم کے زیر ہدایت کتب خانہ کا انتظام کرتا تھا، اس کے لیئے اعلیٰ قابلیت اور علوم و فنون میں کافی دستگاہ ضروری تھی، اس کا ایک نائب بھی ہوتا، انتظامی امور کے علاوہ کتابوں کا انتخاب، ان کی خریداری، اور فنوں کے اعتبار سے ان کی تقسیم، اس کا کام ہوتا تھا، اس کے زیر نگرانی متعدد منشی اکلرک، ہوتے تھے جن کا کام رجسٹروں میں کتابون کا اندراج، ہر فن کا رجسٹر الگ الگ رکھنا، کتابون پر نمبر لگانا وغیرہ ہوتا[۵]، جیسا کہ شاہان اودھ کے کتب خانہ میں دستور تھا،

صحاف و وراق ان کے ماتحت متعدد ملازم ہوتے جو کتابون کو صندوقون یا الماریون میں ترتیب کے ساتھ رکھتے اور نکالتے تھے، انھیں کے زیر نظر صحاف اور وراق بھی ہوتے[۶]، جو ایک ایک

---

[۱] بساتین السلاطین ص ۱۴۸ [۲] شاہجہان نامہ ج ۲ ص ۵۰۵ [۳] معارف جلد ۱۴ ص ۲۲۳، ۲۲۴ [۴] فہرست کتبخانہ رامپور جلد اول ص ۱، [۵] مآثر رحیمی جلد ۳ ص ۱۶۸۰

کتاب کو نکالکر جھاڑتے اور ایک ایک ورق کھولکر صاف کرتے جو اوراق چپک جاتے ان کو علٰحدہ کر کے گرد و غبار سے پاک و صاف کرتے ۔

جلد ساز کتب خانہ کے لیے جلد سازوں کا ہونا بھی ضروری تھا۔ جن کی تعداد ضرورت کے مطابق کم و بیش ہوتی رہتی، یہ جلد ساز اپنے فن کے ماہر اور جس زمانہ میں جس قسم کی جلدوں کا رواج ہوتا ان سے بخوبی واقف ہوتے،[۱] اور بحمد اللہ کہ آج بھی حیدر آباد دکن میں ایسے جلد ساز موجود ہیں۔ جو سلف کے یادگار اور انکے صحیح جانشین ہیں۔

مصور ہر کتب خانہ میں متعدد مصور رہوتے تھے۔ جو کتابوں میں بہترین قسم کی تصویریں بناتے تھے، ان کو مصوری میں اتنا کمال حاصل ہوتا تھا کہ ان کی تصویروں میں مصور حقیقی کی روح ڈالنے کی کسر رہ جاتی تھی، اور یہی حال نقاشوں کا تھا، جن کی رنگ برنگ کی نقاشی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھولوں کا چمن کھلا ہوا ہے، یہ رنگ سازی اور رنگ آمیزی دونوں کے ماہر ہوتے تھے۔ رنگ کی پختگی کا یہ حال تھا کہ آج سے دو سو اور تین تین سو برس پہلے کی بنائی ہوئی تصویروں اور نقش و نگار کے رنگوں کی شوخی آب و تاب اور چمک دمک میں کوئی فرق نظر نہیں آیا، اور معلوم ہوتا ہے کہ مصور یا نقاش بھی اپنا کام ختم کر کے اٹھا ہے،[۲]

خوشنویس متعدد خوشنویس (یا خطاط) کا ہونا بھی ضروری تھا، جو خط کوفی، نسخ، نستعلیق اور شکست وغیرہ مختلف قسم کے خطوط ماہر ہوتے تھے، ان سے یا تو مکمل کتاب لکھائی جاتی یا ان کتابوں کی تکمیل کرائی جاتی جو کسی صورت سے ناقص رہ گئی ہوں[۳]،

کاتب متعدد کاتب ہوتے تھے، جو نایاب کتابوں کی نقل کرتے رہتے[۴]، انھیں کیساتھ نقل نویس بھی کام کرتے جو ضرورت کے وقت کتابوں کے خاص خاص حصوں کو جلدی سے نقل کر دیتے،

مقابلہ نویس ان دونوں کی لکھی ہوئی کتابیں مقابلہ نویس کے پاس جاتیں، ان کا کام اصل کتاب سے

۱؎ مآثر رحیمی جلد ۳ ص ۴ ، ۲؎ ایضاً ص ۱۶۶، ۳؎ مآثر رحیمی ج ۳ ص ۱۶۶، کلکتہ ۴؎ ایضاً صفحہ ۸۳، ۱۶۸،

منقول شے کا مقابلہ اور ان کے اغلاط کی تصحیح تھی[1]

مصحح | اس کے علاوہ کتب خانہ میں لائق اور ذی علم مصحح بھی ہوتے تھے، جنکا کام کرم خوردہ یا مٹے ہوئے الفاظ کی جگہ صحیح لفظ لکھنا اور خاص خاص قسم کی دوسری غلطیوں کی اصلاح تھا،

جدول ساز | جدول ساز کا بھی ایک عہدہ ہوتا تھا، جو سادہ، رنگین، سنہری، روپہلی، بچی لمبی کار، ہر قسم کی جلدولیں بناتے تھے[2]

فراش | ادنی درجہ کے ملازموں میں سے ایک فراش ہوتا جس کا کام کتب خانہ کی صفائی تھی، وہ کتب خانہ کے اوقات سے پہلے آکر فرش کو جھاڑ کر صاف کر دیتا،

کتب خانہ کے متعلق اعلیٰ حکام سے اکثر خط وکتابت بھی ہوتی رہتی تھی، اور مالی معاملات یا اختلاف رائے کے سبب سے مکاتبات کی تعداد زیادہ ہوجاتی تھی، اس لئے خطوط اور کتابیں کتبخانہ سے باہر بھیجنے اور لانے کیلئے علٰحدہ ایک خادم ہوتا تھا، اس خادم کے ہم پلہ چند اور ملازم بھی ہوتے تھے جنکو دربان یا محافظ کہتے تھے، جو باری باری سے شب و روز کتبخانہ کی عمارت کی حفاظت کرتے تھے، اور آنے جانیوالوں کو بھی نگاہ میں رکھتے تھے،

تنخواہوں کے اعتبار سے ناظم کے علاوہ سب سے بڑی تنخواہ مہتمم کی ہوتی تھی، پھر نائب مہتمم کی اس کے بعد مصور، نقاشوں، جدول سازوں، خوشنویسوں کی تنخواہیں زیادہ ہوتی تھیں، کاتب، منشی، مقابلہ نویس، مصحح کی تنخواہیں ان سے کم اور نقل نویس کی ان سے کمتر، صحاف اور وراق کی اور بھی کم، اور خادم، فراش، اور دربانوں کی تنخواہیں عام طور سے بہت معمولی ہوتیں[3]

---

[1] آثر رحیمی [2] ایضاً ص ۱۶۷۸، [3] فہرست کتبخانہ رامپور جلد اول ص،

تیموری دور کی خطاطی

اور

مشہور خطاط

از شاہ معین الدین احمد ندوی

خطاطی کی اہمیت ایک زمانہ میں خوشنویسی و خطاطی بھی بڑا کمال سمجھی جاتی تھی، اور اس نے باقاعدہ فن کی حیثیت حاصل کرلی تھی، اس کے اصول و قواعد تھے، دوسرے علوم و فنون کی طرح اس کی بھی مشق و تعلیم ہوتی تھی، اس کے بغیر تعلیم مکمل نہ سمجھی جاتی تھی، سلاطین و امراء تک کے لڑکوں کو خطاطی کی تعلیم دیجاتی تھی، تیموری سلاطین میں شاہ جہاں، اورنگ زیب، داراشکوہ، شہزادوں میں خسرو، پرویز اور آخر میں بہادر شاہ اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے، خوشنویسوں کی بڑی قدر و منزلت تھی، وہ سلاطین و امراء کے درباروں کی زینت ہوتے تھے، نامور اساتذہ اور مشہور خطاطوں کی لکھی ہوئی کتابیں بلکہ رباعیات اور قطعات تک بڑی گراں قیمت پر فروخت ہوتے تھے،

مسلمان جب ہندوستان آئے تو دوسرے علوم و فنون کی طرح خطاطی کو بھی ساتھ لائے، اور ان کے زمانہ میں خصوصاً مغلوں کے دور میں دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح خطاطی میں بھی بڑی ترقی ہوئی اور یہاں بڑے بڑے خطاط اور خوشنویس پیدا ہوئے،

مسلمانوں میں خطاطی کی ترقی کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ اسلام میں مصوری حرام ہے، اس لیے

جن مذہبی لوگوں میں مصوری اور نقاشی کا ذوق تھا، انھوں نے اس کو پورا کرنے کے لیے نقاشی اور خطاطی کی طرف توجہ کی اور مصوری کی طرح اس میں طرح طرح کی نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کیں جن کے سواد تحریر سے آج بھی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

اسلام میں خطاطی کی تاریخ ظہور اسلام کے وقت عرب میں خط نبطی (حیری) رائج تھا، جو بعد میں خط کوفی کہلایا، اور عہد رسالت میں اسی کا استعمال ہوتا تھا، کلام مجید بھی اسی میں لکھا جاتا تھا، اس کے حروف حسن و نفاست اور نقطوں اور اعراب سے معریٰ تھے، عربی عربوں کی مادری زبان تھی، اس لیے وہ نقطوں اور اعراب کے بغیر انکو صحیح پڑھ لیتے تھے لیکن جب عجمی قومیں مسلمان ہوئیں اور وہ حروف کے تلفظ اور اعراب میں غلطی کرنے لگیں تو حضرت علیؓ کے ایک شاگرد ابو الاسود دؤلی نے ہم شکل مگر مختلف المخارج اور مختلف الاصوات حروف، ب، ت، ث، ج، ح، خ، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ کے تلفظ میں فرق و امتیاز پیدا کرنے کے لیے نقطے ایجاد کیے،[1]

بنی امیہ کے ابتدائی دور تک یہی طریقہ رائج رہا، لیکن نقطے بھی ہم شکل ہوتے تھے، ان میں بھی التباس ہوتا تھا اس لیے پہلے مختلف مقصد کے نقطوں میں رنگ کے ذریعہ فرق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، مگر جب یہ بھی ناکافی ثابت ہوا تو عبد الملک کے زمانہ میں حجاج بن یوسف ثقفی نے حروف کے امتیاز کے لیے تو نقطے قائم رکھے لیکن حرکات کی صحت کے لیے اعراب کی علامتیں ایجاد کیں،[2] پھر آگے چل کر مخارج کی مزید صحت کے لیے فن تجوید ایجاد ہوا۔

ان تغیرات کے ساتھ خط کوفی کی ظاہری شکل میں بھی تبدیلی ہوتی رہی اور تیسری صدی کے آخر تک اس کے حسن میں نمایاں اضافہ ہوا، اور اس کے بڑے بڑے کاتب پیدا ہوئے، جنھوں نے اس کے مختلف طرز ایجاد کر کے بڑا تفنن پیدا کیا، ابن ندیم نے اس کی پوری تفصیل لکھی ہے، لیکن اس خط میں کوئی بنیادی

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۶۔ اعراب و اعجام کے موجدین کے نام میں بڑا اختلاف ہے، بعض اسکو حجاج بن یوسف کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ابن خلکان ج اول ص ۲۲۱ [2] ایضاً ج اول ص ۲۲۱ [3] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو فہرست ابن ندیم ص ۱۱۱ و ۱۱۲

تبدیلی نہیں ہوئی، البتہ وہ خط کوفی کہلانے لگا، تا آنکہ مقتدر باللہ عباسی ۲۹۵ھ تا ۳۲۵ھ کے زمانہ میں ابو علی محمد بن علی المعروف بابن مقلہ پیدا ہوا، یہ بڑا فاضل منشی اور ادیب تھا، مقتدر کے زمانہ میں وزارت کے درجہ تک پہنچا، یہ اعلیٰ درجہ کا خطاط بھی تھا، اس نے خط کوفی کو ترقی دیکر ایک نیا خط ایجاد کیا جو اپنے حسن و نفاست میں ضرب المثل تھا[۱]، اس کا نام اس نے بدیع اور محقق رکھا، پھر اس سے خط ثلث و ریحان ایجاد کیے[۲]، بدیع و محقق ہی نے آگے چل کر خط نسخ کی شکل اختیار کر لی، یہ خط اس قدر خوبصورت تھا کہ گویا گذشتہ خطوں کا ناسخ تھا، اس لیے نسخ کہلایا، یہ خط کتابوں اور عام تحریروں میں اور ثلث و ریحان زیادہ تر کتبات و سرخیوں کے لیے استعمال ہوتے تھے، ابن مقلہ کے بعد علی بن ہلال المعروف بہ ابن بواب المتوفی ۴۲۳ھ پیدا ہوا، یہ بھی اپنے زمانہ کا نامور خطاط تھا، اس نے خط بدیع و محقق کو اور ترقی دے کر اس میں مزید حسن و نفاست اور خوبی و زیبائی پیدا کی[۳]، غالباً اسی زمانہ سے یہ خط نسخ کہلایا،

اپنے زمانہ میں اس خط کا سب سے بڑا ماہر خود ابن بواب تھا، ملا کاتب چلپی کا بیان ہے کہ ان دونوں کے زمانوں میں چھ خط ایجاد ہوئے، ثلث، نسخ، تعلیق، ریحان، محقق (بدیع) اور رقاع۔ یہی چھ خط سب سے زیادہ مقبول اور رائج تھے، ابن مقلہ اور ابن بواب کے بعد خطاطی میں سب سے زیادہ شہرت اور ناموری یاقوت حموی رومی المتوفی ۶۲۶ھ، صاحب معجم الادبا، اور یاقوت بن عبداللہ رومی مستعصمی المتوفی ۶۹۸ھ نے حاصل کی خصوصاً یاقوت مستعصمی سب پر گوئے سبقت لے گیا، اس کے زمانہ میں خط نسخ میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا، اس کا خط اس قدر مقبول تھا کہ اس کے لکھے ہوئے صفحات سونے کے پتر کے بھاؤ بکتے تھے، آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کا درباری خوشنویس تھا، اس کے خط کی مقبولیت اور قدردانی کو دیکھ کر دوسرے خطاطوں نے سیکڑوں کتابیں اور کلام مجید

---

۱ الفخری ص ۲۴۴ ۲ پیدائش خط و خطاطان، حاجی مرزا عبدالمجید خاں ایرانی ص ۹۲ ۳ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۱

لکھکر اس کے نام سے منسوب کر دیے، جو محض اس کی نسبت سے بڑی گراں قیمت پر فروخت ہوتے تھے، ان کے علاوہ اس زمانہ میں اور بھی مشہور خوشنویس پیدا ہوئے، صاحبِ کشف الظنون نے ان کے نام لکھے ہیں،[۱]

خط کی ترقی اور ان کی ایجادات کے ساتھ ساتھ خطاطوں نے اس کی کتابت کے اصول و قواعد بنائے، ان پر مستقل کتابیں لکھیں قلم تراشی، روشنائی سازی، کاغذ وغیرہ، آلات کتابت کی تزئینیں تحریر کیں، اس طرح خطاطی نے مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی، ابن ندیم، طاش کبریٰ زادہ اور ملا کاتب چلپی نے ان سب کی تفصیل لکھی ہے لیکن ہمارا مقصد صرف ہندوستان میں خطاطی کی مختصر تاریخ لکھنا ہے، اس لیے ان تفصیلات کو قلم انداز کیا جاتا ہے،

نستعلیق کی ایجاد ساتویں صدی کے وسط تک مذکورۂ بالا خطوط خصوصاً خط نسخ کا زیادہ رواج رہا، عربی اور فارسی دونوں کی کتابیں اسی میں لکھی جاتی تھیں، ساتویں صدی میں خط نسخ اور تعلیق کو ملا کر ایک نیا خط ایجاد ہوا، جو نوک پلک کے لحاظ سے خط نسخ سے بھی زیادہ خوبصورت تھا، اس کی ایجاد خواجہ میر علی تبریزی کی جانب منسوب کی جاتی ہے، قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں اس کی شان میں مولانا سلطان علی مشہدی کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے، جس کے چند شعر یہ ہیں:

نسخ و تعلیق گر خفی و جلی است — واضع الاصل خواجہ میر علی است
وضع فرمود او ز ذہن دقیق — از خطِ نسخ و از خطِ تعلیق

یہ خط ابتدا میں نسخ و تعلیق کہلاتا تھا، پھر کثرتِ استعمال سے نستعلیق ہو گیا۔[۲]

لیکن صحیح یہ ہے کہ خط نستعلیق اس سے پہلے ایجاد ہو چکا تھا، ابو الفضل کا بیان ہے:

"نستعلیق و آں تمام دور است در زمان صاحبقراں خواجہ میر علی تبریزی از نسخ و تعلیق

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کشف الظنون ج اول ص ۶۶-۴۶۴ [۲] تذکرۂ خوشنویساں مولوی غلام محمد ہفت قلم ص ۴۳

بر گرفت و ایں باور نشود چرا کہ نامہا بنظر در آمد کہ پیش از صاحبقران نگاشتہ بودند[1]۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط نستعلیق خواجہ میر علی تبریزی سے پہلے ایجاد ہو چکا تھا، البتہ انھوں نے اس میں حسن و نفاست پیدا کی اور اس کے قواعد مرتب کیے،[2] اس لیے یہ مسلم ہے کہ خط نستعلیق کے پہلے ماہر فن استاد خواجہ میر علی تبریزی تھے،

خواجہ میر علی کے شاگردوں میں مولانا جعفر تبریزی اور مولانا اظہر نے خطاطی میں بڑا کمال پیدا کیا اور بڑی شہرت و ناموری حاصل کی، ان کے علاوہ اس دور کے خطاطوں میں مولانا محمد ادہمی، مولانا باری ہروی اور مولانا سلطان علی مشہدی تھے، خصوصاً مولانا مشہدی اپنے زمانہ کے یگانہ خوشنویس تھے، ان کے شاگردوں میں سلطان محمد خنداں، سلطان محمد نور، مولانا علاء الدین ہروی، مولانا زین الدین، مولانا عبیدی نیشاپوری اور محمد قاسم شادی شاہ نے خوشنویسی میں شہرت حاصل کی، ان میں ہر شخص اس فن میں صاحب طرز تھا، ان کے بعد مولانا میر علی ہروی امام فن ہوئے جنھوں نے مولانا مشہدی کے جیسے یگانۂ روزگار کے فن کو بھی مزید ترقی دی،[3] یہ سب ایران کے کاتب تھے،

خط کی قسمیں | یوں تو خط کی بہت سی قسمیں ہیں، ان میں زیادہ مشہور سات ہیں: نسخ، نستعلیق، رقاع، ثلث، ریحان، شفیع، اور شکست، جن کے ماہرین ہفت قلم کہلاتے تھے، طغرا نویسی اس سے علحدہ تھی، ان خطوں میں خطاطوں نے اور طغرا نویسوں نے اتنا تفنن اور ایسی صناعیاں پیدا کیں کہ خط نے تصویر، نقش و نگار اور گل بوٹے کی جگہ لے لی، چنانچہ ایک زمانہ میں خوشخط لکھے ہوئے، قطعات، رباعیات، حکیمانہ مقولے اور آیات قرآنی کے طغرے وغیرہ سامان آرایش میں تھے، جن سے زیب و زینت کے ساتھ اخلاقی سبق اور پند و موعظت کا بھی فائدہ حاصل ہوتا تھا، اس کے آثار اب بھی کہیں کہیں باقی ہیں،

آجکل مصوری کے نمونوں سے جو کام لیا جاتا ہے اور اس کی جو قدر ہے ایک زمانہ میں یہی قدر خطاطی

---

[1] آئین اکبری ج اول ص ۵، [2] تذکرۂ خوشنویساں [3] آئین اکبری جلد اول ص ۷۵

کے نمونوں کی تھی،

تیموری عہد میں خطاطی | مسلمان جب ہندوستان آئے تو خطاطی اور خوشنویسی کو بھی ساتھ لائے لیکن سلاطین دہلی کے زمانہ تک زیادہ تر ایرانی خوشنویسوں ہی کی تقلید رائج رہی، اور خود ہندوستانیوں نے ان میں کوئی جدت نہیں پیدا کی، جب مغلوں کا دور شروع ہوا تو انھوں نے دوسرے فنون لطیفہ کی طرح خوشخطی اور خطاطی کی بھی بڑی قدردانی اور سرپرستی کی۔ اور ان میں سے اکثر سلاطین خود بھی اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے، اور اپنے لڑکوں کو دوسرے فنون کی طرح خوشخطی کی تعلیم بھی دلاتے مشہور خطاطوں کی قدردانی کرتے تھے، ان کی لکھی ہوئی تحریروں کو گراں قیمت پر خریدتے تھے، اس کے علاوہ ان کی علم دوستی اور حکومت کی ضروریات بھی خطاطی کی ترقی میں معاون ہوئیں، تیموری خاندان اور اس کے امراء تک علم وفن کے بڑے قدردان تھے، ان کا کتب خانہ بڑا وسیع تھا۔ اس کی کتابوں کی کتابت، ظاہری زینت وآرایش اور مصوری کے لیے خوشنویسوں، نقاشوں اور مصوروں کا پورا عملہ رہتا تھا، عمارتوں کی تحریروں اور کتبات کے لیے اعلیٰ درجہ کے خطاطوں اور طغرانویسوں کی ضرورت تھی، ان کا نظام حکومت اور اس کے دفاتر (سکریٹریٹ) بہت وسیع تھے ان میں سیکڑوں کاتب اور منشی کام کرتے تھے، ان کاتبوں خصوصاً شاہی فرمان نویسوں کے لیے خوشخطی ضروری تھی، ان اسباب کی بنا پر ان کے دور میں خوشخطی اور خطاطی کو بڑی ترقی ہوئی اور بڑے بڑے خوشنویس پیدا ہوئے، تیموریوں کے ابتدائی دور یعنی اکبر کے زمانہ کے بارہ میں ابوالفضل لکھتا ہے:

" از قدردانی وارزشناسی کشور خدائے گوناگوں خطہا پایہ والا گرفت وہنرپردازاں نادرۂ روزگار روزبازار شد، خاصہ نستعلیق روانی دیگر یافت وجادو رقمے کہ در ظل سریر خلافت صاحب ایں نقش، دلپزیر تواں گفت محمد حسین کشمیری است وبخطاب زریں رقمی روشناس آفاق شاگرد مولانا عبدالعزیز از استاد گذرانیدہ، مدات و

دوائر متناسب دو دو دائرا و ہم تناسب ہم اند کار آگہاں او را بہ پایہ میر علی برگزند و مولانا باقر پسر میر علی مشہور، و محمد امین مشہدی، میر حسین کلنگی، مولانا عبد الحیٔ، مولانا دوری مولانا عبد الرحیم، میر عبد اللہ، نظامی قزوینی، علی چمن کشمیری، نور اللہ قاسم ارسلان فروغ دولت جاوید طراز ناموری گشتند"[1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے :۔

تیموری دور کے خطاط اکبری دور کے امرا میں عبد الرحیم خانخاناں بڑا صاحب ذوق، علم پرور اور ہنر نواز امیر تھا، اس کا کتب خانہ اس دور کے نادر اور بیش قیمت کتب خانوں میں تھا، اس کی نگرانی اور انتظام کے لیے پورا عملہ مقرر تھا، نادر اور نایاب کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ان کی ظاہری حسن و نفاست میں بھی خانخاناں کو بڑا اہتمام تھا، اور اس کے لیے اس نے اپنے زمانہ کے نامور خطاط، نقاش اور مصور جمع کئے تھے، وہ خود اور اس کے لڑکے مرزا ایرج اور مرزا داراب اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے، مولوی غلام محمد ہفت قلم دہلوی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں :۔

"در خوشنویسی مہارت کمال رسانیدہ و در ہندی خیلے دستگاہ داشت و خط ہندی خوب می نوشت"[2]

ملا عبد الباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی میں اس کتب خانے کے ذکر میں اس کے بعض خطاطوں، مصوروں اور نقاشوں کے حالات بھی لکھے ہیں[3]

نامور خطاط یہ تھے :۔

ملا عبد الرحیم عنبریں رقم۔ ان کا نام ابو الفضل کی تحریر میں اوپر آچکا ہے، ان کا وطن ہرات تھا، خانخاناں کے دربار سے متوسل تھے، خط نسخ و نستعلیق دونوں میں کمال رکھتے تھے، ان کے زمانہ میں

---

[1] آئین اکبری ج اول ص ۷۷، [2] تذکرہ خوشنویسان ص ۸۰، [3] مآثر رحیمی کے دوسرے حصہ میں مختلف مقامات پر ان کے حالات ہیں۔

محمد حسین کشمیری کے سوا اس کا کوئی ہم سر نہ تھا۔

شجاع۔ ان کا اصل وطن شیراز تھا، خانخاناں کی سرکار سے متوسل تھے، خط نسخ و نستعلیق کے ماہر تھے، ابتدا میں ان کا تقرر خطاط کی حیثیت سے ہوا تھا، پھر ترقی کر کے کتبخانے کے عہدہ دار مقرر ہو گئے تھے،[1]

بہبود مرزا۔ مشہور خوشنویس تھے، اور نقاشی میں بھی کمال رکھتے تھے،

ان کے علاوہ اور بھی خوشنویس، نقاش اور مصور تھے، ان کا ذکر مآثر رحیمی میں ہے،

مرزا فتح اللہ شیرازی۔ اکبری دور کے مشہور عالم اور جلیل القدر فاضل تھے، جملہ علوم و فنون میں کمال رکھتے تھے بعض علوم میں یگانہ عصر تھے، اعلیٰ درجہ کے خوشنویس اور خطاط بھی تھے، ان کے حالات اور کمالات کی تفصیل تیموری عہد کی تمام تاریخوں میں ہے، مولوی غلام محمد ہفت قلم دہلوی نے بھی تذکرہ خوشنویساں میں ان کا مختصر حال لکھا ہے،[2]

زین خان کوکہ۔ اکبری دور کا پنجہزاری امیر تھا، خطاطی اور مصوری میں کمال رکھتا تھا، ملا عبد القادر بدایونی نے بھی زمرۂ شعرا میں ان کا مختصر حال لکھا ہے۔[3]

میر معصوم بھکری قندھاری۔ ترمذ کے سادات میں تھے، ان کے والد سید صفائی نے ترک وطن کر کے بھکر (سندھ) میں سکونت اختیار کر لی تھی، میر معصوم کی پیدائش اور تعلیم و تربیت وہیں ہوئی، علوم ظاہری و باطنی دونوں میں کمال حاصل تھا، اکبری دور میں اس کی جانب سے سکھر کی امین الملکی اور اس کی جماعت کے معزز عہدوں پر ممتاز اور ایک ہزاری منصب سے سرفراز ہوئے۔ خوشگو شاعر اور اہل قلم مصنف بھی تھے۔ فارسی کا ایک دیوان، مثنوی معدن الافکار اور تاریخ سندھ ان کی علمی یادگار ہیں، اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے، ہندوستان، تبریز اور اصفہان کے درمیان بہت سی

---

[1] تذکرۂ خوشنویساں ص ۸۵ [2] ایضاً ص ۸۹ [3] منتخب التواریخ بدایونی ج ۳ ص ۳۱۰،

عمارتوں اور مسجدوں پر ان کے اشعار کندہ ہیں۔ فتحپور سیکری کے بلند دروازے اور اسکی جامع مسجد کے کتبات انہی کے لکھے ہوئے ہیں۔[۱]

خواجہ عبدالصمد شیریں رقم۔ اکبری دور کے عہدہ دار اور نامور خوشنویس و مصور تھے، خط نستعلیق بہت عمدہ لکھتے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ خشخاش کے دانے پر سورۂ اخلاص لکھ دیتے تھے،[۲] مصوری میں استاد کا درجہ حاصل کیا۔[۳] اکبرنامہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں فتحپور سیکری کی ٹکسال کے امین اور صوبہ ملتان کے دیوان رہے۔[۴]

میر محمد اصغر الملقب بہ اشرف خاں۔ عرب شاہی سادات میں تھے، ساتوں قلموں کے ماہر تھے، اس لیے ہفت قلم کہلاتے تھے،[۵] اکبر کے میر منشی تھے۔ ان کے حالات مآثر الامراء وغیرہ میں بھی ہیں۔[۶]

ملا عبدالقادر اخوند۔ اکبر کے استاد تھے، عربی و فارسی زبان اور ان کے علوم میں کمال رکھتے تھے، خوشنویس بھی تھے، آخر عمر میں ہجرت کر کے بیت اللہ چلے گئے تھے۔[۷]

محمد حسین کشمیری۔ الملقب بہ زریں رقم اکبری دور کے سب سے بڑے خوشنویس تھے۔ ان کے بارہ میں ابوالفضل کا بیان اوپر گذر چکا ہے کہ "اس فن کے ماہران کو ایران کے مشہور کاتب میر علی ہروی کا ہم پایہ سمجھتے تھے"۔[۸] مولوی غلام محمد ہفت قلم لکھتے ہیں کہ "نستعلیق کے ہندوستان کے نامور خوشنویس تھے، اور اس میں اس زمانہ کے تمام خطاط ان کو استاد مانتے تھے۔ اکبر نے انکو زریں رقم کے لقب سے نوازا تھا۔[۹]

میر عبداللہ۔ شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد میں تھے، اکبری دور کے نامور خوشنویس تھے، اکبر نے ان کو مشکیں رقم کے لقب سے سرفراز کیا تھا، صاحب دیوان شاعر تھے، وصفی تخلص تھا۔[۱۰] ملا عبدالقادر

---

۱ مآثر الامراء ج ۳ ص ۳۲۶ تا ۳۲۸ ۲ تذکرۂ خوشنویساں ص ۸۴ ۳ آئین اکبری ص ۷۷، ۴ اکبرنامہ حالات سنہ ۲۲ و سنہ ۱۳ جلوس اکبری ۵ تذکرۂ خوشنویساں ص ۸۶ ۶ ملاحظہ ہو مآثر الامراء ج اول ص ۸۹ ۷ تذکرۂ خوشنویساں ص ۷۱ -
۸ آئین اکبری ص ۷۷، ۹ تذکرۂ خوشنویساں ص ۷۵، ۱۰ ایضاً ص ۷۵

بدایونی نے زمرۂ شعرا میں ان کے حالات لکھے ہیں، ان کے خط کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

"بسیار خوش خط است شاگرد شاہ غیاث مولانا رقمی است و بہفت قلم می نویسد۔"[1]

ملا علی احمد مہرکن۔ عہد اکبری کے مشہور مہرکن اور اعلیٰ درجہ کے خطاط تھے، تمام مروجہ خطوں میں ان کو کمال حاصل تھا، مولوی غلام محمد ہفت قلم آئین اکبری کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"فولاد را کسے برابر مولانا علی احمد دہلوی نیاراست خط شناساں او را دریں صنعت بے ہمتائے روزگار دانند، غیر از قلیق خطوط را بوالا پائیگی رسانید لیکن نستعلیق را بس دلفریب آراید۔"[2]

خواجہ حسین احمد چشتی۔ یہ حضرت شیخ سلیم چشتی کے خلیفہ اور خط نسخ کے استاد تھے، فتحپور سیکری کے بلند دروازے کا بیرونی جو کتبہ ہے وہ انہی کا لکھا ہوا ہے۔[3]

جہانگیر بھی خوشخطی کا قدردان تھا، اس نے اپنے سب لڑکوں کو اس کی تعلیم دلائی تھی، چنانچہ شاہجہاں نہ صرف خوشنویس بلکہ اس فن کا بڑا نقاد بھی تھا، اس کے دونوں بھائی خسرو اور پرویز اعلیٰ درجہ کے خطاط تھے، مولوی غلام دہلوی ہفت قلم لکھتے ہیں:۔

"شاہزادہ خسرو در فن خوشخطی و انشاء کمال داشت سلطان پرویز در علم عربی و فارسی و نوشتن خطوط بغایت آراستہ و پیراستہ بود، اکثر اوقات او بکتابت کلام اللہ صرف نمود۔"[4]

جہانگیر کے زمانہ میں بیشتر خطاط وہی تھے جو اکبر کے زمانہ میں تھے، ان کے علاوہ جن خطاطوں نے اس کے زمانہ میں نام پیدا کیا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

محمد شریف شیریں رقم۔ یہ اکبری دور کے مشہور خطاط خواجہ عبد الصمد کا لڑکا اور جہانگیری دور کا امیر الامراء تھا، اس نے خطاطی اور مصوری باپ سے ترکہ سے پائی تھی، اس کا کمال یہ تھا کہ چاول

---

[1] تاریخ بدایونی ج ۳ ص ۲۰۲ [2] تذکرہ خوشنویساں ص ۸۸ [3] بزم تیموریہ ص [4] تذکرہ خوشنویساں ص ۹۱

کے دانے پر خدم وحشم کے جملہ لوازم کے ساتھ مسلح سوار کی تصویر بنا دیتا تھا، اس نے اکبر اور جہانگیر دونوں کا زمانہ پایا، لیکن اکبر کی زندگی ہی میں شاہزادے جہانگیر کی سرکار سے متوسل ہوگیا تھا، جہانگیر نے اس کو اپنے زمانہ میں امیر الامراء کے خطاب سے نوازا، شاعر بھی تھا، مآثر الامراء اور بدایونی وغیرہ میں بھی اس کا حال ہے،

قاضی احمد غفاری - عہد جہانگیری کا مشہور خوشنویس تھا، نستعلیق میں خاص طور سے مہارت تھی، شاہزادے خسرو کو اسی نے خوشخطی کی تعلیم دی تھی، اس کی وفات کے بعد ملازمت چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، بدایونی نے بھی شعراء کے زمرہ میں اس کا حال لکھا ہے[1]۔

مرزا محمد حسین - مصنف حبیب السیر غیاث الدین بن ہمام الدین المعروف بہ خوندمیر کا عزیز تھا، ہمایوں کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا، اس نے اور اس کے بعد اکبر نے اس کی بڑی قدر دانی کی، خط تعلیق، نستعلیق، ثلث اور شکستہ چاروں کا بڑا ماہر تھا، اس سے پہلے خط شکستہ کے کوئی اصول و قواعد نہ تھے، اور اس کا شمار کسی خط میں نہ تھا، مرزا محمد حسین نے اس کے اصول و ضوابط مقرر کرکے اس کو ایک مستقل خط کی حیثیت دیدی، اس حیثیت سے وہ گویا اس خط کا موجد ہے، جہانگیر کے زمانہ میں ۱۰۲۶ھ میں انتقال کیا[2]،

احمد علی ارشد - اکبری اور جہانگیری عہد کا مشہور طغرا نویس تھا، فتحپور سیکری کے بلند دروازے پر اس کا لکھا ہوا طغرا ہے، جس میں خلفائے راشدین اور پنجتن پاک کے نام درج ہیں[3]،

تیموری سلاطین میں فنون لطیفہ کا سب سے بڑا سرپرست اور قدر دان شاہجہاں تھا، اس لیے وہ خطاطی کا بھی قدر دان تھا، خود بھی نستعلیق کا ماہر تھا، اور اس نے اپنے سب لڑکوں کو خوشخطی کی تعلیم دلائی تھی، وہ مشہور خوشنویسوں کی خطاطی کے نمونوں کا اتنا شایق تھا کہ جو شخص میر عماد تبریزی

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی ج ۳ ص ۳۱۰ [2] تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۰ [3] ایضاً [4] تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۴

کی تحریر کا ہدیہ اس کی خدمت میں پیش کرتا تھا اس کو اس کے معاوضہ میں یک صدی منصب عطا کرتا تھا۔[1]

اس کی اس قدر دانی سے اس کے عہد میں خوشخطی نے اور زیادہ ترقی کی اور اس کے بڑے بڑے کاتب پیدا ہوئے، مولوی غلام محمد دہلوی لکھتے ہیں :۔

"شاہزادہ خرم یعنی شاہ جہاں بادشاہ در تحصیل علم عربی و فارسی و خط نستعلیق نہایت مہارت داشتند .... در آں عصر از خوشنویساں ملا باقر کشمیری، محمد حسین کشمیری و مقصود علی و میر محمد کاشی و حافظ عبداللہ و شکر اللہ و محمد مقیم در خط نستعلیق و شکستہ کوس کتابت می نواختند و مرزایان دفتر بودند۔"

ان خطاطوں اور بعض دوسرے مشہور خوشنویسوں کا مختصر تعارف یہ ہے :۔

آقا عبد الرشید دیلمی ۔ شاہجہانی عہد کا سب سے بڑا اور باکمال خوشنویس تھا، وہ ایران کے مشہور خطاط میر عماد کا بھانجا اور شاگرد اور اپنے دور کا یگانۂ روزگار خطاط تھا، مولوی غلام محمد ہفت قلم لکھتے ہیں کہ "وہ ملک خطاطی کا پیغمبر تھا، گذشتہ تمام خطاطوں پر گوئے سبقت لے گیا، اس کے بعد اس کا کوئی ہم سر نہیں پیدا ہوا، اور یہ فن اس پر ختم ہوگیا، شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور شاہزادہ دارا شکوہ کی استادی پر مامور ہوا، بیوتات اکبر آباد کا عہدہ بھی اس کے سپرد تھا، یہاں اس نے بہت سی عمارتیں اور سرائیں وغیرہ بنوائیں، اور مرنے کے بعد یہیں دفن ہوا دارا شکوہ کے علاوہ محمد اشرف خواجہ سرا، سعیدائے اشرف، عبد الرحمٰن وغیرہ اس کے ارشد تلامذہ میں تھے،[2] آقا عبد الرشید دیلمی نستعلیق میں ایک خاص دلکش طرز کا موجد تھا، جو اس قدر مقبول ہوا کہ ہندوستان کے اکثر خوشنویسوں نے اس کی تقلید کی اور یہ خط پورے ملک میں پھیل گیا،

---

[1] تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۳ [2] ایضاً ص ۹۰

عبدالباقی حداد المخاطب یاقوت رقم خان - اس کا وطن بھی ایران تھا، شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستان آیا، یہ بھی بڑا باکمال خوشنویس خصوصاً خط نسخ کا بڑا ماہر تھا، اس خط کو اپنی جدت طرازی اور حسن مذاق سے عروس الخطوط بنا دیا تھا، اور اس میں اس کا کوئی ہم سر نہ تھا، اورنگزیب کی شاہزادگی کے زمانہ میں کلام مجید کے نسخے لکھکر اس کی خدمت میں پیش کیے، جس میں ایک نسخہ کل تیس اوراق میں تھا، اورنگ زیب نے اس کے صلہ میں یاقوت رقم خاں کے لقب سے سرفراز کیا، مگر اس نے ہندوستان میں قیام نہیں کیا، اور اپنے چند نامور شاگردوں کو چھوڑ کر ایران لوٹ گیا، اس کے اکثر شاگرد یاقوت رقم کے لقب سے ملقب ہوئے۔ (تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۲۵)

مرزا جعفر المخاطب بہ کفایت خاں - عہد شاہجہانی کا امیر اور نامور خطاط تھا، ابتدا میں محاسبی اور منقح نویسی کی خدمت پر مامور ہوا، پھر شاہجہاں کی نظر توجہ سے "دیوانی تن وخالصہ شریفہ" کے معزز عہدہ تک ترقی کی اور کفایت خاں کے لقب سے ملقب ہوا، خوشنویس بھی تھا خصوصاً شکستہ کا بڑا ماہر تھا، اور اپنے حسن مذاق سے تعلیق اور شکستہ میں نیا طرز اور آب ورنگ پیدا کیا جس میں کوئی دوسرا خوشنویس اس کا ہم سر نہ تھا، اورنگزیب کے عہد ۱۰۹۵ھ میں انتقال کیا، اس کا ذکر مآثر الامرا میں بھی ہے۔

مرزا عبداللہ خاں المخاطب بہ درایت خاں - یہ کفایت خاں کا بھائی اور دربار شاہی سے درایت خاں کے لقب سے ملقب تھا، یہ بھی خط تعلیق اور شکستہ کا ماہر تھا، اور ان دونوں خطوں میں اپنے بھائی سے بھی بازی لے گیا تھا، اور خط شکستہ میں ایسا حسن پیدا کر دیا تھا کہ اس کو خط نستعلیق کا ہم پایہ بنا دیا تھا، مولوی غلام محمد لکھتے ہیں کہ "اس ایجاد میں اس نے سحر سامری سے کام لیا تھا، اگر ملا میر علی اس کے خط شکستہ کو دیکھتے تو نستعلیق سے دست کش ہو جاتے، یہ خط کیا تھا گل وریحان وباغ وبہار تھا، اس کا جیسا جلی وخفی خط شکستہ دیکھنے میں نہیں آیا، اس کا دوسرا بھائی محمد اکبر خاں بھی خوشنویس تھا۔

میر مراد کشمیری، المخاطب بہ شیریں قلم۔ عہد شاہجہانی کا سحر طراز اور جادو رقم خوشنویس تھا، اس کی تازہ نگاری نے دوسرے خوشنویسوں کی خطاطی پر خط نسخ پھیر دیا تھا، مولوی غلام محمد نے اس کی تعریف و توصیف میں بڑی شاعری سے کام لیا ہے۔

میر محمد صالح و میر محمد مومن۔ اکبری دور کے خوشنویس میر عبداللہ مشکین رقم کے لڑکے اور اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے۔ مولوی غلام محمد ہفت قلم ان کو سحر رقم لکھتے ہیں، شاعر بھی تھے، فارسی اور ہندی دونوں میں کہتے تھے، میر محمد صالح کا فارسی میں کشفی اور ہندی میں سبحانی تخلص تھا، میر مومن کا تخلص عرشی تھا، یہ دونوں ہندی کے ایسے باکمال شاعر تھے کہ ان کے سامنے ہندوستانی شعراء کان پکڑتے تھے، (تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۰۱ و ۱۰۲

اورنگزیب فنون لطیفہ کا زیادہ قدر دان نہ تھا لیکن خوشنویسی سے اس کو بھی ذوق تھا، وہ خود اعلیٰ درجہ کا خوش نویس تھا، اس کے لکھے ہوئے کلام مجید آج بھی اس کی خوشنویسی کے شاہد ہیں، اس لیے اس کے زمانہ میں بھی بڑے بڑے خوشنویس پیدا ہوئے، ان میں اکثروں نے شاہ جہاں اور اورنگزیب دونوں کا زمانہ پایا، بلکہ بعض بہادر شاہ اول کے زمانہ تک زندہ رہے، اس لیے ان کا شمار تینوں زمانوں میں ہو سکتا ہے، عمر کا زیادہ حصہ جس کے زمانہ میں گذرا اس کے زمانہ میں اس کا شمار کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اورنگ زیب کے زمانہ میں حسب ذیل مشہور خوشنویس تھے:۔

سید علی خاں جواہر رقم۔ اصل وطن تبریز تھا، اس کو خطاطی سے فطری ذوق تھا، اور بڑے ریاض سے اس فن کو حاصل کیا تھا، میر عماد اور خواجہ عبدالرشید دیلمی دونوں کے طرز کا ماہر تھا، آقا عبدالرشید دیلمی سے اس کو بڑی عقیدت تھی، وہ بھی اسکو بہت مانتے تھے، اورنگ زیب کے ابتدائی دور میں ہندوستان آیا، اس کو اس نے شاہزادوں کی تعلیم پر مامور کیا، پھر ترقی کر کے کتب خانہ شاہی کی داروغگی کے منصب پر فائز ہوا، اس کی عمر کا بڑا حصہ اورنگ زیب کے ساتھ کشمیر اور دکن میں بسر ہوا، اور دکن ہی میں

اس کا انتقال ہوا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہ جہاں کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا، اس نے اسکو اورنگ زیب کی تعلیم پر مامور کیا تھا، پھر اورنگ زیب نے اس کو اپنے زمانہ میں کتب خانہ کی داروغگی پر مامور اور جواہر رقم کے لقب سے سرفراز کیا۔ (تذکرہ خوشنویساں ص ۵۷)

ہدایت اللہ خاں زریں رقم۔ سید علی خاں کا شاگرد رشید اور خوشنویسی میں استاد وقت تھا، اور اس فن میں استاد سے بھی سبقت لے گیا تھا، اورنگ زیب نے اس کو بھی شاہزادوں کی استادی پر مقرر کیا تھا، مرزا کام بخش اور محمد اعظم شاہ جیسے لڑکے اس کے شاگرد اور بہت اچھے خوشنویس تھے، آخر میں یہ بھی کتب خانہ کی داروغگی پر مامور اور زریں رقم کے لقب سے ملقب ہوا، اس نے اورنگ زیب کے لیے دیوان حافظ کے کئی نسخے لکھے تھے۔ (تذکرہٗ خوشنویساں ص ۸۵)

میر محمد باقر۔ اورنگ زیب کا درباری خوشنویس تھا، اس کو محمد باقر کا خط بہت پسند تھا، اپنے اکثر خطوط میں اس کا ذکر کیا ہے، شاہزادہ والاجاہ وغیرہ کی تعلیم بھی اس کے سپرد تھی،

میر محمد زاہد۔ اورنگ زیب کے آخری عہد کا باکمال خوشنویس تھا، مصوری میں بھی دستگاہ رکھتا تھا، اورنگ زیب کے بعد تیموری حکومت پر زوال آگیا، شاہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، صوبے آزاد ہونے لگے اور حکومت کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا، آئے دن حکومت بدلتی تھی، ایک دو بادشاہوں کے علاوہ کسی بادشاہ کو چند برسوں سے زیادہ حکومت کا موقع نہیں ملا، ایسی حالت میں الگ الگ ہر عہد کے کاتبوں کا حال لکھنا دشوار ہے۔ جہاں تک ممکن ہوگا ان کے زمانہ کے تعیین کی کوشش کیجائے گی۔

مرزا حاتم بیگ۔ شاہ عالم بہادر شاہ اول کے زمانہ کا مشہور خوشنویس تھا، خصوصاً خط شکستہ کا بڑا ماہر اور شاعر و انشا پرداز بھی تھا، اور شاہی دربار میں میر منشی کے عہدے پر سرفراز تھا،

محمد عارف۔ عالمگیری عہد کے مشہور ایرانی خوشنویس عبدالباقی حداد کا شاگرد اور اپنے

دور کا نامور خوشنویس تھا۔ خط نسخ و ثلث میں کمال رکھتا تھا۔ نسخ میں ایک خاص طرز ایجاد کیا تھا۔ بہادر شاہ اول کے دربار سے متوسل اور یاقوت رقم کے خطاب سے سرفراز تھا۔ اس کے شاگردوں میں محمد افضل، محمد عسکری، مرزا افضل اللہ اور زین العابدین وغیرہ استاد کے طرز میں حسب مقدور کمال تھے۔

حاجی نامدار۔ فرخ سیر کے زمانہ کا مشہور خوشنویس تھا، آقا عبدالرشید کے طرز میں خط خفی بہت اچھا لکھتا تھا۔ اس کے زمانہ کے اکثر شاہ زادے خوشنویسی میں اس کے شاگرد تھے۔

دور زوال کے بادشاہوں میں سب سے زیادہ طویل عہد حکومت محمد شاہ کا تھا، اور وہ خوشنویسوں کا قدردان بھی تھا، اس لیے اس کے زمانہ میں بڑے بڑے خوشنویس ہوئے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:-

محمد حفیظ خاں۔ محمد شاہی عہد کا بے نظیر استاد تھا، خط نسخ، ثلث، تعلیق اور شکستہ وغیرہ میں کمال رکھتا تھا، دربار شاہی سے "یساولان کی داروغگی" کے منصب پر فائز تھا، کئی کلام مجید لکھکر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے، ان کے فیض تعلیم سے اس کے شاگردوں میں بڑے بڑے خوشنویس پیدا ہوئے۔ نستعلیق میں میر ابوالحسن عرف میر کلن، قادر بخش، محمد اسمٰعیل، محمد تقی، اور خط شکست میں منشی بچھمن سنگھ، بچھمی رام پنڈت، لالہ سکھ رام، منشی محبوب رائے اور منشی کسل سنگھ وغیرہ اپنے دور کے نامور استاد تھے، مولوی غلام محمد دہلوی ہفت قلم بھی انہی کے شاگرد تھے۔ (تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۱ و ۱۱۲)

محمد افضل لاہوری۔ یہ بھی محمد شاہی دور کا نامور خوشنویس تھا۔ اور آقائے ثانی کے لقب سے مشہور تھا۔

محمد افضل حسینی۔ اس دور کا نامور خوشنویس تھا، محمد شاہ کے وزیر اعتماد الدولہ نواب قمر الدین کی سرکار سے متوسل تھا۔

میر محمد موسیٰ۔ سرہند کے عالی نسب سادات میں تھے، میر عماد کے طرز میں بہت عمدہ لکھتے تھے۔ محمد شاہ کی سرکار میں خوشنویسوں کے زمرہ میں منسلک تھے۔

نواب مرید خاں محمد صادق طباطبائی۔ عالی خاندان سادات اور محمد شاہی دور کے امرا، میں تھے۔ خط شکستہ تعلیق اور ثلث میں کمال رکھتے اور ان کو بڑی ترقی دی تھی، خط شکست کئی طرز سے لکھتے تھے۔ خط ریحان و ثلث میں کلام مجید کے کئی نسخے اور خط تعلیق و شکستہ میں گلستان مطلا و مذہب ان کی یادگار تھے،

نواب منظر خاں۔ محمد شاہی امیر روشن الدولہ مظفر خاں کے لڑکے تھے، خط شکست میں نواب مرید خاں کے ہم پایہ مانے جاتے تھے،

قاضی عصمت اللہ خاں۔ شاہ عالم ثانی کے دور کے خوشنویس تھے، اور خط نسخ میں تمام خطاطوں پر گوئے سبقت لے گئے تھے، اور اس میں بڑی خوبصورت ایجادیں کی تھیں، انھوں نے کلام اللہ، حمائل اور قطعات وغیرہ بکثرت لکھے، ۱۱۸۶ھ میں انتقال کیا، ان کے بھائی فیض اللہ خاں بھی نامور خوشنویس تھے، انھوں نے بھی کلام مجید کے نسخے یادگار چھوڑے، فیض اللہ خاں کے لڑکے عباد اللہ خاں بھی خوشنویسی میں باپ کے خلف الصدق تھے، اور ان کے لکھے ہوئے کلام مجید کے ناتمام نسخوں کو مکمل کیا اور ان کے خط سے اپنا خط ایسا ملا دیا تھا کہ بڑے بڑے مبصر دونوں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔

حافظ محمد علی۔ قدیم شاہی خوشنویس تھے، خط نسخ کے ماہر اور نستعلیق آقا عبدالرشید دیلمی کے طرز میں بہت اچھا لکھتے تھے، شاہ عالم کے لڑکے مرزا جواں بخت بہادر کے استاد تھے، ان کے لڑکے بقاء اللہ بھی خوشنویسی میں باپ کے خلف الصدق تھے، اور اپنی آبائی خدمت شاہزادوں کی استادی پر مامور تھے،

میر ابو الحسن عرف کلن۔ عالی خاندان سادات رضوی میں تھے، خط نسخ و نستعلیق میں محمد حفیظ خاں کے شاگرد اور آقا عبدالرشید کے طرز میں بہت عمدہ لکھتے تھے، ایک زمانہ تک نواب عبدالاحد خاں کی رفاقت میں رہے، پھر اکبر شاہ ثانی کی سرکار سے متوسل ہو گئے تھے، ان کے لڑکے میر محمد حسین بھی خوشنویسی میں باپ کے

صحیح جانشین اور لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کے میر منشی تھے،

غلام علی خاں۔ یہ خوشنویس ہی کے نام سے مشہور اور اکبر شاہ ثانی کے خوشنویسوں میں تھے، بڑے لسان، خوش گفتار اور علم مجلسی کے ماہر تھے، اور دوہرہ اور گیت وغیرہ بہت عمدہ پڑھتے تھے،

حافظ ابراہیم۔ یہ بھی اکبر شاہ ثانی کے درباری خوشنویس اور شاہزادوں کے استاد تھے۔

میر زین العابدین۔ عالی نسب سید، شاہ اعزالدین کے شاگرد، طغرانویسی کے ماہر اور اکبر شاہ ثانی کے ملازم تھے،

مولائی صاحب۔ خط نستعلیق کے مشہور استاد تھے، آقا عبدالرشید کے طرز میں ایسا کمال بہم پہنچایا تھا کہ نقل کو اصل کے مطابق بنا دیا تھا، اکبر شاہ ثانی کے لڑکے مرزا معظم بخت بہادر کے استاد اور آقائے ثانی کے خطاب سے سرفراز تھے،

مولوی غلام محمد دہلوی ہفت قلم دہلوی، اکبر شاہ ثانی کے زمانہ کے نامور خطاط اور مشہور خوشنویس تھے، خط نسخ، نستعلیق، ثلث، شکستہ، ریحان، اور شفیعہ ساتوں خطوں میں کمال حاصل کیا تھا، اس لیے ہفت قلم کہلاتے تھے، فارسی کے اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے، شاعر بھی تھے، اردو، فارسی دونوں میں داد سخنوری دیتے تھے، فن خوشنویسی کے سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خوشنویسوں کا ایک مستقل تذکرہ لکھکر ان کی تاریخ محفوظ کر دی، انھوں نے اس کتاب میں زیادہ تر انہی خوشنویسوں کے حالات لکھے ہیں جن کی قلمکاری کے نمونے انھوں نے خود دیکھے ہیں، اور اپنے زمانہ کے اکثر خوشنویسوں سے ملے ہیں اور ان سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، یہ تذکرہ عرصہ ہوا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سے چھپ چکا ہے، اور خوشنویسوں کے حالات کا سب سے بڑا ماخذ ہے، اس مضمون میں بھی زیادہ تر اسی سے استفادہ کیا گیا ہے، آخری عمر میں لکھنؤ چلے آئے تھے، اور یہیں ۱۲۳۹ھ میں انتقال ہوا،

میر مہدی۔ یہ خاندانی خوشنویس تھے، کئی پشتوں سے ان کے خاندان میں خوشنویسی چلی آرہی تھی،

طغرانویسی میں خصوصیت کے ساتھ کمال حاصل تھا، اس میں بڑی باریکیاں پیدا کی تھیں، نواب حکیم حسام الدین حیدر خاں کی سرکار میں محرری و خطاطی کے صیغہ میں ملازم تھے۔

نواب عماد الملک غازی الدین خاں ۔ احمد شاہ بن محمد شاہ اور اس کے بعد عالمگیر ثانی کے وزیر ہوئے، عربی و فارسی کے جید فاضل، شعر و ادب کے ماہر اور صاحبِ دیوان شاعر تھے، نظام تخلص کرتے تھے، اعلیٰ درجہ کے خطاط اور ہفت قلم تھے، خصوصاً نسخ، نستعلیق اور شکستہ بہت عمدہ لکھتے تھے، عالمگیر ثانی کے بعد خانہ نشین ہو گئے تھے،

مرزا ارجمند ۔ نواب عماد الملک کے میر منشی تھے، انشا، شاعری، خوشنویسی اور مصوری وغیرہ میں کمال رکھتے تھے، خط شفیعہ مختلف طریقوں سے لکھتے تھے،

سید محمد امیر رضوی پنجہ کش ۔ دلی کے عالی خاندان سادات میں تھے، اور اپنے دور کے بینظیر خوشنویس تھے، پنجہ کشی، مصوری، نقاشی، لوح، جدول، صحافی، علاقہ بندی اور سنگتراشی مختلف فنون و صنائع میں کمال رکھتے تھے، آقا عبد الرشید کے طرز میں ایسا لکھتے تھے کہ دونوں کے خط میں امتیاز کرنا مشکل تھا، چنانچہ ان کی لکھی ہوئی تحریریں، آقا عبد الرشید کے نام سے گراں قیمت پر فروخت ہوتی تھیں، انھوں نے آقا عبد الرشید کا عرس بھی قائم کیا تھا جس میں دلی کے تمام خوشنویس جمع ہو کر اس فن پر بحث و گفتگو کرتے تھے، ان کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع تھا، مولوی غلام محمد دہلوی کے ہم عصر تھے، انکے حالات سرسید نے بھی آثار الصنادید میں لکھے ہیں،

مرزا عباد اللہ بیگ ۔ میر پنجہ کش کے شاگرد رشید اور نستعلیق کے مسلم الثبوت استاد تھے، میر صاحب اپنے تمام شاگردوں میں اس کو بہت مانتے تھے، شاہی خوشنویسوں کے زمرہ میں شامل اور زمرد رقم کے خطاب سے سرفراز تھے،

آغا مرزا ۔ یہ بھی میر پنجہ کش کے نامور شاگرد تھے، اور استاد کے طرز میں اتنا کمال بہم پہنچایا تھا کہ

ان کے ہم پایہ سمجھے جاتے تھے،

اخوند عبدالرسول قندھاری۔ ان کا وطن قندھار تھا، دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی خط نستعلیق کے استاد سمجھے جاتے تھے،

امام الدین احمد خاں نواب دبیر الدولہ خواجہ زین العابدین مصلح جنگ کے فرزند ارجمند اور خوشنویسی میں میر پنجہ کش اور اخوند عبدالرسول کے شاگرد اور اپنے زمانہ کے نامور خوشنویس تھے،

میر امام الدین۔ خط نسخ کے ماہر اور ابوظفر بہادر شاہ کے استاد تھے، ان کے زمانہ میں ان سے بہتر خط نسخ لکھنے والا نہ تھا۔[۱]

ان کے علاوہ سر سید نے اس دور کے خوشنویسوں میں حافظ کلو خاں، مولوی حیات علی، بدر الدین علی خاں مہرکن وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے،

بہادر شاہ ظفر۔ آخری تیموری بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے، انکی لکھی ہوئی وصلیاں آج بھی موجود اور ان کے کمال فن کی شاہد ہیں،

لکھنؤ کے خوشنویس | دلی کا دربار اجڑنے کے بعد یہاں کے اہل کمال لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے، اور خود لکھنؤ میں بھی اعلیٰ درجے کے خوشنویس پیدا ہوئے، ان کا سلسلہ شجاع الدولہ کے عہد سے شروع ہو گیا تھا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:-

نواب تفضل حسین خاں۔ صاحب علم و استعداد تھے، عربی، فارسی زبان اور منطق و ریاضی وغیرہ کے فنون میں کمال حاصل تھا، خط تعلیق اور شکست بہت اچھا لکھتے تھے، ابتدا میں بارہہ کے سید زادوں کے اتالیق تھے، نواب شجاع الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ چلے آئے اور ان کے لڑکے سعادت علی خاں کے اتالیق مقرر ہوئے، انگریزوں کے مزاج میں اس کو بڑا رسوخ حاصل تھا، چنانچہ

---

[۱] ان سب کے حالات تذکرۂ خوشنویساں اور بعض کے آثار الصنادید سے ماخوذ ہیں۔

ان کی سفارش پر لکھنؤ کی نظامت اور آصف الدولہ کی نیابت کے عہدے پر مامور ہو گئے، پھر سعادت علی خاں کے زمانہ میں ان کے وکیل کی حیثیت سے کلکتہ میں ان کا تقرر ہو گیا،

میر عطا حسین تحسین۔ مشہور قصہ چہار درویش کے مصنف، اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے، خط نسخ نستعلیق اور شفیعہ تینوں کے ماہر تھے، نواب شجاع الدولہ کے دربار سے متوسل تھے، انہی کی فرمائش سے قصہ چہار درویش لکھی تھی،

مرزا احمد طباطبائی۔ نواب مرید خاں کی اولاد میں تھے اور خط نسخ و شکست اپنے موتی طرز پر بہت اچھا لکھتے، فیض آباد میں قیام تھا،

حافظ نور اللہ۔ ان کا اصل وطن دہلی تھا، نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آئے اور دربار آصفی سے متوسل ہو گئے، اپنے دور کے بڑے باکمال خوشنویس تھے، آقا عبد الرشید کے طرز میں ان سے بہتر لکھنے والا نہ تھا، نواب آصف الدولہ کی فرمائش پر ان کے لیے ہفت بند کاشی لکھی، مولوی غلام محمد ہفت قلم کا بیان ہے کہ اس میں ایسی سحر کاری تھی کہ اس کے دیکھنے سے دل سیر نہ ہوتا تھا، انکے شاگردوں میں لالہ سرب سنگھ اور میاں وجیہ اللہ مشہور خوشنویس تھے[1]، ان کے بھائی حافظ خورشید بھی نستعلیق کے بہت اچھے خطاط تھے، مولوی عبد الحلیم شرر مرحوم نے ان کو آقا عبد الرشید دیلمی کا شاگرد لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے، عبد الرشید دیلمی کا انتقال ۱۰۸۱ھ میں ہوا ہے، اور نور اللہ آصفی عہد (۱۱۸۸ھ۔ ۱۲۱۲ھ) میں تھے، دونوں کے زمانوں میں ایک صدی سے زیادہ کا فرق ہے، لکھنؤ میں نور اللہ کی اتنی قدر دانی ہوئی کہ ان کے ہاتھ کے لکھے قطع موتیوں کے داموں فروخت ہوتے تھے، انکی معمولی مشق بازار میں ایک روپے حرف کے حساب سے فروخت ہوتی تھی[2]،

مولوی عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں کہ حافظ نور اللہ کے شاگردوں میں زیادہ ممتاز سب سے اول تو خود ان کے

---

[1] تذکرہ خوشنویساں [2] ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، ص ۱۱۶

بیٹے ابراہیم تھے، دوسرے منشی سرب سنگھ نام کے ایک ہندو بزرگ تھے جن کو کوئی کایستھ بتاتا ہے، اور کوئی کشمیری پنڈت، تیسرے محمد عباس نام لکھنؤ کے ایک خوشنویس تھے، حافظ ابراہیم نے بھی بڑا نام پیدا کیا، سیکڑوں آدمیوں کو خوشنویس بنا دیا اور فن میں مجتہدانہ مرتبہ پیدا کر کے اپنے والد سے جدا ایک شان پیدا کی۔ ... حافظ ابراہیم کے ممتاز شاگردوں میں ان کے لڑکے سید الدین، منشی نظیر حمید، منشی عبد المجید، منشی ہادی علی اور منشی منسا رام کشمیری پنڈت تھے۔ منشی عبد المجید شاہی احکام و فرامین نگاری کے منصب پر مامور تھے، منشی ہادی علی اور منشی منسا رام سارے لکھنؤ کے استاد مانے جاتے تھے، منشی ہادی علی نستعلیق کے علاوہ نسخ اور طغرا نویسی میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔[1]

مرزا محمد علی۔ مرزا خیر اللہ فرمان نویس کے لڑکے، اپنے دور کے خطاطی کے مسلم الثبوت استاد اور خفی و جلی دونوں میں جادو رقم تھے، آقا عبد الرشید دیلمی کے طرز میں یگانہ و یکتا مانے جاتے تھے، ابتدا میں نواب عماد الملک کے یہاں ملازم تھے، پھر فرخ آباد میں قیام کیا، آخر میں آصفی عہد میں لکھنؤ چلے آئے تھے، اور مرزا وزیر علی کی استادی پر مامور ہوئے، اور ان کے لیے پند نامہ اور گلستاں لکھی اور اس میں اپنے فن کا پورا کمال صرف کر دیا، ان کے شاگردوں میں قاضی نعمت اللہ، خلیفہ بخش اللہ اور میر نثار علی مشہور خوشنویس ہوئے۔[2]

قاضی نعمت اللہ۔ مرزا محمد علی کے تمام شاگردوں میں سب سے زیادہ ناموری قاضی نعمت اللہ نے حاصل کی، مولوی عبد الحلیم شرر نے ان کو بھی آقا عبد الرشید دیلمی کا شاگرد لکھا ہے، مگر انکے اور آقا عبد الرشید کے زمانہ میں بھی وہی فرق ہے جو حافظ نور اللہ اور آقا کے زمانہ میں ہے اس لیے یہ بھی شاگرد نہیں ہو سکتے، مولوی عبد الحلیم شرر کو اس لیے دھوکا ہوا کہ حافظ نور اللہ اور قاضی نعمت اللہ آقا عبد الرشید دیلمی کے طرز کے مقلد تھے، یہ بھی آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آئے تھے، انھوں نے

---

[1] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۱۱۸ و ۱۱۹ [2] تذکرۂ خوشنویساں ص ۶۷

ان کو شاہزادوں کے خط کی اصلاح کی خدمت پر مامور کیا۔ اور حافظ نوراللہ کی طرح انھوں نے بھی لکھنؤ میں بڑا نام پیدا کیا، مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں اگرچہ اور بھی پرانے خوشنویس تھے لیکن آقا عبدالرشید کے شاگردوں (اس سے مراد حافظ نوراللہ اور قاضی نعمت اللہ ہیں) نے اپنا ایسا سکہ جمالیا کہ خوشنویسی کے تمام شایق بلکہ سارا شہر اس کی طرف رجوع ہوگیا، جسے خطاطی کا شوق ہوا، انہی کا شاگرد ہوگیا، اور تمام خوشنویسانِ سلف کے نام مٹ کے گمنامی کے ناپیدا کنار سمندر میں غرق ہوگئے اور سچ یہ ہے کہ یہ بزرگ اپنے کمال کے اعتبار سے اس کے مستحق بھی تھے[1] قاضی نعمت اللہ کے ایک شاگرد ان کے فرزند مولوی محمد اشرف تھے، دوسرے مولوی قتل احمد،

آخر زمانہ میں سندیلہ کے ایک منشی عبدالحئی بڑے باکمال خوشنویس تھے، جن کے شاگرد منشی امیراللہ ان کے بڑے بھائی منشی محمد عبداللطیف اور منشی اشرف علی وغیرہ تھے، فی الحال نستعلیق میں منشی شمس الدین صاحب اور نسخ میں منشی حامد علی صاحب کو شہرت ہے، اور یہ دونوں منشی ہادی علی صاحب کے شاگرد ہیں، منشی ہادی علی کے ہم عصر نسخ کے ایک مشہور خوشنویس میر بندہ علی مرتعش تھے، ان کے استاد نواب احمد علی نام ایک پرانے وقت کے رئیس اور نسخ کے باکمال استاد تھے، میر بندہ علی کے ہاتھ میں رعشہ تھا، مگر قلم جیسے ہی کاغذ پر لگتا معلوم ہوتا کہ لوہے کا ہاتھ ہے، کیا مجال کہ قابو سے باہر ہو، ان کی نظر خط پہچاننے میں ایسا کمال رکھتی تھی کہ بڑے بڑے لوگ لوہا مان گئے[2]۔

ہندو خوشنویس

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس زمانہ میں خوشخطی لازمۂ تعلیم و شرافت سمجھی جاتی تھی، اور ہندو بھی تعلیم میں کسی سے پیچھے نہ تھے، سرکاری دفاتر خصوصاً مال اور دیوانی کے شعبہ میں ان کی کثرت تھی اور دفتری کاروبار کے لیے انشاء اور خوشخطی ضروری تھی، اسلیے ہندوؤں میں بہت سے خوشنویس خصوصاً خط نستعلیق اور شکست کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے، مولوی غلام محمد نے بہت سے ہندو خوشنویسوں کا حال لکھا ہے ان میں سے بعض کے نام اوپر گذر چکے ہیں، چند نامور خوشنویسوں کے نام حسب ذیل ہیں:

---

[1] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۱۱۶ [2] ایضاً ص ۱۲۰ و ۱۲۱

راجہ ٹوڈرمل کھتری۔ اکبری دور کے مشہور امیر اور دربار اکبری کے نورتن راجہ ٹوڈرمل خوشنویس بھی تھے۔ مولوی غلام محمد دہلوی لکھتے ہیں: "نویسندۂ چابک دست وخطوط بخوشخطی ونکی می نوشت"۔[1] ان کے حالات مغلوں کی تمام تاریخوں میں ہیں، اور ان کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے۔

رائے منوہر بن لونی کرن توسنی کچھواہا۔ راجہ سانبھر کے لڑکے تھے، اکبر کے دامن تربیت میں پرورش پائی، اور جہانگیر کے دور میں ان کی نشوونما ہوئی[2]، مرزا راجہ خطاب تھا، اکبر ان کو بہت مانتا تھا، فارسی زبان کے ماہر تھے، شاعر بھی تھے، بدایونی نے ان کے اشعار نقل کیے ہیں[3]، خوشنویس بھی تھے، مولوی غلام محمد دہلوی لکھتے ہیں" سلیقہ شاعری وخوشخطی بہم رسانیدہ[4]"

چندربھان برہمن۔ عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر، ادیب اور اہل قلم تھا، مختلف امرا کی سرکاروں میں ملازم رہا، پھر شاہی دربار سے متوسل ہوگیا، دارا شکوہ کو اس کی انشا، بہت پسند تھی، اس لیے اسکی زندگی بھر اس کا میر منشی رہا، اسکی متعدد تصانیف ہیں، ان میں چہار چمن، منشآت برہمن اور دیوان زیادہ مشہور ہیں[5]، اعلیٰ درجہ کا خوشنویس بھی تھا، نستعلیق میں آقا عبدالرشید دیلمی اور شکست میں کفایت خاں کا شاگرد تھا، اور دونوں میں استادی کا درجہ حاصل تھا[6]،

منشی سبح بھان۔ یہ بھی مذکورۂ بالا دونوں اساتذہ کا شاگرد اور نستعلیق وشکست کا ماہر تھا[7]،

رائے پریم ناتھ کھتری۔ ان کے اسلاف شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں "بینگا رتن" کے عہدہ پر سرفراز تھے، رائے پریم ناتھ نواب مرید خاں کے شاگرد اور اپنے زمانہ کے مشہور خوشنویس تھے، خصوصاً خط شکست بہت عمدہ لکھتے تھے[8]،

راجہ امید سنگھ اور راجہ شیر سنگھ۔ راجہ بہادر کے لڑکے اور مشہور راجہ ناگرمل کے پوتے تھے، دونوں

۱؎ تذکرۂ خوشنویساں ص ۸۰ ۲؎ طبقات اکبری ص ۳۸۰ ۳؎ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۰۱ ۴؎ تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۶

۵؎ انکے حالات تاریخ عمل صالح، تذکرہ نشتر عشق، کلمات الشعراء وغیرہ فارسی شعراء کے تمام تذکروں میں ہیں ۶؎ تذکرۂ خوشنویساں ص ۵۵

۷؎ ایضاً ۸؎ ایضاً ص ۱۱۳

بھائی رائے پریم ناتھ کے شاگرد اور خوشخطی میں استاد کے ہم پایہ سمجھے جاتے تھے، اور خاندانی شرافت اخلاق سے آراستہ اور علم و ہنر کے بڑے قدردان تھے۔[۱]

کنور پریم کشور فراقی۔ راجہ جگل کشور کے پوتے مشہور خوشنویس تھے، رائے پریم ناتھ کے طرز میں بہت اچھا لکھتے تھے۔ کلیات کلیم اور شاہجہاں نامہ خط شکست میں بہت عمدہ لکھا تھا، اردو کے خوشگوار شاعر تھے، فراقی تخلص[۲] تھا۔ گلشن بیخار اور مولوی کریم الدین کے تذکرہ میں بھی ان کے حالات ہیں۔[۳]

منشی لچھمن سنگھ غیوری۔ قوم کے اگروال، علم و ہنر کے زیور سے آراستہ تھے، عربی فارسی زبانوں میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ فارسی کے اعلیٰ درجہ کے انشاپرداز تھے، اپنی انشا پر ان کو اتنا ناز تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ طاہر وحید، طاہر دکھنی اور میر جلالا کے طرز میں لکھتے تھے۔ شاعری میں میر شمس الدین فقیر سے تلمذ تھا، ان کی تصانیف میں شعلۂ آہ اور بعض دوسری کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ خوشنویس بھی تھے، خط شکست میں محمد حفیظ خاں اور شفیعہ میں مرزا آقا کے شاگرد تھے۔ مولوی غلام محمد دہلوی کے ہمعصر تھے، دونوں میں ملاقات ہوئی تھی۔[۴] احمد علی سندیلوی نے ان کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے، ایک مرتبہ وہ کچھ کتابیں بیچنے کے لیے لکھنؤ آئے، کسی قدردان کی سفارش سے انگریزوں نے تین سو روپے ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر اس کے لینے سے انکار کر دیا کہ میں کئی پشتوں سے اہل اسلام کا نمک خوار ہوں، اس لیے دشمنانِ دین کی ملازمت اختیار نہیں کر سکتا، خواہ فاقہ سے جان ہی چلی جائے۔[۵]

---

۱ تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۵ ۲ ایضاً ص ۱۱۶ ۳ گلشن بےخار ص ۲۱۹۔ اڈیشن ۱۸۴۳ء

۴ تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۸ ۵ مخزن الغرائب نسخۂ قلمی دار المصنفین ص ۲۹۳

راجہ نند رام پنڈت۔ یہ بھی صاحب علم و استعداد اور خط شکست کے ماہر تھے، دلی کی شاہ گردی کے زمانہ میں لکھنؤ چلے آئے تھے، اور نواب حسن رضا خاں کی سرکار میں منشی گیری کی خدمت پر مامور ہو گئے تھے۔[1]

لالہ لچھمی رام پنڈت۔ عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے، فارسی کے بہترین انشاپرداز تھے، مصوری میں بھی درک تھا، خط نستعلیق و شکست وغیرہ میں محمد حفیظ خاں کے شاگرد تھے، اور نستعلیق استاد کے طرز میں بہت اچھا لکھتے تھے، شاہ عالم کے وزیر نواب ذوالفقار الدولہ نجف علی خاں اور دوسرے امراء کی سرکاروں میں بڑی عزت و توقیر کے ساتھ زندگی بسر کی۔[2]

خوشوقت رائے۔ دانگی قوم کے کھتری، موروثی صاحب دولت و وجاہت اور علم و ہنر اور تہذیب و شایستگی کے زیور سے آراستہ تھے، خوشنویسی میں کمال حاصل تھا، خط شکست میں میر علی سے اور نستعلیق میں شاہ اعزالدین سے اصلاح لی تھی، یہ دونوں عرصہ سے ان کے یہاں مقیم رہے، کھتریوں میں ان کے جیسے صاحب علم، فیاض و سیر چشم اور علم و ہنر کے قدر داں کم پیدا ہوئے، ہزاروں روپئے صرف کر کے آقا عبدالرشید دیلمی اور کفایت خاں کی دستخطی تحریریں جمع کی تھیں۔[3]

لالہ درگا پرشاد کالیستھ۔ لکھنؤ وطن تھا، مولوی غلام محمد ہفت قلم کے شاگرد تھے، خط نسخ اور شکست اتنا عمدہ لکھتے تھے کہ موتی پروتے تھے۔[4] شاعر بھی تھے، مضطرب تخلص تھا، گلشن بیخار میں بھی ان کا ذکر ہے۔[5]

شنکرناتھ۔ کشمیری پنڈت دہلوی مشہور خوشنویس تھے، خط نستعلیق و شفیعہ میں مولوی غلام محمد دہلوی کے اور خط شکست میں مولوی حیات علی کے شاگرد تھے، شاعر بھی تھے، موہب

---

[1] تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۸ [2] ایضاً ص ۱۱۹ [3] ایضاً ص ۱۲۱ [4] ایضاً [5] گلشن بیخار اڈیشن ۱۸۴۳ء

تخلص تھا[1]، سرسید نے آثار الصنادید میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔[2]

لالہ سروپ سنگھ دیوانہ ۔ خوشخطی میں حافظ نوراللہ کے شاگرد رشید تھے، شاعر بھی تھے، اور اردو، فارسی، ہندی تینوں زبانوں میں کہتے تھے، کئی دیوان یادگار چھوڑے[3]، خوشخطی میں استاد کا چربہ ایسا اڑایا تھا کہ سیکڑوں وصلیاں لکھکر ان کے نام سے پھیلا دیں جن میں بڑے بڑے ماہر تمیز نہیں کر سکتے تھے[4] ان کا تذکرہ روز روشن، انیس العاشقین، گلشن ہند وغیرہ تمام تذکروں میں ہے۔

محمد حفیظ خاں کے شاگردوں میں لچھمی سنگھ اور لچھمی رائے پنڈت کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، لالہ سکھ رام، منشی محبوب رائے اور منشی کسل سنگھ خط شکست میں بے نظیر مانے جاتے تھے۔[5]

یہ اُن خوشنویسوں کے نام ہیں جن کا ذکر مولوی غلام محمد دہلوی نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے، انکے علاوہ اور بھی ہندو خوشنویس تھے، جن کا ذکر کہیں نہیں ملتا، لکھنؤ میں اس کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز تھی، مولوی عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں کہ "یہ اس خاندان (حافظ نوراللہ و قاضی نعمت اللہ) کی برکت ہے کہ لکھنؤ میں ہزاروں مسلمان اور ہزاروں کایستھ جن سے نوبستہ اور اشرف آباد کے محلے بھرے ہوئے ہیں اور سیکڑوں کشمیری پنڈت خوشنویس ہو گئے، مگر افسوس کشمیری پنڈتوں نے انگریزی تعلیم کے شوق میں اور خوشنویسی کی کساد بازاری کو دیکھ کر اس فن کو مطلق چھوڑ دیا، اب جتنے اچھے لکھنے والے ہیں سب مسلمان ہیں یا کایستھ۔"[6]

کتبہ نگار اور طغرا نویس | مسلمان سلاطین جو اہم عمارتیں بھی بنواتے تھے، ان میں ان کی تعمیر کی تاریخ کے علاوہ عمارت کی مناسبت سے آیات و احادیث اور فارسی اشعار وغیرہ بھی تحریر ہوتے تھے، یہ عبارتیں اتنے خوصورت خط میں اور اس حسن و تناسب سے لکھی جاتی تھیں، خصوصاً ان کے طغرے، حسنِ صناعی کا ایسا اعلیٰ

---

[1] تذکرہ خوشنویساں ص ۱۲۲ [2] آثار الصنادید، ص ۲۲۵ [3] تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۵ [4] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۱۱۸
[5] تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۲ [6] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۱۱۹

نمونہ ہوتے تھے کہ نقش ونگار کا بھی کام دیتے تھے، ان کے لکھنے والے مخصوص خوشنویس اور طغرانگار ہوتے تھے، جنکی تنخواہیں بیش قرار ہوتی تھیں مغلوں کی کوئی اہم اور تاریخی عمارت اس قسم کی تحریروں سے خالی نہیں ہے خصوصاً تاج محل، سکندرہ اور فتحپور سیکری کی عمارتوں اور جامع مسجد دہلی کے کتبات اور طغرے حسن صناعی کا اعلیٰ نمونہ ہیں، جن کو دیکھکر آج بھی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

سکندرہ اور تاج محل کے بیشتر کتبات اور طغرے امانت خاں شیرازی کے لکھے ہوئے ہیں، یہ جہانگیری دور کا طغریٰ نویس تھا، اس کا اصل نام عبدالحق ہے، امانت خاں خطاب تھا، اسکی تنخواہ ایک ہزار ماہوار تھی، اسکے لکھے ہوئے کتبات میں اسکا نام تحریر ہے، تاج محل کی تحریروں کے خطاطوں میں ستار خاں، محمد خاں اور عبدالغفار کے نام بعض کتابوں میں ملتے ہیں، ان کی تنخواہ پانچ پانچ سو ماہوار تھی، تاج محل کی تحریروں میں جو حسن و دلکشی ہے، اس کا اندازہ ایک ظاہر بیں بھی کر سکتا ہے،

فتحپور سیکری کے بلند دروازوں کے مختلف حصوں میں کئی کتبے ہیں، ان میں سے بعض کتبے حضرت سلیم چشتی کے خلیفہ علی خواجہ احمد چشتی کی عقیدت کا نتیجہ ہیں، جو اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے، اور بعض کتبے میر معصوم بھکری قندھاری اور ارشد کے لکھے ہوئے ہیں، اول الذکر دونوں کے حالات تذکرۂ خوشنویساں میں بھی ہیں، بھکری کے حالات اوپر لکھے جا چکے ہیں۔

جامع مسجد دہلی کے بیرونی درجہ کی محرابوں کے اوپر جامع مسجد کی تعمیر کی جو مفصل تاریخ تحریر ہے، وہ دور کے مشہور مہندس استاد احمد معمار کے لڑکے نوراللہ احمد کی لکھی ہوئی ہے۔[1]

اس قسم کے کتبات اور تحریروں سے مغلوں کی کوئی عمارت بلکہ امرا کی بنائی ہوئی عمارتیں بھی خالی نہیں مگر اس کی تفصیل مقصود نہیں، صرف چند مشہور عمارتوں کے کتبات کا اجمالی ذکر کر دیا گیا۔

---

[1] ان تمام کتبات اور تحریروں پر ان کے کاتبوں کے نام درج ہیں، اس کے علاوہ تاریخ فتحپور سیکری مولوی محمد سعید مارہروی واقعات دار الحکومت دہلی مولفہ مولوی بشیر احمد خاں دہلوی اور تاریخ تاج محل معین الدین احمد اکبرآبادی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے قابل قدر مضمون "تاج محل اور اس کے معمار" میں بھی اس کی تصریح ہے۔

سلسلہ تاریخ ہند کی چند کتابیں

تاریخ سندھ

خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن حکومتوں کے ماتحت رہا ان کی مکمل تاریخ کے ساتھ ان تمام دوروں کے نظام حکومت علمی و تمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو کام ہوئے ان سب کی تفصیل، ۸۰۰ صفحے قیمت: ۔؎

ہندوستان عربوں کی نظر میں

ہندوستان کی قدیم تاریخ سے متعلق قدیم عرب مصنفین کی کتابوں، سفرناموں، اور تاریخوں میں جو مواد پھیلا ہوا ہے، ان سب کو نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ دو جلدوں میں سمیٹ لیا گیا ہے، اس کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی ہے،

جلد اول قیمت ۔؎ جلد دوم قیمت: ۔؎

گجرات کی تمدنی تاریخ

(مسلمان حکمرانوں کے دور میں)

اس میں نہایت کاوش اور تلاش و جستجو سے قدیم فارسی ماخذ اور دوسری کتابوں سے گجرات کی تمدنی تاریخ اور شاہان گجرات کے آثار و مشاہد سے متعلق ہر قسم کے معلومات فراہم کئے گئے ہیں،

۳۲۹ صفحے قیمت: ۔؎

(دار المصنفین کی نئی کتاب)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عہد کے دربار، محلات، حرم، لباس، پارچہ بافی، زیورات، جواہرات، خوشبوئیات، خورد و نوش، ساز و سامان، تہوار، تقریبات، موسیقی، اور مصوری وغیرہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت ۶۵۰ صفحے قیمت ۔؎

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم۔ اے

